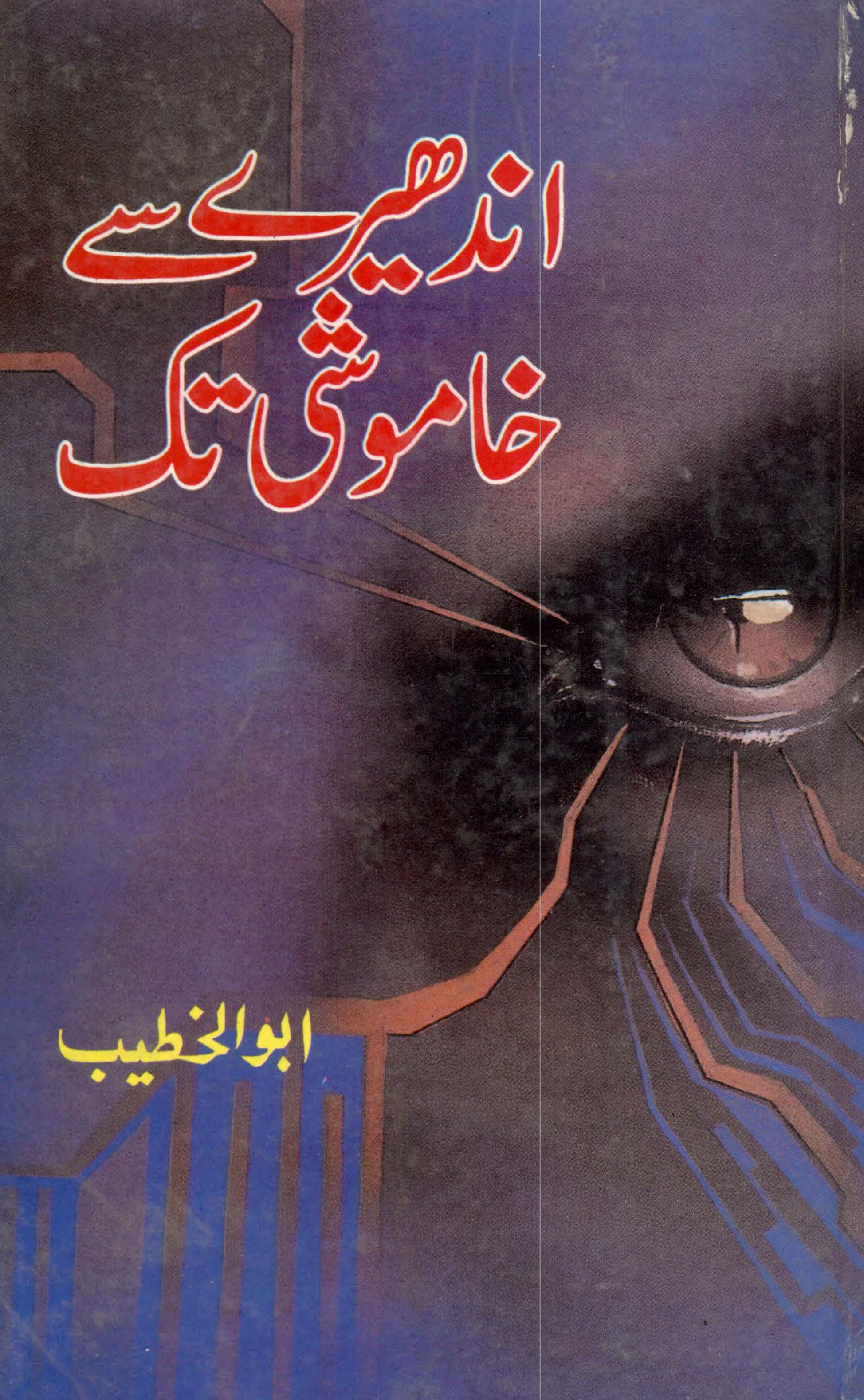
اندھیرے سے
خاموشی تک
ابوالخطیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اندھیرے سے خاموشی تک

اندھیرے سے خاموشی تک

ابوالخطیب

زیڈ۔ کیو پبلشرز
نارتھ ناظم آباد، کراچی۔ پاکستان

جملہ حقوق بنام مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ———— اندھیرے سے خاموشی تک
مصنف ———— وہاج الدین ابوالخطیب
انتظام ———— فیضان احمد
ناشر ———— زیڈ کیو پبلشر' نارتھ ناظم آباد۔ کراچی
پروسیسنگ ———— حیاء الدین حیات (CALLIGRAPHTECH)
2nd فلور' 275 پے نو راما سینٹر' صدر۔ کراچی
پرنٹر ———— ذکی سنز پرنٹرز' کراچی
اشاعت اول ———— اگست ۱۹۹۷ء
قیمت ———— ۲۰۰ روپے (پاکستان اور ہندوستان)
۱۰ پونڈ (برطانیہ و دیگر یورپی ممالک)
۱۵ ڈالر (شمالی امریکہ و کینیڈا)

کتاب مندرجہ ذیل اداروں سے بھی منگوائی جاسکتی ہے

- پاکستانی ادب پبلی کیشنز
  ۲۱۳' دوسری منزل' پے نوراما سینٹر'
  فاطمہ جناح روڈ' صدر' کراچی۔ پاکستان
  فون۔ ۵۶۷۳۶۰۳

- سیلز اینڈ سروسز
  کبیر بلڈنگ' جناح روڈ۔ کوئٹہ
  فون۔ ۸۳۴۲۲۹

- 22-C, Lisburne Road,
  Hampstead, N. W. 3
  LONDON - 2 .N. R
  ENGLAND

انتساب

اپنی شریک حیات کے نام، جس کی محبتوں
اور قربانیوں کا میں ہمیشہ مقروض رہا

ترتیب

○ تعارف ۹
○ حرف اول ۱۵
○ دور سے ایک آواز ۲۳
○ وہ اسی راہ سے گزرا تھا ۳۳
○ یونہی تو نہیں جینا ۴۹
○ ذرا ٹھہر جاؤ ۶۱
○ تھوڑی سی دیر اور ۸۳
○ چشم پرنم بھی نہ تھی ۱۰۹
○ سنبھلنے سے پہلے سنبھلنے کے بعد ۱۲۹
○ کچھ دل کے سہارے ۱۴۵
○ خواب پھولوں اور کھلونوں کی طرح ۱۵۹
○ ابھی ابھی جو آواز آئی ۱۷۹
○ پورا چاند آدھا آدمی ۱۹۹
○ ذرا دل کو جگالوں تو چلوں ۲۱۵
○ عشرتوں کے دکھ ۲۴۵
○ پتھر زندہ ہے ۲۵۷
○ ذرا آواز تو دو ۲۷۳
○ اندھیرے سے خاموشی تک ۲۹۳

تعارف

مرزا غالب کی جنم بھومی.... آگرہ.... ہندوستان کا تاریخی شہر.... جہاں محبت کی عظیم اور شہرہ آفاق یادگار تاج محل' حسن و خوبصورتی اور صناعی کا بے مثل شاہکار' صدیوں سے پوری دنیا کے سیاحوں کے لئے کشش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ جناب وہاج الدین ابوالخطیب نے ہندوستان کے اسی مردم خیز خطے "آگرہ" میں آنکھ کھولی۔ ان کا بچپن اس کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے گزرا۔

ابوالخطیب کا تعلق وطن عزیز کی اس نسل سے ہے جس نے نہ صرف آزادی کی تحریک میں حصہ لیا بلکہ صبح آزادی کو نمودار ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس آزادی کے لئے لاکھوں انسانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے' ہزاروں خاندان اجڑ گئے۔ تقسیم ہند کے دوران رونما ہونے والے خونچکاں المیوں کا مشاہدہ ابوالخطیب نے اپنی سلگتی آنکھوں سے کیا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا پہلا ناول "سحر کا انتظار تھا' سحر کا انتظار ہے" ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے لٹے پٹے مسلمانوں کے مسائل اور حالات زندگی کے تناظر میں لکھا۔

ابوالخطیب اب تک چھ ناول' متعدد ناولٹ اور بے شمار افسانے تخلیق کر چکے ہیں جن میں سے بیشتر کا ترجمہ انگریزی' فرانسیسی' جرمن اور عربی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اب

تک ان کی چھ کتابیں شائع ہو کر قارئین کی پسندیدگی اور پذیرائی کی سند حاصل کر چکی ہیں' جن میں ناول اور افسانوں کے مجموعے شامل ہیں۔

ابوالخطیب ۱۹۵۳ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ کچھ عرصہ انہوں نے لاہور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قربت میں گزارا۔ اس کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے اور اس کی خوشگوار شاموں کے ایسے اسیر ہوئے کہ پھر یہیں کے ہو رہے۔ پچاس کی دہائی میں کراچی کی خوشگوار شام اپنی خوبصورتی کے لئے چہار سو مشہور تھی۔ موجودہ دور کی خوف و دہشت کی فضاء اور بارود کی بو اس میں شامل نہ ہوئی تھی۔ کراچی میں قیام کے دوران انہوں نے حلقہ ادب اسلامی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پچاس کی دہائی میں وطن عزیز پر سیاسی انتشار اور انارکی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس خطے میں طالع آزماؤں نے اپنا گھناؤنا کھیل شروع کردیا تھا۔ اس فضاء میں مفاد پرست حکمراں طبقہ اسلامی نظریہ حیات کے نفاذ کے حامیوں اور داعیوں کو کیسے برداشت کر سکتا تھا چنانچہ وہ حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ظلم' جبر اور تشدد کے دروازے ان پر کھل گئے۔ پھر اس نو آزاد مملکت اسلامیہ میں پہلے مارشل لاء کی گونج سنی گئی۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی گئی' تحریر و تقریر کی آزادی چھین لی گئی' جبر کے ان حالات نے ابولخطیب کو سوچنے پر مجبور کردیا کہ کیا اسی "آزادی" کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا' کیا اس مملکت اسلامیہ میں اسلامی نظریہ حیات کا نفاذ' جس کا خواب برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے دیکھا تھا' کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا؟ اور ابوالخطیب ایک بار پھر بے وطن ہونے پر مجبور ہوگئے۔ ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں وہ انگلستان چلے گئے۔ اس وقت سے وہ لندن میں ہی مقیم ہیں۔ لیکن پاکستان سے ان کا فکری' جذباتی اور تہذیبی رشتہ نہیں ٹوٹا۔ لندن میں رہتے ہوئے بھی ان کی تحریروں میں پاکستان سے محبت اور اسلامی و مشرقی تہذیب سے ان کی عقیدت نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کے زیر نظر مجموعے "اندھیرے سے خاموشی تک" میں شامل افسانے اور ناولٹ یورپ خصوصاً" انگلستان میں مقیم پاکستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حالات زندگی کے تناظر میں تحریر کئے گئے ہیں کہ اجنبی تہذیب و تمدن میں رہتے ہوئے ان تارک الوطن

مسلمانوں کی اپنے ملک اور مشرقی تہذیب و اقدار سے دوری نے انہیں کس کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مصنف ایک مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے افسانوں اور ناولٹوں میں یہ نظریاتی چھاپ خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے لیکن مصنف اپنے اس نظریاتی تعلق پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ بہانگ دہل اس کا فخریہ اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے یورپ کی زندگی کو ایک مسلمان کی نظر سے دیکھا ہے اور اسی معیار پر ان کے ماحول اور تہذیب کو پرکھا ہے اور انہیں اپنی اسلامی اقدار اور مشرقی تہذیب و تمدن پر فخر ہے۔

ابوالخطیب کی تحریروں میں رومانیت اور آئیڈیلزم واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ رومانیت اور آئیڈیلزم نوجوان نسل کو ان اقدار کی بقاء کی خاطر متحرک کرنے کے لئے ضروری ہیں جن کا پرچار وہ اپنی تحریروں میں کرتے ہیں۔ ابوالخطیب کے فکری نقطہ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن تحریک اسلامی سے ان کی بے لوث وابستگی، اسلامی نشاۃ الثانیہ کے احیاء پر ان کے پختہ یقین اور اسلامی و مشرقی تہذیب و تمدن اور اقدار کے ساتھ ان کے گہرے لگاؤ اور کمٹ منٹ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آج ملت اسلامیہ خصوصا" پاکستان کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کے لئے ابوالخطیب جیسے ادیبوں اور دانشوروں کی اشد ضرورت ہے بلاشبہ کسی بھی قوم کے شعور کو اجاگر کرنے کے لئے اس کا ادیب اور دانشور طبقہ ہی بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

ضیاء الدین

present the problem as seen by someone from outside or from above. He tries to look at the difficulties and beliefs of people as one of them. His deep concern with the travails of the people emerged as much as reaction to the attacks on Islam by the progressive writers as from a genuine faith in the people's strenght.

Abul Khatib was born in Agra. Famous for its monument of love, the Taj Mahal. He migrated to Pakistan to develop his literary skills in a Muslim country. He was soon disillusioned, not with the beliefs of the people but with the dominant traditions introduced by the secular rulers of Pakistan to dilute the religious charater of the society. The contradictions between the rulers ideologies and popular belief did not shake his confidence in the people's strenght to resist alien ideas. In 1964 he came to England, a disillusioned Pakistani but a confident Muslim. Since then he has been living in London, studying the literary traditions of European, particularly Russian, writers. He acknowledged the influence of French and Russian artistic and thematic literary traditions in his work. But he criticises them for their weak treatment of people's beliefs and values. He rejects their materialism and eroticism.

Abul Khatib is criticised as being an idealist and romanticist in his portrayal of reality. He argues that idealism and romanticism are essential to motivate the youth for the values which he has been trying to promote through his work. Most of his characters are educated and speak the language of the urban middle class. This is because his intended audience comes from this background. There is a need for Islamic novelists and story writers to write in a popular language and on popular issues in order to reach the Muslim masses.

Khatib says that Islamic literature has now become an established literary tradition in Urdu but he suggests that to popularise their work the Islamic writers have to improve its technical, thematic and linguistic aspects. He adds that much of the valuable work of the Islamic writers has remained unpopular because of the lack of proper distribution. For example, the works of M. Nasim, Hafeez Meeruthi, Amir Usmani. Dr. Ahmed Sajjad, Ibne Farid and Dr. Mughni in India, and Naeem Siddiqi, Asad Gilani, Mahirul Qadri, Yasmeen Najma, Fazl-min-Allah, Gilani Bano and Nadim Mirza in Pakistan, despite their richness in ideas, techniques and presentation, have remained virtually unknown. Khatib believes that trough proper organisation and distribution, and by adopting modern printing and designing techniques, their work can be made more attractive and appealing to readers.

He believes that the future of the Urdu short story and novel is safe as long as the Islamic writers take a sympathetic attitude towards people, make efforts to identify with the sentiments beliefs, needs and problems of the people and describe their weakness with sincerity.

Courtesy: The ARABIA London July 1984.

CHALLENGE TO MODERNISM

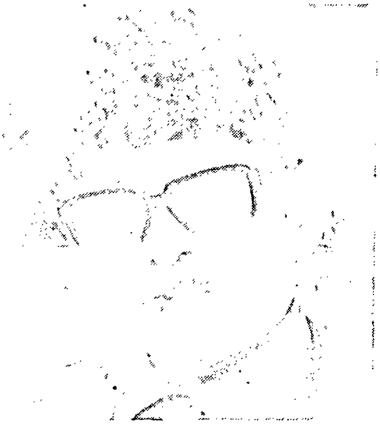

Abul Khatib is an Urdu novelist and short story writer. He has published five novels and more than a dozen short stories, several of which have been translated into English, German, French and Arabic. When his famous novel "Waited For the Dawn, Waiting For the Dawn" appeared in 1961. It drew wide acclaim from Islamic circles in the Indo-Pak subcontinent.

The novel, which tells of the life and problems of Muslim families who migrated to Pakistan in 1947, was considered to be the first to present the agony of partition from the perspective of ordinary people.

His second novel, "The City of Stars" also received wide recognition. It was described as the first novel in Urdu written from the perspective of the Islamic movement. The work is a tribute to those Islamic activists who strive in a hostile and problem-ridden environment to make Islamic values dominant in every walk of life. The novel discusses the prevailing ethos of modernising industrial societies: the hero, Dr. Jamal, a research scientist, mobilises the labourers to fight for the introduction of Islamic changes in industry. The novel ends on an optimistic note for the success of Islamic workers despite the conspiracies hatched by the industrialists.

Abul Khatib belongs to that generation of Urdu writers who challenged the socialist trend in Urdu literature in its heyday, In the early 20th century there emerged an Urdu-based literacy movement which was nurtured and nourished by Marxist and social democratic traditions. The movement attacked Islamic beliefs and held them responsible for the poverty and backwardness of the people. Instead of adopting the literary traditions created by modernism, impressionism, existentialism or rationlism to confront the challenge of the progressive movement, Abul Khatib followed the Islamic traditions. He selected characters, portrayed situations and presented issues which highlighted the universality and finality of Islamic teachings.

Abul Khatib's work displays a deep understanding of Islam, Muslim problems, Muslim culture and history. He is sympathetic to people's beliefs and need. He does not ridicule their identifies with them and tries to highlight their strength and to expose their weaknesses. He does not

حرفِ اول

میں نے سرزمین یورپ پر زندگی کا عرصہ بہار گزارا ہے اور اب خزاں درِ حیات پر دستک دے رہی ہے لیکن یہ عرصہ بہار میں نے محض دولت' عشرت اور چمک کے لئے نہیں گزارا بلکہ نیک نامی اور پہچان کے لئے۔ صرف اپنی نہیں بلکہ اپنی تہذیب' اپنے دین و ایمان کی آبیاری کے لئے۔ اس لئے کہ میرا عقیدہ اور تہذیب میری ذات کا حصہ بن چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے جسم اور روح کا ناطہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ نظریات زندگی اپنے وجود سے کم اہم نہیں ہوتے۔

تنہائی' کرب اور خاموشی بچپن سے ہی میرے رفیق رہے۔ یہ سائے کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اس عالم تنہائی میں صرف دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ کرنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ کبھی اپنے اندر کبھی باہر' صرف دیکھتے ہی رہنا۔ جیسے کسی گم کردہ شے کی تلاش کی خواہش ہو۔ ان کرب آمیز تنہائی کے لمحات میں سننے اور سنانے والے شاذونادر ہی ملتے تھے کیونکہ لندن میں رہنے والوں کی خواہشیں' ضرورتیں اور چاہتیں و ماحول بڑا مختلف تھا۔ پھر تنہائی اور خاموشی سے تنگ آکر میں خود سے باتیں کرنے لگا اور تھوڑے دنوں کے بعد اس خودکلامی سے جی بہلنے لگا۔ پھر میرا تخیل انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور میرے اندر خیالات احساسات اور مشاہدات کی دھنک رنگ کہکشاں

پھوٹنے لگی۔ تنہائی اور خاموشی نے کتابوں کی دنیا سے میرا رشتہ مزید مضبوط کردیا۔ پھر میں نے قلم اٹھایا اور اپنے خیالات و احساسات کو شاعرانہ تک بندی میں ڈھالنے لگا مگر پیشہ ور سکہ بند شاعروں نے اس تک بندی کو شرف قبولیت نہ بخشا۔ اس کے بعد مصوری کے میدان میں زور آزمائی کی کوشش کی۔ پھولوں کی تصویریں بنائیں کہ بہار ان ہی کے دم سے ہے پورٹریٹ بنانے کا خیال آیا تو ہندوستانی تاریخ کی محترم شخصیت حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی تصویر کی نقل کشی کی۔ ہندوستان کے اس ولی صفت شہنشاہ کی شخصیت ہمیشہ سے مجھے بہت پسند رہی ہے کیونکہ انہوں نے حکمرانی کو ایک فریضہ سمجھ کر اپنی ذمہ داری نبھائی اپنی ذات کے لئے خزانے سے کچھ صرف کرنا اپنے لئے حرام سمجھا۔ قرآن مجید کی خطاطی کرکے اپنا اور اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا انتظام کیا۔ ایسی ہستیاں میرے لئے ہمیشہ محترم رہیں۔ کرم فرماؤں نے میری ان تصویروں پر توجہ کی اور پھر انہوں نے یہ انکشاف فرمایا کہ شاعری کے ساتھ مصوری بھی میرا میدان نہیں۔ لیکن میرے ان کرم فرماؤں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مشورہ دیا کہ اپنے خیالات و احساسات کا افسانوں اور خاکوں کی صورت میں اظہار کرو۔ یوں میں نے افسانوں اور ناولوں کی دنیا میں قدم رکھا۔ خصوصیت کے ساتھ کردار نگاری کی جانب میرا میلان زیادہ رہا۔

اوائل شباب میں چند افسانے لکھے' احباب نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی تو یہی داستان سرائی میرا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ جنوں کے اسی عالم میں یورپ چلا آیا۔ یہاں کا ماحول' تہذیب اور کلچر اس ماحول اور تہذیب کی ضد تھا جہاں میں نے آنکھ کھولی۔ جس میں میں نے پرورش پائی۔ ابتداء میں یورپ کی تہذیب' ماحول اور لوگوں کو سمجھنے کے لئے ان کی تاریخ و ادب کا مطالعہ کیا۔ اس دوران ان کی تاریخ' ثقافت اور سب سے زیادہ ان کی سیاست سے سابقہ پڑا۔ ان کے کلچر میں رہتے ہوئے انہیں برتا۔ ان کے حسن سلوک اور تعصبات سے واسطہ پڑا۔ ان تمام مشاہدات اور تجربات کو میں اپنی تخلیقات میں مقید کرتا رہا۔ (اس کا کچھ حصہ قارئین کرام کی نذر ہے) میری ان ابتدائی کاوشوں میں اگر آپ کو تھوڑی سی مشرقی جذباتیت یا فنی کمی محسوس ہو تو آپ اسے میری مجبوری سمجھئے کہ اس عمر میں ناچیز اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

قارئین کرام! میں جذبات کی رو میں کچھ اس قدر بہک گیا کہ آپ کو یہ باور کرانا ہی

بھول گیا کہ اپنے ان افسانوں' خاکوں اور ناولوں میں یورپ کی زندگی کو میں نے ایک مسلمان کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس لئے کہ زندگی گزارنے' لوگوں اور چیزوں کو برتنے کے لئے ہر کسی کے پاس ایک نقطہ نظر ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر کو وہ مذہب' ثقافت یا اپنے زمانے کے طبقہ اشرافیہ سے لے لیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور اپنی افتاد طبع کے مطابق مختلف رجحانات اور خیالات کو پھولوں کی طرح اپنے ذہن کے گلدستے میں سجا لیتے ہیں۔ شعوری اور غیرشعوری طور پر زندگی کو دیکھنے اور برتنے کے لئے ایک نظریئے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اس سے فرار ممکن نہیں۔ خصوصاً" ایک فنکار کے لئے اس توڑ پھوڑ کے زمانے میں جہاں قدیم و جدید روایات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہوں' اقدار کا احساس انسانی زندگی میں توازن برقرار رکھنے کے لئے بڑا ضروری ہے۔ اور حیات انسانی کے لئے مذہبی اور روحانی اقدار بڑی اہمیت کی حامل ہیں اس لئے کہ مذہب جینے کا مقصد متعین کرتا ہے۔

ایک فنکار اور قلمکار عوام کے بہت قریب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ معاشرتی توازن اور مقصدیت کے لئے اس کی توجہ سماج میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ان دنوں جب میں لندن میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے کچھ ضرور پوچھتا ہوں اور آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس کے جواب سے مجھے خوشی نہیں بلکہ آگہی ملتی ہے کہ یورپ میں رہ کر میں کیا بن گیا ہوں۔ میری طرح میری تخلیقات پر کیا گزری؟ آئینے کی طرح یہ بات اپنے قارئین سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ میری تخلیقات پر توجہ فرما کر وہی یہ بتا سکتے ہیں کہ میں نے یورپ میں رہ کر کیا پایا اور کیا کھویا۔

ایک مرتبہ اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں پاکستان کے ایک پبلشر سے رجوع کیا تو انہوں نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔ "اب ہندوستان اور پاکستان میں ادب و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے آپ کو نہیں جانتے۔ کتاب کی ڈسٹری بیوشن میں کافی مشکلات پیش آئیں گی۔" اور جواباً" مسکراتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ مجھے جاننے کی انہیں چنداں ضرورت نہیں۔ بقول مولانا جلال الدین رومی۔ "انہیں میرے چہرے کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ انہیں دیکھنا یہ چاہئے کہ انہیں دینے کے لئے میرے پاس کیا ہے۔" وہ اسے دیکھیں۔ جس تہذیب و ثقافت سے ان کا تعلق ہے اسی

تہذیب نے میرے لئے جینے کا مقصد متعین کیا ہے۔ میں اسی کی آبیاری کے لئے جی رہا ہوں۔

اردو زبان کا ارتقاء برصغیر ہندوپاک میں ہوا۔ یہاں کی تہذیب اور ثقافت کے اردو زبان پر گہرے اثرات ہیں۔ اسلامی تہذیب کے رواداری اور انسانی محبت کے عناصر نے اردو کی تربیت کی وہی اس کے مزاج کا ایک گرانقدر حصہ بنے۔ علاوہ ازیں مفہوم کے اظہار بیان کے لئے مختلف انداز اس زبان میں کونپلوں کی طرح پھوٹتے رہتے ہیں۔ یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں فی زمانہ دو زبانیں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ پہلی Mandarin (چینی زبان) دوسری ہندی اردو (جو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں)

ہمارے زمانے میں اردو کی تاریخی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی ہے اور وہ یہ کہ آج صرف اسی زبان میں مسلمانوں کی بیداری کے لئے اسلامی نشاۃالثانیہ کا پیغام (جو صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر مجبور اور غریب عوام کے لئے بھی ہے) سماجی انصاف اور حقوق انسانی کا مطالبہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اردو زبان کی اس تاریخی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مجھے روسی زبان کا مشہور ناول نویس دوستووسکی یاد آیا جس نے روسی زبان کی انسان دوستی کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا تھا۔ اس وقت اس کے الفاظ میرے ذہن میں محفوظ نہیں البتہ اس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔ میرے ان افسانوں اور ناولوں میں لوگوں کی زندگی کی ہولناک تصویریں بھی ہیں انہیں اس طرح کی زندگی گزارنے کے لئے کس نے مجبور کیا۔ یہاں کے نظام سرمایہ داری نے، جس کو منافع، انفرادی آزادی اور پیداوار سے غرض ہے اسے منافع چاہئے جو اسے حکومت اور طاقت فراہم کرتا رہے۔ سرمایہ داروں کو عوام سے صرف اتنی دلچسپی ہے کہ وہ اس کے منافع کے لئے کام کرتے رہیں۔ یقیناً لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا، سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھی بڑی ترقی کی ہے بہت سی بیماریوں کا خاتمہ بھی ہوا ہے، لوگوں کو مادی تحفظات بھی ملے ہیں، عیش و عشرت کا انہیں عادی بھی بنا دیا گیا ہے لیکن اب وہ کس قسم کے انسان بن کر رہ گئے ہیں، میں نے اپنی تخلیقات میں یہی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ نظام سرمایہ داری نے انہیں یہ تمام سہولتیں محض اس لئے فراہم کیں کہ ان سے کام لیا جاتا رہے۔ اور لوگ سکون و مسرت سے محروم ہوگئے، طرح طرح کے نفسیاتی عوارض نے انہیں گھیر لیا۔ اب ان ستم رسیدہ

لوگوں کے سامنے عیش و عشرت کے بعد موت کو بھی دل آویز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مجبوروں' غریبوں اور بے کسوں سے بھری ہوئی تیسری دنیا جہاں افلاس نے نوع انسانی کو حیوانیت کی اس ادنیٰ سطح پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سوائے بھوک مٹانے کی خواہش کے کوئی اعلیٰ انسانی قدر ان میں باقی نہیں رہی۔ نظام سرمایہ داری میں جینے کا صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ پیداوار بڑھاؤ' اور اس کے بعد سرمایہ دار اپنی پیداوار کی کھپت کے لئے میڈیا اور اشتہار بازی سے کام لے کر لوگوں میں مصنوعی خواہشات جنم دے تاکہ اس کی پیداوار کی کھپت ہوتی رہے۔

میں مغرب کے انسان کا دشمن نہیں۔ میں مسلمان ہوں' میرا عقیدہ اور تہذیب خدا اور انسان سے محبت سکھاتی ہے۔ میں نے اپنی تخلیقات میں صرف یہی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نظام سرمایہ داری نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے انسان کو پستی کی کس سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھی مخالف نہیں۔ انسان کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ بھی میری دوستی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور آج سائنس کے پاس جو عقلی رویہ ہے وہ کلاسیکی دور کے مسلم سائنس دانوں نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یونان کے سائنسی فلسفے کو توہمات سے آزاد کر کے خالص تجرباتی بنا کے عطا کیا ہے۔ دراصل سائنس' ٹیکنالوجی اور دیگر علوم و فنون انسان کے لئے ہیں' انسان ان کے لئے نہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو کس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے' فلاح انسانی کے لئے یا صرف چند سرمایہ داروں کے منافع اور نوع انسانی کی بربادی کے لئے۔

یورپ میں رہتے ہوئے میرا تعلق لوگوں' ان کے ماحول' ان کے علوم و فنون' ادب اور آرٹ سے صرف کتابی ہی نہ رہا بلکہ یہاں کی آب و ہوا کے لوگوں پر اثرات' ان کے رویئے اور مطالعے کے ساتھ ان کا مشاہدہ بھی کرتا رہا ہوں۔ اور یہی مشاہدات اور تجربات میرے تخیل نے ان افسانوں میں سمو دیئے ہیں۔ اپنی ذات اور تخلیقات کے بارے میں دوسروں کی آراء کا احترام میری سرشت میں داخل ہے۔

زندگی' ادب' آرٹ اور علوم و فنون میں نظریاتی جانبداری کوئی نئی بات نہیں۔ لوگوں کے نظریات برابر انہیں متاثر کرتے رہے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی میں اشتراکی نظریات

اور سیاست نے لوگوں اور ان کے نظریات کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ یہ ہمارے زمانے کی ایک طرح کی شناخت ہے کیونکہ نئے نظریات لوگوں پر اپنی گرفت قائم کرکے ان سے اجتماعی کام لینا چاہتے تھے۔ روس میں سوشلسٹ انقلاب کی کامیابی کے بعد ہمارے چند سیاسی کارکنوں نے متحدہ ہندوستان اور اس کی مختلف زبانوں کے ادب میں ترقی پسندی کا نعرہ لگایا۔ یہ آواز اردو ادب میں بھی اٹھی اور سب سے پہلے انقلاب کے لئے اسلام اس کا نشانہ بنا۔ کیونکہ سوشلزم اپنے مزاج اور اقدار کے اعتبار سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا ہی مخالف نہیں بلکہ اس کے نزدیک مذہبی لوگ استحصالی طبقے کے آلہ کار ہیں اس لئے جہاں وہ لوگوں میں طبقاتی شعور ابھارتا ہے وہیں وہ مذہب سے بھی لوگوں کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ مذہب دشمنی سوشلزم کی بڑی اہم ضرورت رہی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں جب ان کی سیاست جڑ نہ پکڑ سکی تو اردو ادب میں بھی وہ براہ راست اسلام پر حملہ نہ کرسکے کیونکہ مسلمانوں کے اسلام سے گہرے لگاؤ سے وہ اچھی طرح واقف تھے' چنانچہ انہوں نے ان ہستیوں کے کردار اور خیالات کی صورتیں بگاڑنا شروع کردیں جو اسلام کی نمائندہ تھیں۔ اس کے ردعمل میں زندگی' سیاست اور ادب میں اسلام پسندی کی تحریک ابھری۔ حق و باطل کے معرکہ کی اس داستان کو میں طول نہیں دینا چاہتا۔ آج دنیا کی آبادی تقریباً" ساڑھے پانچ ارب ہے اور مسلمان دو ارب ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ آج دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جہاں نوع انسانی آباد ہو اور وہاں مسلمان نہ ہوں۔ اس لئے اب اسلامی عقیدہ اور اس کی تہذیب کتابوں اور عجائب خانوں کے لئے نہیں بلکہ نوع انسان کی روزمرہ زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اس پس منظر میں عظیم کلاسیکی تہذیب جس نے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرکے معبود حقیقی سے اس کا رشتہ استوار کیا۔ اس تہذیب اور عقیدہ کا ہمہ گیر اثر مسلمانوں کے علم' ادب' فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی پر ہوا۔ اور آج پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی ہیں جو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک نظریاتی امت ہے جو دنیا میں صرف عیش و عشرت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے جینا نہیں چاہتی کیونکہ اس کے پاس ایک واضح مقصد حیات ہے اور وہ ہے نوع انسانی کی فلاح۔ آج ساری دنیا کے مسلمان اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آخر زندگی' ادب اور علوم و فنون میں مسلمانوں

کی اس تحریک کا ساتھ کیوں نہ دیا جائے۔

میں آپ کو دور لے جانا نہیں چاہتا' یورپ کی تاریخ جدید سے چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا کیونکہ یورپ کی تقلید ہماری لئے فیشن بن چکی ہے۔ فرانس کا مشہور ادیب زولا جو ادب اور زندگی میں عیسائیت کا علمبردار رہا۔ اس کے مشہور عالم ناول "بوڑھا گوریو" اس کا نمائندہ کردار ہے۔ جرمن ادب میں گوئٹے اور جدید جرمن ادب میں کافکا جو صیہونی تحریک کا مستند کارکن ہے اور ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے افسانے اور اس کا ناول Trail اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ روس کا مشہور عالم ناول نویس دوستووسکی جس کی کتابوں کے دنیا کی تقریباً" تمام ہی زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں' عیسائیت کا طرفدار رہا ہے۔ روسی ادیب ٹالسٹائی اور مشہور سائنس دان آئن اسٹائن جس کا پیش کردہ سائنٹیفک نظریہ اب ماضی کی یاد بن کر رہ گیا ہے وہ حکومت اسرائیل کی بقاء اور استحکام کے لئے دنیا سے اپیل کرتا ہے۔ آخر میں زندگی' ادب' علوم و فنون اور مسلمانوں کے انسانی حقوق کی حمایت کیوں نہ کروں؟ نہ صرف مسلمانوں کے انسانی حقوق بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے سماجی انصاف کی حمایت--- اسلام دنیا میں اسی سماجی انصاف کے لئے تو آیا تھا۔ کیا یہ جمہوری خواہش نہیں۔

ابوالخطیب

۱۰ جولائی ۱۹۹۷ء

ہمپسٹیڈ (لندن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد

دور سے ایک آواز

"میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"۔

"اس وقت مجھے صرف باتیں کرنے کی ضرورت ہے ان کے بوجھ سے میرا دل بیٹھا جارہا ہے"۔

"کس قسم کی باتیں"۔

"وہ اب سب میرے اندر گڈمڈ ہوگئی ہیں"۔

"میرے پاس وقت نہیں۔ پھر تم اس وقت اپنے اندر اتنے الجھے ہوئے ہو کہ تمہیں خود نہیں معلوم کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"۔

"اس کے علاوہ ایک گزارش اور ہے؟"۔

"وہ کیا؟"۔

"میری جیب میں اس وقت پیسے نہیں کیا تم میرے لئے بیئر خرید سکتے ہو؟"۔

"معاف کیجے' میں شراب نہ پیتا ہوں اور نہ پلاتا ہوں"۔

"میں بھوکا ہوں"۔

"ہاں اگر تم بھوکے ہو تو میں کھانا پیش کرسکتا ہوں"۔

اس سستے اطالوی ریستوران میں کوئی ویٹر اور ویٹرس نہیں' جس کو یہاں کسی چیز کی

ضرورت ہو کاؤنٹر پر جائے' بوڑھا اطالوی اسی وقت اسے تیار کرکے آپ کے سامنے رکھ دے گا' آپ اس کی قیمت ادا کیجئے اور جہاں جگہ ملے اس کیفے میں بیٹھ جائے۔ میزبان نے اس وقت ایسا ہی کیا' کھانے کے ساتھ دو چائے کے کپ بھی لئے۔ قیمت ادا کرکے پہلے کھانے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی اس کے بعد چائے اٹھا کر ٹیبل پر رکھی' شکر ٹیبل پر ہی رکھی ہوئی تھی۔ یہ نوجوان بچوں کی طرح خوش ہوگیا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہوگئے' اس پر خوشی میزبان کو بڑی اچھی لگی تو وہ اس نوجوان سے مخاطب ہوا۔

''کیا تم کتابیں پڑھنے اور سوچنے سے دلچسپی رکھتے ہو؟''۔

''کتابوں سے میرا واسطہ ذرا کم پڑتا ہے' کبھی کسی کتاب کے نام نے متاثر کیا تو اسے ضرور پڑھتا ہوں کہ دنیا کو اس مصنف نے کیسے برتا اور لوگ اس کے ساتھ کیسے پیش آئے؟ سوچتا اس وقت ہوں جب کھانا اور منشیات پاس نہیں ہوتیں البتہ کتاب پڑھنے سے زیادہ آدمی کو پڑھنے میں مجھے مزا آتا ہے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں جو کچھ ہو اسے جاننے کی جستجو اس کی حرکات و سکنات ان سب کی مدد سے میرا تخیل اس آدمی کی ایک تصویر میرے ذہن میں بناتا ہے جو مجھے بڑی اچھی لگتی ہے' اور اس کی تصدیق نہیں کرتا کہ میرے تخیل کی بنائی ہوئی تصویر اس کی اصل شخصیت سے کتنی ملتی جلتی اور کتنی مختلف۔ اس وقت مجھے دلچسپی صرف اس تصویر سے ہوتی ہے جو میرے تخیل نے ذہن میں بنائی ہے۔

''تم بڑے دلچسپ آدمی نظر آتے ہو' اگر مناسب سمجھو اپنے متعلق کچھ اور بتاؤ''۔

''اپنے متعلق کچھ بتانے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تھوڑا سا آپ سے واقف ہوں۔ جس گلی میں آپ رہتے ہیں اس گلی کے نکڑ پر میری ماں کا گھر ہے' جب کبھی میں اپنی ماں سے ملنے اس کے گھر جاتا ہوں تو کبھی کبھی آپ کو بھی گھر سے نکلتے دیکھتا ہوں اور بس کے اڈے کے پاس جو فوارہ ہے جہاں کبوتر اور شراب کے عادی بنچوں پر بیٹھے ہوئے اونگھتے رہتے ہیں' کبھی کبھی آپ اپنے گھر کی باسی روٹی اور باسی چاول کوڑے دان میں پھینکنے کے بجائے ان کبوتروں کو کھلاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کبوتر آپ اور آپ جیسے لوگوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں بیٹھا ہوا کوئی شخص کھانے کو کچھ مانگتا ہے تو

اس وقت آپ کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہو تو آپ آدھی اسے دے دیتے ہیں اور کبھی آپ اسے پیسے بھی دے دیتے ہیں۔ جب کبھی میں نے آپ کو دیکھا آپ سے باتیں کرنے کو بڑا جی چاہا کیونکہ ان دنوں اس شہر میں بغیر مطلب کے دوسروں سے لوگ کب ملتے ہیں؟ آپ مجھے بڑے غم گسار اور ہمدرد نظر آئے۔

"چہروں کو دیکھ کر تم لوگوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہو لیکن لوگوں کے چہروں پر وہ سب کچھ کہاں ہوتا ہے جو ان کے اندر! ان کے عمل ان کی سوچ سب پر نظر رکھنا پڑتی ہے"۔

"نہیں مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ تمام ایک ہی طرح ہوتے ہیں جو ان کے اندر ہوتا ہے وہ چہرے اور آنکھوں میں عیاں ہو جاتا ہے' البتہ تعلیم یافتہ اور پیشہ ور عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں' اپنے اصل جذبات اور خیالات کو چھپانے کے لئے انہیں بڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے' ان کی ضرورتیں اور تعلیم انہیں تھوڑا سا اداکار بنا دیتی ہے۔ انہیں جاننے کے لئے حالات اور معاملات کے اعتبار سے دوسری تیکنیک اختیار کرنا پڑتی ہے۔ خود پر قابو پا کر وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں"۔

"اگر ناگوار نہ گزرے تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیا کام کرتے ہو؟"۔

"میں اسکاچ ہوں گلاسگو میں پیدا ہوا میرا نام جیمس میلکم۔ اس وقت میری عمر ۲۷ سال ہے۔ سات مرتبہ جیل کاٹ چکا ہوں۔ چوری خصوصاً" کاریں چرانے کا ماہر ہوں۔ کئی مرتبہ گھروں میں گھس کر قیمتی چیزیں چرائیں' جب گھر میں لوگ سوئے ہوتے تھے۔ منشیات کا خود عادی ہوں منشیات دوسروں کو سپلائی کرتا ہوں اور میرا تعلق تباہ شدہ خاندان سے ہے۔ میرا باپ شاعر تھا گیت لکھتا تھا خواب دیکھتا اور خیالوں میں رہتا کہیں جم کر کام نہ کرتا۔ شاعری کے علاوہ کئی پیشے اس نے اختیار کئے۔ کامیابی کسی میں بھی حاصل نہ کی' وہ نہ کامیاب شاعر بن سکا' نہ کسی اور کام کا عادی۔ میری ماں نے اس سے اس وجہ سے شادی کی کیونکہ وہ بلونڈ تھا اور آنکھیں نیلی اور گہری' جب ہنستا تو عورت کو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میری ماں ایک دنیادار عورت ہے اسے جینے سے محبت ہے۔ لیکن جینا بھی عیش و عشرت سے۔ میرا باپ یہ سب کچھ اسے کب فراہم کر سکتا تھا' اسی لئے گھر میں ہر روز لڑائیاں ہوتیں۔ جب میں پیدا ہوا تو ماں کی دولت کی ضرورت اور بڑھ گئی۔

میرا باپ اکثر گندے کام کرتا۔ اکثر و بیشتر حکومت کے بھتہ پر رہتا۔ میری ماں اسے اس حالت میں دیکھ کر پاگل سی ہو جاتی' وہ ہاتھا پائی پر اتر آتی' لیکن میرا باپ اسے یا کسی دوسرے جاندار کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا صرف غصے میں بے جان چیزوں کو توڑ کر اپنے غصے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

ان آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آکر اس نے خودکشی کرلی۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے تھوڑا سا غم ضرور کیا' تھوڑی سی تنہائی بھی محسوس کی۔ پڑوسی کی بلی نے جب بچے دیئے ماں کو ایک بچہ اس سے مل گیا۔ ذہنی حالت کے بگڑنے سے بقیہ زندگی وہ بھی حکومت کے بھتہ پر گزارتی ہے۔ اب اسے میری بھی زیادہ پرواہ نہیں رہتی' صرف یہ بلی کا بچہ بغیر شکر دودھ کے۔ سارا دن جاسوسی ناول پڑھ کر گزارتی' رات کو ٹی وی دیکھتی ہے۔ یہ اس کی زندگی ہے۔ اب ماں نے لوگوں سے منہ پھیر کر جانوروں میں دلچسپی لینا شروع کردی ہے اگر کسی دن بلی کا بچہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے تو وہ پھر پاگل سی ہو جاتی ہے۔ میرا زیادہ گھر آنا بھی اسے ناگوار گزرتا ہے۔

"تم ایک ذہین اور جوان آدمی ہو اس طرح کی زندگی کب تک گزارو گے؟ کوئی پسند کا کام تلاش کرلو اس سے سوسائٹی کو بھی فائدہ ہوگا' اور تمہیں بھی"۔

سوسائٹی کا نام سنتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات میں پھر کرختگی ابھری' آنکھوں میں بھی غصے کے شعلے دہکتے ہوئے دکھائی دیئے اور اس نے جواب دیا۔

"جو کام میں کرتا ہوں بے وقوف آدمی یہ کام نہیں کرسکتا اس میں بھی ذہانت اور ہوشیاری کی بڑی ضرورت ہوا کرتی ہے' مجھے سوسائٹی سے کیا ملا؟ میری کون فکر کرتا ہے؟ سوسائٹی سے ہمدردی کیوں ہو؟ جب تک میں زندہ ہوں صرف اپنے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں اور یہ جینے کا مزا اس وقت اور دو آتشہ ہو جاتا ہے جب مجھے شراب اور منشیات مل جائیں' میں بھوکا اور تنہا رہ سکتا ہوں لیکن بغیر منشیات اور شراب کے جینا اب محال ہے۔

میری کسی چیز کا کوئی ٹھیک نہیں' ایک شام منشیات کے لئے میری جیب میں پیسے نہ تھے' میری بری حالت تھی' صبح سے میں شکار کی تلاش میں تھا' ایک بوڑھا مجھے شام کے جھٹ پٹے میں لندن کی ایک تنگ اور سنسنان گلی میں ملا' دل میں امید جاگ اٹھی اسے

اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر نکڑ پر کھڑا اس کا انتظار کرنے لگا۔ لباس اور چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ متوسط طبقے کا آدمی ہے اس کی جیب میں رقم کا ہونا ضروری ہے۔ وہ جھک کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب آیا میں نے جھپٹ کر اسے دھکا دے کر اس سے کہا میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں جو کچھ تیرے پاس ہے مجھے دیدے۔ اتنا کہہ کر میں نے اسے مارنے کے لئے مکا اٹھایا تو وہ لرز گیا اور فوراً" جیب سے پرس نکال کر اس نے میری طرف زمین پر پھینک کر کہا۔

"یہ پرس ہے اس میں رقم ہے اسے لے لو مجھے مت مارو میں ابھی ابھی اسپتال سے آیا ہوں میرے ٹانکے ہرے ہیں میں مرجاؤں گا تو رقم لے لے..... مجھے مارنے سے تجھے کیا ملے گا؟"۔

"اسے چھوڑ کر میں نے جھپٹ کر زمین سے پرس اٹھایا اور دوسری گلی میں مڑ گیا' جلدی سے نوٹ نکالے' دس دس کے سات نوٹ تھے' جی خوش ہوگیا! نوٹ جیب میں رکھ کر پرس سڑک پر رکھے ہوئے کوڑے دان میں پھینکا۔ جیسے چوٹ کے پڑتے ہی جسم میں دکھ نہیں ہوتا بلکہ بعد میں اس کا احساس ہوتا ہے کچھ اسی طرح جب نوٹ لے کر میں بوڑھے سے الگ ہوگیا تو اس کے چہرے کا تاثر پھر میرے ذہن میں ابھرا' اس کے ساتھ اس کی حالت اور بے بسی! اب اس پر مجھے رحم آنے لگا اور اس کے ساتھ جو سلوک میں نے کیا اس وقت میرے دل کو بھی اچھا نہ لگا اور جب تک یہ احساس اور خیال میرے ساتھ رہا مجھے کچھ اچھا نہ لگا' ایک خلش کی طرح میرے دل میں چبھتی رہی۔ جیب میں رقم تھی لیکن منشیات کی خواہش بھی میرے اندر اس وقت نہ رہی۔ میں بڑی دیر تک خالی خالی سا رہا۔ اپنی اس حالت سے مجھے وحشت ہونے لگی اور اس وقت پب میں جاکر خوب شراب پی اتنی پی کی دھت ہوگیا اس وقت کسی قسم کا خیال و فکر میرے ساتھ نہ رہا"۔

"کبھی تم نے اپنے مستقبل کے متعلق بھی سوچا ہے؟"۔

"آج مستقبل کسی کا نہیں۔ دیکھتے نہیں دنیا میں اس وقت ہر طرف توڑ پھوڑ ہو رہی ہے! کہیں سکون ہے؟ دیکھو ان سیاست دانوں اور صنعت کاروں کو' ان کے پاس سارا سازوسامان ضمانت اور تدبیریں ہیں کیا ان کے منصوبوں کی گرفت میں ان کا مستقبل ہے؟

ہاں میں اس وقت اپنی ایک اہم بات بتانا بھول گیا۔ میری طرح سوسائٹی کی ٹھکرائی ہوئی ایک حرامی لڑکی سے میرا تعلق پیدا ہوگیا۔ اس کی ماں سے نہ بنتی تھی وہ محبت کی پیداوار تھی، جب اس کی ماں حاملہ ہوئی تو اس کا بوائے فرینڈ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کبھی لوٹ کر اس کی ماں کے پاس نہ آیا۔ جب یہ لڑکی جوان ہونے لگی تو ماں سے ناراض ہو کر اپنے باپ کی تلاش میں رہنے لگی۔ اسے باپ تو نہ ملا میں اسے مل گیا۔ ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی حاملہ ہوئی تو ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر مکے کی طرح ایک جذبہ پھوٹا کہ یہ میری ہے اور مجھے اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ اپنی موجودہ زندگی میں اس قسم کے جذبے سے دوچار ہونے پر مجھے خود پر تعجب ہوا، اس کا تو زندگی بھر مجھے پتہ نہ چل سکا کہ اس قسم کے جذبات میرے اندر بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ اپنی ذات اور مزوں کے علاوہ میں نے کبھی کسی دوسرے کا خیال نہ کیا، آخر میری زندگی میں وہ کون ہے جس کی مجھے خبر نہیں! جو ان جذبوں کو سورج کی روشنی اور شہد کی مٹھاس کی طرح میرے اندر ٹپکا رہا ہے! ہاں میں بات مستقبل کی کر رہا تھا جو آج انسانی زندگی میں نہیں صرف خوابوں میں ہے۔ میرے نزدیک تو اب ان حالات میں انسانی زندگی کچھ ایسی بن گئی ہے جیسے ایک معصوم بچہ سمندر کے کنارے اپنا جی خوش کرنے کے لئے محنت اور دلچسپی سے کوئی محل بنائے اور دوسری طرف سے آنے والے راہ گیر کی ٹھوکر سے ڈھیر ہو کر پھر وہ ریت میں مل جائے.... یا تیز ہوائیں پھر اس محل کو ختم کردیں۔ اس بچے پر کیا گزرے گی.... لیکن اب میں بچہ نہیں اب میں ایسا نہیں کرسکتا۔ بچپن کے اس مقام سے میں گزر چکا ہوں، اس لئے اب مجھے صرف حال سے دلچسپی ہے، حال ہی میرے نزدیک سب سے بڑی حقیقت ہے، میں صرف حال میں جینا چاہتا ہوں اور جینا مزے اڑانے کے لئے، اپنی کوششوں سے جتنے مزے حاصل کرسکوں یہی حاصل زندگی ہے، لیکن یہ سب کچھ کہتے ہوئے یہ بھی ضرور کہوں گا بوڑھے کی بے بسی اور خلش نے میرے سینے میں دوسروں کے لئے رحم پیدا کردیا، اس احساس سے جب میری پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں ہوتا باپ کی طرح میں بھی شاعری کرنے لگتا ہوں۔ لیکن میری شاعری کی کیا قدروقیمت؟ میرے باپ نے اپنی پوری زندگی شاعری کو دے دی، سوسائٹی نے کیا صلہ دیا؟ ناامید ہو کر اس نے خودکشی کرلی۔ لیکن میں اپنی جان کبھی اس طرح ختم نہ کروں گا آخر اپنی جان کیوں

دوں؟ لیکن اس کے ساتھ میں دکھ میں رہنا بھی نہیں چاہتا' سوسائٹی سے اپنے جینے کا خراج لیتا رہوں گا!"۔

"کیا خدا کی ضرورت بھی تم نے کبھی محسوس کی؟"۔

"ہاں خدا کا نام سنا ہے لیکن خدا سے کبھی واسطہ نہ پڑا۔ کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے آخر اس نے مجھے کیوں پیدا کیا اور وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"۔

"منشیات اور دوسری ضروریات کے لئے تمہیں شکار کی تلاش رہتی ہے' اب یہ تمہاری ضرورت اور عادت دونوں بن گئیں' کیا کبھی خدا کی تلاش کی کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟"۔

اس سوال کو سن کر ایک خیال لہر کی طرح اس کے اندر اٹھا اس پر یہ نوجوان ہنسا اور جواب دیا۔

"جس قسم کی زندگی ان دنوں میں گزار رہا ہوں ایسی گندی زندگی میں خدا کی یاد کا گزارا میرے اندر کیسے ہو سکتا ہے؟"۔

"خدا انسان سے کسی حالت میں رشتہ نہیں توڑتا۔ جب آدمی اس کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ماں کی طرح اس کی طرف آتا ہے۔ خدا پہلے رحیم ہے اس سے بڑا کوئی رحیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے یہ کائنات خدا نے ان کے لئے بنائی ہے کیا یہ خدائی محبت نہیں؟"۔

"تو آخر اس زندگی میں خدا سے کیا طلب کروں؟"۔

"یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اس کا فیصلہ تم خود کرو' تم اپنی ضرورتوں سے جتنے واقف ہو دوسرا کب ہو سکتا ہے؟"۔

"اس کا بھی تم خود تجربہ کرکے دیکھو"۔

دو آدمی..... ایک جوان لندن کے جدید فیشن کے مطابق زین کی پتلون کالے چمڑے کی جیکٹ پیروں میں نئے جوتے لیکن دھول سے اٹے ہوئے بڑی بڑی اداس خوبصورت آنکھیں' یہ اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس کا نام جیمس میلکم۔ اس کا میزبان ایک انڈوپاکستانی مسلمان ادیب' ادھیڑ عمر کا گہرا گندمی رنگ ناک نقشہ جاذبِ نظر' عمر نے اس کے چہرے کے خدوخال کی کشش ذرا دھندلی کردی تھی لیکن جب وہ مسکراتا تو اس کی آنکھیں اور

مسکراہٹ بڑی پرخلوص اور پراسرار بن جاتیں' اس کا نام ثقلین راشدی تھا' وہ طبیعت کا سادہ لباس بھی سادہ چہرے پر چھوٹی سی داڑھی جو اس کے تہذیبی تشخص کی نشانی تھی اور دور سے یہ داڑھی ایسی معلوم ہوتی جیسے بدلیوں میں دھندلا چاند اور یہ داڑھی! اب یورپ میں دانشوری اور سائنس دانوں کی شان کا نشان! یہ کیفے ناکام ادیب' شاعروں' اداکاروں اور بوڑھی ایکٹروں کا مرکز تھا' جس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے وہ چائے کی ایک پیالی پر دن بھر بیٹھ سکتا تھا' بوڑھا اطالوی ان سب کو جانتا تھا اور ان کی ضرورتوں اور تنہائی سے اچھی طرح واقف۔ اس میں مشین کی طرح صرف اس وقت جنبش ہوتی جب کوئی خریدنے آتا اس وقت اس بوڑھے سے خیریت کے کلمے کہہ کر مزاج پرسی کرتا' وہ اس کا بھی اسی طرح جواب دے دیتا جس طرح آرڈر پر کھانا۔ مسلمان ادیب اپنے ہم وطن نہیں بلکہ ہم ذات ادیب' شاعروں اور موسیقاروں سے ملنے ملانے یہاں آجاتا کیونکہ ان دنوں لندن میں عیش و عشرت کی ریل پیل میں تنہائی اور انسانی بے تعلقی اور سردمہری نے یہاں کے رہنے والوں کو سانپ کی طرح ڈس لیا تھا۔ لوگ لوگوں سے کٹے کٹے رہتے' لیکن رہتے لوگوں میں۔ بات چیت کا موقع بہت کم ملتا۔ اس مہذب علاقے میں شاندار مکانوں اور اونچی عمارتوں کے زیرسایہ صرف یہی کیفے تھا جہاں بات چیت کی ضرورت ہی آسانی سے پوری نہ ہوتی بلکہ ادب' آرٹ' فلسفہ' سیاست اور مذہب کی ضرورت پر زوردار تقریریں ہوتیں۔ اس کے لئے یہی موسیقی تھی اور اسی کے لئے یہ مسلمان ادیب اور دوسرے ناکام فنکار اور موسیقار یہاں آیا کرتے۔ جو اسکاچ لڑکا مسلمان ادیب سے اس وقت باتیں کر رہا تھا وہ اپنی گرل فرینڈ کو تلاش کرنے یہاں آیا تھا۔ وہ تو اسے نہ ملی یہ مسلمان ادیب اسے نظر آیا تو اس کی ٹیبل کے ساتھ جو دوسری کرسی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ ادیب وہاں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا' جب کتاب سے ادیب کی نظر ہٹی اور اس نوجوان کو دیکھا تو اس نے اس سے سوال کیا۔ جواب دینے سے پہلے فنکار نے کیفے سے باہر فن چلے روڈ کی سڑک پر ایک نظر ڈالی جو ہندوستان میں بریلی کے بازار کی طرح لمبی! اس کے متعلق ایک مشہور گیت کا مصرعہ اس کے ذہن میں تھا جو اسے اچھی طرح یاد نہ تھا صرف یہ خیال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا کہ کوئی محترمہ بریلی کے بازار میں اپنا جھمکا بھول آئی تھیں! وہ جھمکا اسے یاد تھا لیکن اس مسلمان ادیب کو یہ یاد نہ رہا کہ لندن کے عیش و عشرت کے

اندھیرے میں اس کی کونسی چیز گم ہوئی..... وہ اسے یاد نہیں آرہی تھی۔ صرف یہ احساس زیاں ضرور تھا کوئی چیز اس کے پاس سے گم ہو گئی!

(لندن۔ ۱۹۹۶ء)

وہ اسی راہ سے گزرا تھا

اگست کا مہینہ' ہفتے کی رات اور وہ بھی بڑی تاریک صرف کہیں کہیں بجلی کے رنگ برنگے قمقموں اور ٹیوب لائٹ نے تھوڑی سی چکاچوند پیدا کردی تھی۔ ہیمپسٹیڈ کے ایک مشہور کیفے Tea Room میں' میں اپنے ایک موسیقار دوست کی Mandolin کی دھن اور اس کیفے کی مشہور چائے اور آسٹریلیا کے مشہور چیز کیک سی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہفتے کی رات لندن میں جشن نوبہار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رات لوگ کیفے اور شراب خانوں میں بیٹھ کر کھانے پینے اور لوگوں کو ذرا فاصلے سے دیکھ کر معاشرت کا لطف اٹھاتے ہیں۔

اس رات میرا موسیقار دوست اداس تھا۔ اسے اپنے دوستوں اور معاشرت سے بڑی شکایت تھی جب Mandolin پر اس کی انگلیاں تھرکنا شروع ہوئیں تو اس نے لوگوں پر ایک نظرڈالی لیکن اس کے چہرے کی اداسی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس نے پھر نظریں جھکالیں۔ اب یہ ساز بھی اس کی شکایت میں شریک ہوگیا۔ صاحب دل فنکار اپنے خوابوں کی وجہ سے زندگی سے مطمئن کب ہوتا ہے۔ خصوصا" ایسا صاحب دل فنکار جس کے پاس جینے کے لئے عقیدہ بھی ہو۔ میرا یہ فنکار دوست عقیدے کی تلاش میں نگر نگر مارا پھرا اور جب وہ اسے مل گیا تو پھر گھر آکر شکایتوں میں الجھ گیا۔ یہ شکایتیں اسے کہاں

لے جائیں گی یہ اسے ابھی نہیں معلوم' اس وقت اداس میں بھی تھا۔ اس کے ساز سے جو آواز آرہی تھی اس نے مجھے اور بے چین کردیا تو اپنے دل کو بہلانے کے لئے اس سے کہا اگر میں خوش نہیں تو کیا کچھ مسرور چہروں کو دیکھ کر تجھے جگالوں۔ اداسی کی موجودگی میں جب میری آنکھوں نے ان مسرور چہروں کو دیکھا تو اکثر کے چہروں پر وہ خوشی تھی جو شراب کے نشے سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے دل کو یہ مصنوعی خوشی ناگوار لگی پھر اس سے وحشت ہونے لگی کیونکہ اپنے مزاج اور تہذیب کی وجہ سے شراب سے مجھے کبھی انسیت پیدا نہ ہوئی۔ اپنے موسیقار دوست کی موسیقی سے طبیعت پہلے ہی مکدر تھی۔ اس کے بعد شراب کے نشے کی پیدا کردہ خوشی سے بیزاری۔ لیکن اس وقت مجھے لوگوں کی ضرورت تھی۔ غیراختیاری طور پر میری نگاہیں اٹھیں۔ ماحول کا پھر جائزہ لیا۔ بعض چہروں نے متوجہ کیا۔ ان پر نظریں ٹھہریں' اس کے بعد آگے بڑھیں۔ بعض سپاٹ چہروں سے یونہی گزر گئیں۔ یہاں لوگوں کو صرف ان سے دلچسپی تھی جو ان کے قریب تھے۔

معاً" اس کیفے کے ایک نیم تاریک کونے سے ایک ہاتھ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس پر توجہ کی ہاتھ پھر ہلا تو اس مرتبہ میں نے غور سے کونے کی طرف دیکھا تو مجھے اپنا ایک انگریز دوست جون (John) نظر آیا آنکھوں پر سفید چشمہ' الجھے بال' ہلکی سی داڑھی' معصوم ناراض چہرہ' اس نے پھر ہاتھ ہلاکر سلام کیا۔ میں نے اسی کی طرح مسکراتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس نے پھر ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس اشارے کو پاکر میں نے اپنے موسیقار دوست کی طرف دیکھا۔ وہ خود اس ہاتھ کے اشارے کو دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے فراخ دلی سے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ اب اداسی اس سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے چہرے اور Mandolin کی آواز سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

میں اس نیم تاریک کونے میں جون کے بالکل سامنے جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک اور انگریز نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جون نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایلن" پھر میری طرف اشارہ کرکے "ارشد!"۔

"جی ہاں میں ایلن کو جانتا ہوں ہیمپسٹیڈ کے کیفوں میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔" میں

نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"جی نہیں، ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ چکے ہیں۔" اس نے روایتی اکڑ کے ساتھ جواب دیا۔

اس اکڑ کو میں نے قابل توجہ نہ سمجھا۔ نہ اسے کوئی جواب دیا صرف جون سے پوچھا۔

"آج کل کہاں رہتے ہو، ہیمپسٹیڈ کے کیفوں میں اب بہت کم نظر آتے ہو"۔

"اب مجھے کیفوں سے نہیں بلکہ شراب خانوں سے دلچسپی ہے"۔

"میں شراب نہیں پیتا اس لئے شراب خانوں میں نہیں جاتا"۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"۔

"ہاں، لیکن مجھے تعجب ہے، تم مجھے اتنے عرصے سے جانتے ہو تمہیں ابھی تک معلوم نہیں کہ میرے عقائد کیا ہیں"۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہارے عقائد کا مطالعہ میں تمہارے برتاؤ میں کر سکتا ہوں کہ تم لوگوں اور زندگی سے کس طرح معاملہ کرتے ہو"۔

"ہاں عقیدے یا ذاتی فلسفے کو جاننے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔" میں نے جواب دے کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر جون اور اس کے دوست کو سگریٹ پیش کئے جون نے سگریٹ نہیں لیا انکار کر کے شکریہ ادا کیا البتہ اس کے دوست نے سگریٹ لے کر اسے ٹیبل پر ٹھونکا اور شکریہ ادا کئے بغیر سگریٹ منہ میں لگا کر ماچس تلاش کرنے لگا۔ میں نے اس خدمت کو بھی انجام دیا اس نے سگریٹ جلائی ایک لمبا کش لگا کر وہ پھر ہم سے بے تعلق ہو کر کیفے میں دوسرے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ جب میں نے اپنا سگریٹ سلگایا تو جون نے پھر سوال کیا۔

"لیکن تم بتاؤ اتنے دن تم کہاں رہے؟"۔

"میں پیرس اور روم کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا"۔

"آوارہ گردی، بہت خوب! وہاں کوئی چڑیا ہاتھ لگی۔ جو تمہاری آوارگی کا ثبوت دے۔" اس مرتبہ سوال کر کے جون کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ چمکی تو مجھے آوارگی کی تشریح کرنا پڑی۔

"نہیں میں پیرس اور روم کی گلیوں میں عورت کی تلاش میں نہیں گیا تھا۔ مجھے اس سفر میں کسی چیز کی تلاش نہ تھی۔ صرف پیدل چلنے کی خواہش تھی۔ ان دنوں پیرس اور روم میں سورج خوب چمک رہا تھا۔ اس لئے وہ عمارتیں اور گلیاں جہاں اینٹوں اور پتھروں کے چوکور ٹکڑوں کا فرش ہے۔ اس پر آہستہ آہستہ چلنا پھر خود اپنے پیروں کی آواز سننا اس کے بعد ان عمارتوں کو دیکھنا جن میں جمال اور دبدبہ دونوں گھل مل گئے ہیں۔ جب دھوپ میں ان عمارتوں کے سائے دراز ہو کر اس فرش پر پھیل گئے جس پر آہستہ آہستہ چل کر میں اپنے قدموں کی آواز سن رہا تھا تو مجھے اپنی تہذیب یاد آئی لیکن اس وقت' جب میں گلی کے نکڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے یہاں راستہ کسی سے نہ پوچھا۔ جب ایک گلی ختم ہوتی تو دوسری گلی جو مجھے پسند ہوتی اس طرف چل دیتا۔ ان تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا میں پیرس میں دریائے سین کے کنارے آگیا۔ اس کے پاس ہرے بھرے پیڑ جھوم رہے تھے۔ پھر دریا میں لہروں کو دیکھا۔ جس طرف وہ جارہی تھیں میں بھی چل پڑا۔ پھر مجھے فاصلے پر ایک پیاری گلی نظر آئی اس میں مڑا۔ یہاں مسجد کا ایک مینار نظر آیا۔ مسجد میں جاکر ٹھنڈا پانی پیا کیونکہ پیرس میں اس وقت بڑی گرمی تھی۔ اس کے بعد ظہر کی نماز کے لئے موذن کی آواز سنی پھر نماز باجماعت کے لئے وہاں ٹھہر گیا۔

"مسجد میں نماز سے فارغ ہو کر پھر تم کہاں گئے؟"۔

"پھر میں گلی کے دوسرے نکڑ پر کھڑا ہو کر پیرس کے کھیتوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا تو ان میں خوبصورت عورتیں مجھے بڑی اداس نظر آئیں۔ میں سوچنے لگا ان لوگوں نے اپنی قوت اور احساس جمال سے ماحول کو کیسا سحرانگیز بنا دیا ہے لیکن یہ پیرس جیسا خوبصورت شہر بنا کر اداس کیوں ہو گئے۔ انہیں کس نے اداس کر دیا؟ پیرس' یہ شہر ہے یا تہذیب؟"۔

"ہمت اور جینے کے مقصد سے زیادہ ان کے پاس خواہشیں ہیں۔ مغرب کا یہی المیہ ہے کہ یہ اپنی ہر چیز کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ ان کی خواہشیں ان کے سایوں سے زیادہ دراز ہیں۔" جون اس مرتبہ اپنی رائے ظاہر کر کے ذرا اداس ہو گیا۔

"اس احساس کی موجودگی میں تم کچھ کیوں نہیں کرتے؟"۔

"میں حکومت کی امداد پر نہیں رہتا بلکہ کام کرتا ہوں اور کام کے بعد شراب پیتا ہوں

تاکہ یہ المیہ مجھے زیادہ دکھ نہ پہنچا سکے"۔

"دکھوں سے اتنی جلدی کیوں گھبرا گئے"۔

"ہاں اب مجھ میں دکھ سہنے کی سکت نہیں ہے۔ جب شراب کا ضرر مجھے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے تو پھر موسیقی کی طرف رخ کرتا ہوں اور خوب موسیقی سنتا ہوں"۔

تعارف کے باوجود جون کے دوست کی اکڑ ابھی تک باقی تھی۔ چائے کا مگ اس کے سامنے رکھا ہوا تھا ہماری گفتگو وہ بھی سن رہا تھا لیکن اپنے رویئے سے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ان خیالات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی حسین لڑکی اس کیفے میں خوشی میں زور کا قہقہہ لگاتی تو مسکراہٹ سے اس کا چہرہ چمکنے لگتا۔

کیفے کے نیم تاریک کونے میں جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے ذرا فاصلے پر دائیں طرف ایک اور نہایت حسین سنہرے بالوں والی لڑکی ایک نوجوان پستہ قد یہودی سے پنجہ لڑا رہی تھی۔ اس ٹیبل کے قریب جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے' اس مقابلے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ان دونوں پنجہ لڑانے والوں کو اس دلچسپی کا احساس تھا۔ خوبصورت لڑکی کی گرفت یہودی نوجوان کے پنجہ پر بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس کے پنجہ کو جھکائے جا رہی تھی۔ اس جدوجہد میں کامیابی محسوس کرکے اس کے چہرے اور رویہ میں ایک قسم کی نسوانی دلربائی کے ساتھ فتح مندی کا احساس بھی ابھر رہا تھا۔ پستہ قد یہودی نوجوان ہر قیمت پر پوری قوت کے ساتھ اس خوبصورت لڑکی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اپنی قوت اور شکست کا اسے احساس ہو چکا تھا لیکن زک کھانے کے باوجود اس شکست کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لڑکی نے فتح مندی کے احساس کے ساتھ مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے پنجے کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ تو لوگوں نے ایک زور کا قہقہہ لگا کر تالیاں بجائیں۔ جون کا دوست اس مقابلے میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ جب مقابلہ ختم ہو گیا تو اس نے اپنی چائے جلدی سے پی۔ اپنے ہاتھ کی گھڑی دیکھ کر جانے کے لئے اٹھا اور جون سے مخاطب ہوتے ہوئے رسمی جملہ ادا کیا۔ "پھر ملاقات ہوگی"۔

اس کے اس طرح جانے کو ہم دونوں نے محسوس کیا۔

رات اور گہری ہو چکی تھی۔ ہیمپسٹیڈ کے شراب خانے بند ہو رہے تھے اس لئے

لوگ اب Hampstead Tea Room میں کافی اور ہلکے پھلکے کھانے کے لئے آتے جارہے تھے۔ ان شرابیوں کے آنے سے کیفے میں ایک ہنگامہ سا ہونے لگا۔ جون کو اس ہنگامے سے یک گونہ خوشی ہوئی۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھا اور خود کاؤنٹر پر شراب کا گلاس خریدنے چلا گیا۔ تمہارے سفر سے مجھے بڑی دلچسپی ہے مجھے اس کے متعلق ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ شراب کا گلاس لے کر جون پھر میرے مقابل بیٹھ گیا۔

"اس سفر کے متعلق میرے پاس کافی تاثرات اور Notes ہیں۔ لیکن اس وقت یہ سب میرے اندر گڈمڈ ہوگئے ہیں"۔

"اصل میں ان تاثرات اور تجربات کو ابھی میں ہضم نہیں کرسکا۔ ان سے میرے اندر کچھ بن نہیں پایا۔ میں ابھی بکری کی طرح جگالی کر رہا ہوں"۔

"بکری کی طرح جگالی' بہت خوب' تم مشرقی لوگ بڑے پراسرار ہوتے ہو"۔

اس مرتبہ کیفے کے کاؤنٹر سے جون وہسکی خرید کرلایا اور وہسکی کے اس چھوٹے سے گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں ختم کرکے خاموش بیٹھ گیا۔ اس کی خاموشی کا بھی میں نے ساتھ دیا لیکن اس کے چہرے پر نظر نہیں رکھی' جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہسکی کا اثر اس پر غالب آتا جارہا تھا۔ وہسکی نے سب سے زیادہ اس کی آنکھوں کو متاثر کیا۔ اس وقت وہ کچھ کہنے سے زیادہ سننے کو ترجیح دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اس وقت میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ وہسکی کے اثر کے غلبے کو اپنے اعصاب کے علاوہ اپنے احساسات اور خیالات پر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ لیکن اس جدوجہد میں وہ کامیاب ہوتا نظر نہ آرہا تھا' وقت گزرنے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھاری ہوتی جارہی تھیں۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر تھوڑی دیر میں نے خاموشی میں اور گزارا۔ کیفے میں پھر ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ جون نے اس طرف دیکھا جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ کیفے کا منیجر اب خریداروں سے کیفے کے بند ہونے کا ذکر کر رہا تھا۔ ہفتے کی رات تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا لوگوں کو کام پر نہیں جانا تھا اس لئے اس رات کو اپنے قہقہوں' گانوں اور لڑنے بھڑنے سے جتنا رنگین کرسکیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے' اس میں انہیں لطف آرہا تھا۔ انہوں نے منیجر کے کہنے پر کوئی توجہ نہ کی تو اس نے کیفے کی بجلیاں بجھادیں یہ شرابی پھر بھی یہاں بیٹھے رہے پھر منیجر ہمارے پاس آیا اور آہستہ سے کیفے کے بند ہونے کے اوقات پر توجہ دلائی۔

ہم اٹھے تو ویٹریسوں نے کرسیاں ٹیبلوں پر رکھنا شروع کیں۔ ایک کرسی پر ایک سرخ سوئٹر رکھا ہوا تھا' جون نے مجھے دیکھ کر اس کی طرف اشارہ کیا' نہیں یہ میرا سوئٹر نہیں۔
کالی رات بڑی خوشگوار تھی۔ ہوا بھی ہولے ہولے چل رہی تھی اور لندن کے آسمان پر چاند ستاروں کے ساتھ ساتھ اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ جون نے اس وقت چاند کو سفر کرتے ہوئے نہ دیکھا صرف نفیس ہوا کو محسوس کیا۔ سڑک پار کر کے ہم دوسری طرف فٹ پاتھ پر آئے تو جون نے مجھے پھر مخاطب کیا۔
"تم نے کئی مرتبہ مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ اگر آج کی رات تم تھکے ہوئے نہ ہو اور بار خاطر بھی نہ تو میں تمہارے گھر چلنا چاہتا ہوں"۔
"سر آنکھوں پر"۔
خاموشی میں چلتے ہوئے ہیمپسٹیڈ کی شاہراہ کو پار کر کے ایک بڑی گلی می جس کے اردگرد اور چھوٹی موٹی گلیاں تھیں۔ ان گلیوں میں گھروں کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے۔ جگہ جگہ ہرے بھرے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ سڑک کے اردگرد کھیتوں میں جو ٹیوب لگے تھے ان کی بڑی ہلکی نیلی روشنی گھنے پیڑوں کے ہرے پتوں سے چھن کر فٹ پاتھ پر بکھری ہوئی جون نے خاموشی میں چلتے ہوئے روشنی میں چمکتے ہوئے ان پتوں اور روشنی کی لکیروں کو فٹ پاتھ پر دیکھا تو اسے ہنسی آگئی۔ اس کے بعد پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سارے انگلستان میں تم ایسا ہی ماحول پاؤ گے جہاں میں پلا' بڑھا اس شہر میں بھی ایسی ہی گلیاں ہیں۔ تمہاری طرح مجھے بھی ان گلیوں سے محبت ہے۔ ان تنگ پرانی گلیوں میں گھومتے ہوئے دل کو کیا کچھ نہیں ملتا"۔
"ہاں ہیمپٹسٹیڈ میں اسی وجہ سے رہ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"ہاں تم جیسے آدمی کو ایسے ہی ماحول میں رہنا چاہئے' کیا کراچی میں بھی ایسی ہی گلیاں ہیں؟"۔
"نہیں کراچی میں تو ایسی گلیاں نہیں۔ البتہ پشاور' لاہور' کوئٹہ (بلوچستان) اور سندھ کے دوسرے شہروں میں ایسی گلیاں تمہیں ضرور ملیں گی' خصوصاً" سندھ میں ان گلیوں سے گزر کر جب ریگستان میں آؤ تو دل کی عجیب حالت ہو جاتی ہے"۔
"ہاں اگر زندگی رہی تو پاکستان اور ہندوستان کی ان گلیوں کو ضرور دیکھوں گا۔ اس

کے بعد پاکستان کی وہ سڑک جو شاہراہ ریشم کہلاتی ہے اور سیدھی چین کو جاتی ہے اس پر پیدل ضرور چلوں گا"۔

"یہ سڑک تو اس صدی میں انسانی ہمت اور جستجو کی نہ مٹنے والی یادگار ہے۔ انسان جب اپنے عقیدے اور ہمت کے بل بوتے پر کچھ کرنے کا جتن کرتا ہے تو پہاڑ بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتے۔ اصل میں یہ مشرق کی ابھرتی ہوئی شخصیت کا ایک مکمل اظہار ہے"۔

"ضرور' میرے گھر کی طرح پاکستان کا دروازہ بھی تم جیسے صاحب دل کے لئے کھلا ہوا ہے"۔

"Keat کی گلی کو پار کر کے جب ہم ایک اور تنگ گلی میں داخل ہوئے تو میں نے ایک فرسودہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس عمارت کے ایک حصے میں میری کٹیا ہے۔" جون نے فاصلے سے اس عمارت پر ایک نظر ڈالی پھر اس کے قریب پہنچے تو عمارت کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے اس سے پھر کہا۔

"اس راستے سے مجھے اپنی کٹیا میں جانا پڑتا ہے۔" جون وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس عمارت کے احاطے میں جو ٹوٹی پھوٹی چیزیں بکھری پڑی ہوئی تھیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیا ذرا آگے بڑھا تو دو گندے ڈسٹ بن اوندھے پڑے ہوئے تھے اس کے قریب شراب کی خالی بوتلیں۔ اس سے ذرا فاصلے پر ٹوٹا ہوا فرنیچر' احاطے کے بائیں طرف برسات کی وجہ سے خودرو پودے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کچھ پودے پیڑ بنتے جا رہے تھے۔ چاند اب ہمارے سر پر تھا۔ چاندنی چھنک رہی تھی۔ اس روشنی نے میرے ماحول کی وحشت' گندگی اور بے ترتیبی کو اور نمایاں کردیا۔ ہم اوپر چڑھے۔ میں نے اپنی کٹیا کا دروازہ کھولا۔ جون نے میری کٹیا میں داخل ہونے سے پہلے میرے ماحول کا ایک بار پھر جائزہ لیا اس کے بعد سر اٹھا کر چاند کو دیکھا اور زور کا قہقہہ لگایا۔

"تمہیں تعجب ہو گا ہیمپسٹیڈ جیسے خوبصورت علاقے میں جہاں لوگ رہنے کا خواب دیکھا کرتے ہیں اس خوبصورت علاقے میں ایسی عمارت بھی ہے جہاں جنگلی پودے اور گھر کی ویرانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یقیناً میری اس مختصر کٹیا کی حیثیت اس علاقے میں کچھ ایسی

ہی ہے جیسے کسی شریف آدمی کے نفیس کپڑوں پر کیچڑ کا دھبہ پڑ گیا ہو۔ ان دنوں پھر ایک نفیس ماحول میں رہنے کی تمنا روح کی طرح میرے اندر سے پرواز کر چکی ہے پانچ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا کونسل کی لسٹ پر میرا نام ہے۔ کبھی کبھار کونسل سے کوئی خط آجاتا ہے جیسے وہ میری خیریت پوچھ رہے ہوں۔ کونسل کا آخری خط ملا اس میں صرف یہ لکھا تھا۔ ”تم لسٹ پر ہو لیکن اس علاقے میں تمہیں فلیٹ کب ملے گا یہ ہم نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم تنہا ہو“۔

جون اس مرتبہ تفصیل سے میری بات سن کر خاموش رہا۔ میری کٹیا میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں کتابیں دونوں کمروں میں اس طرح چنی ہوئی ہیں جیسے کسی تنگ اسٹور میں چیزوں کو ٹھونس دیا گیا ہو۔ دونوں کمروں سے متصل پاخانہ اور اگر غسل کی ضرورت ہو تو سرکاری غسل خانے میں جایا جائے البتہ وہ کمرہ جو قدرے تنگ تھا جس میں چولہا اور میرے کھانے پینے کا سامان رکھا ہوا تھا اس وقت بڑا ہولناک نظر آرہا تھا۔ جاڑوں کے زمانے میں اسی کمرے میں سوتا ہوں کیونکہ چولہے کی گرمی اس پر میرے مٹی کے تیل کا ہیٹر اس کمرے کو ہروقت گرم رکھتا ہے لیکن دوسراہ کمرہ دوستوں اور ملاقاتیوں کے لئے ہے جسے تھوڑا سا سجا دیا گیا ہے۔ میں خود اس کمرے میں بہت کم جاتا ہوں۔ بس باورچی خانے میں لکھنا پڑھنا اور وہیں بیٹھ کر ٹیلی ویژن پر کوئی اہم پروگرام دیکھ لینا۔ جون کو میں نے اسی سجے ہوئے کمرے میں بٹھایا۔ ملاقاتیوں کے اس کمرے میں دیواریں ننگی نہ تھیں بلکہ دیواروں پر قالین کے ٹکڑے' کچھ طغرے' چند میں قرآن کی آیات' مغرب کے چند بڑے مصوروں کی تصویریں۔ اپنے مزاج' ذوق اور عقیدے کے مطابق اس کمرے میں ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو مشرقی ماحول کی خصوصیت ہو۔ جون نے دیواروں پر لگے ہوئے قالین کے ٹکڑوں کو پسند کیا لیکن دیواروں پر جو زرد اور ہلکا سبز رنگ تھا جون نے اسے بالکل پسند نہ کیا۔ تھوڑی دیر وہ اس کمرے میں بیٹھا۔ میں نے کچھ پکانے کے لئے کہا اس نے اس وقت کھانے سے انکار کیا صرف کافی طلب کی۔ میں کافی بنانے اپنے باورچی خانے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد جون بھی اس کمرے میں آگیا اور یہاں کی ہر چیز اور بے ترتیبی کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نظریں باورچی خانے کے کونوں پر پڑیں تو بجلی کی روشنی میں وہاں مکڑی کے جالے چمک رہے تھے۔

جون بے تکلفی سے بستر پر ٹیک لگا کر شیلف میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنے لگا' کتابوں کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدلا' وہ اٹھا سب سے پہلے ٹالسٹائی کی سوانح عمری شیلف سے نکالی۔ اس کے بعد روسو کا اعتراف' تاریخ' فلسفہ' جدید مغربی آرٹ' اسلام اور مغرب' قرآن کا انگریزی میں ترجمہ' گیتا' بائبل' مارکس ازم اور انارکزم' ان کتابوں پر نظر ڈال کر وہ بستر پر کھڑا ہو گیا۔ ٹالسٹائی کی سوانح عمری کو بستر پر رکھ کر پھر اس نے ان کتابوں کو شیلف سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم نے یہ ساری کتابیں پڑھ لی ہیں؟''۔

''کتابیں' یہ میری زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ ان میں سے کافی پڑھ چکا ہوں۔ بعض کو مستقبل کے لئے رکھ چھوڑا ہے لیکن اصل چیز جو مجھے ان کتابوں سے یہاں ملتی ہے وہ خیالات کے علاوہ ان کی قربت کا احساس ہے۔ کتابوں کے درمیان رہنے سے کچھ ایسی ہی آسودگی ملتی ہے۔ رہا مطالعہ تو وہ زندگی بھر کا مشغلہ ہے''۔

''کاش! ایسا صبر اور سکون مجھے بھی مل جائے''۔

''وہ تمہیں ایک دن ضرور ملیں گے کیونکہ ان کی تمہیں تلاش ہے لیکن مجھے یہ تو بتاؤ مجھ میں اور میرے ماحول میں ایک تضاد محسوس ہوا؟''۔

''ہاں۔'' جون نے ہلکا سا سانس لے کر جواب دیا۔

''لیکن کیا کروں یہ ماحول میرے لئے ایک دلدل بن گیا ہے۔ سترہ برس سے اس دلدل سے نکلنے کی برابر کوشش کر رہا ہوں لیکن اس دلدل سے نکلنے کے لئے جتنے ہاتھ پیر مارتا ہوں اتنا ہی اس میں اور دھنس جاتا ہوں''۔

جون اس مرتبہ بھی میری بات سن کر خاموش رہا۔ میں نے اسے خاموش دیکھ کر پھر مخاطب کیا۔

''لیکن یہاں رہ کر میں ذہنی اور جذباتی اعتبار سے کبھی دکھی نہیں ہوا کیونکہ یہ بستی مجھے بڑی پسند ہے۔ دکھ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ملاقاتی یا دوست اسے دیکھ کر سن پڑ جاتا ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری معاشرتی حیثیت کیا ہے؟ لیکن یہ دکھ صرف اس وقت تک مجھے پریشان کرتا ہے جب تک وہ میرے گھر میں ہوتا ہے۔ اصل میں میرے گھر کی حیثیت بھی میرے خیالات اور ذوق کی صورت اختیار کر چکی ہے جو ہر

ایک کی سمجھ میں جلدی سے نہیں آتے لیکن مجھے رہنا ہے کچھ کرنے کے لئے۔ لوگ مجھے کہیں بھی جگہ دیں میں وہاں رہ لوں گا اور جو کام میرے ذمے ہے اسے ضرور کروں گا کیونکہ وہی اہم چیز ہے"۔

"نہیں' اس ماحول میں رہ کر تم اپنی کئی خصوصیات سے محروم ہو چکے ہو۔ یہاں رہتے ہوئے تمہیں اس کا کوئی احساس نہیں' دوسرا ہی اسے محسوس کرسکتا ہے"۔

"اچھا تمہاری نظر سے میں خود کو دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ شکریہ!"۔

جون کو میرے بعد میری کتابوں سے بڑی دلچسپی تھی لیکن ان پر تو اس نے منوں دھول دیکھی تھی۔ جو کتابیں اس نے شیلف سے نکال کر بستر پر رکھ کر ان کی ورق گردانی کی تھی ان پر سے دھول جھاڑ کر اس نے پھر شیلف میں وہیں لگادیں جہاں سے اس نے یہ کتابیں نکالی تھیں۔ کیتلی میں پانی دیر سے کھول رہا تھا' باتوں میں اس کا خیال نہ رہا۔ کیتلی پر جب میری نظر پڑی تو شرمندگی اور گھبراہٹ کے ملے جلے انداز میں جلدی سے دو پیالے نکالے' ان میں کافی ڈال کر کیتلی سے کھولتا ہوا پانی ڈال کر جب دودھ کی بوتل اٹھائی تو جون نے کہا۔

"شکریہ! مجھے کافی میں دودھ اور شکر کی ضرورت نہیں"۔

"معاف کرنا باتوں میں ہم بہت دور نکل گئے مجھے تمہاری کافی کا خیال نہ رہا"۔

"کوئی بات نہیں' کافی سے زیادہ تمہارے خیالات دلچسپ ہیں"۔

"شکریہ۔" مسکراتے ہوئے' میں نے اسے کافی دی اس نے کافی کا پیالہ لے کر پھر شکریہ ادا کیا اور میرے ساتھ مسکرانے لگا۔

"کافی ٹھنڈی تو نہیں؟"۔

"بالکل نہیں' تم نے بہت اچھی کافی بنائی ہے"۔

"اوہ جون میری ہر چیز کی تم تعریف کرتے ہو' تم ضرورت سے زیادہ بامروت ہو۔"

جون نے اس وقت میری اس بات کا تو کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا اور آنکھوں میں ہلکی آنچ کی طرح سوچ۔ کافی کا گھونٹ لے کر جون پھر کہا۔

"تمہیں چیزوں کی نہیں بلکہ جگہ کی ضرورت ہے جس کتاب کی تمہیں ضرورت نہیں اسے بیچ دو"۔

"نہیں میں کتابیں بیچنے کا قائل نہیں"۔

"تو پھر ایسا کرو جن کتابوں کی تمہیں فی الحال ضرورت نہ ہو انہیں ایک بکس میں بند کر کے رکھ دو تاکہ تمہارے دونوں کمروں میں روشنی اور ہوا آسانی سے آسکے"۔

"میں کتابوں کو بھی ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا کیونکہ مجھے ان کی ہر وقت ضرورت رہا کرتی ہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہے کہ میری فلاں کتاب کہاں ہے"۔

جون نے پھر خاموشی اختیار کرلی اور کمرے کی دوسری بے ترتیب چیزوں کو دیکھ کر پھر سوچتا رہا۔

"اس کٹیا کو رہنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے' میں اس معاملے میں تمہاری مدد کروں گا لیکن آہستہ آہستہ' اور کیا خیال ہے اس کام کی ابتداء ابھی سے شروع کردی جائے' تمہیں جاگتے ہوئے کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" کافی کا کپ ٹیبل پر رکھ کر سوچنے کے بعد جون نے مجھے پھر مخاطب کیا۔

"جون! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے تمہاری انسانی صحبت میں ایک قسم کا اخلاقی شعور ملتا ہے"۔

"اچھا تو پہلے تمہارے ملاقاتیوں کے کمرے پر توجہ کرنا چاہئے"۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" جون نے میرا جواب سن کر دیواروں پر جو تصویریں لگی ہوئی تھیں انہیں اتارا' ان میں جو ذرا معمولی تصویریں تھیں انہیں الگ رکھا اور کہا یہ تصویریں تمہارے شایان شان نہیں' یہ معمولی آرٹسٹوں نے بنائی ہیں البتہ یہ طغرے' یہ عربی تحریریں' قالین تمہاری مشرقی شخصیت کے حصے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کی اس بات پر مجھے چھوٹا سا قالین یاد آیا جو میں نے دمشق کے سوق حمیدہ سے خریدا تھا۔ اس خوبصورت چھوٹے سے قالین کو دیکھ کر جون بہت خوش ہوا۔ دیواروں پر مختلف جگہ ٹانگ کر دیکھا کہ وہ کہاں اچھا لگتا ہے۔ ان دیواروں میں اسے صرف ایک دیوار اس قالین کے لئے موزوں نظر آئی جو کھڑکی کے مقابل تھی' پھر دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ بھی تو تھا۔

"جو چاہو تم کرو میں دخل دینا نہیں چاہتا' یہ تمہارا گھر ہے۔" میں نے اسے پھر جواب دیا۔

اس نے دمشق کا قالین کھڑکی کے سامنے والی دیوار پر لگایا پھر بجلی کی روشنی میں اسے

دیکھا۔

"ہاں یہ قالین یہاں ٹنگا ہوا بڑا اچھا لگے گا۔" اس مرتبہ اس نے خود کو مخاطب کیا۔

دیوار پر قالین ایک ہاتھ سے تھاما دوسرے ہاتھ سے پن قالین اور دیوار میں پیوست کرنا چاہا' پن قالین کے بجائے اس کی انگلی میں پیوست ہوگئی۔ انگلی سے خون بہنے لگا' اس نے پن کو پھر اپنی انگلی سے نکال کر قالین اور دیوار میں پیوست کیا اور انگلی کے خون کو بہنے دیا۔ جب پن دیوار میں پیوست ہوگئی تو پھر کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ انگلی کو اپنے منہ میں رکھ کر اپنا بہتا خون بچوں کی طرح چوسنے لگا۔ اس کے خون کو دیکھ کر میں ذرا پریشان ہوا' اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے موڈ کو دیکھ کر میں خاموش ہوگیا۔

دیوار پر لگی ہوئی دو تصویریں اس کی نظر میں پھر کھٹکیں انہیں ان کی جگہ سے ہٹاکر انہیں فرش پر رکھتے ہوئے بولا۔

"ان دو تصویروں سے بھی تمہارے ذوق اور کردار سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے"۔

"کرو جو تمہارا جی چاہے۔" جواب دے کر میری نظر پھر اس کی انگلی پر پڑی اس سے ابھی تک خون نکل رہا تھا۔

"جون میرے پاس مرہم ہے' تم اس پر لگالو۔" اس نے انگلی کو دیکھا اور پھر اپنے منہ میں رکھ لیا۔

"کیا خیال ہے اب کمرہ کیسا لگتا ہے۔" انگلی کو منہ سے نکال کر اس نے پھر پوچھا۔

"تمہارے ذوق پر مجھے پورا اعتماد ہے"۔

"مجھے اس کا احساس ہے لیکن جن چیزوں کی تمہیں ضرورت نہیں انہیں یہاں سے نکال کر پھینک دو"۔

"یہ مجھ سے نہ ہوسکے گا۔ ان چیزوں سے کچھ یادیں وابستہ ہیں"۔

"ان یادوں کو اپنے ذہن میں زندہ رکھو"۔

"ان یادوں کی زندگی کے لئے ان چیزوں کا رہنا ضروری ہے"۔

"میرے دوست! اس ماحول میں رہتے ہوئے تمہاری چند انسانی صفات کے ساتھ احساس جمال اور سلیقہ کا بھی تمہارے اندر خاتمہ ہوچکا ہے۔ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی

طرح تم نے ان چیزوں کو سہارا بنانے کی کوشش کی ہے۔ ارشد! ان تصرفات سے آزاد ہو کر خوابوں اور خیالوں کو تلاش کرو"۔

"لیکن مکان کی طرح تمہارے لباس اور طرز زندگی میں بھی تو کوئی حسن نہیں۔ پھٹی پرانی زین کی پتلون' پرانے پھٹے ہوئے جوتے' ہاتھ کے ناخن بڑھے' داڑھی اور سر کے بال الجھے ہوئے' جگہ کو تم اتنی اہمیت دیتے ہو اپنی شخصیت اور صحت کو کیوں نہیں؟" تم ابھی جوان ہو' صاحب علم' صاحب ذوق' صاحب دل' خود پر توجہ کیوں نہیں کرتے"۔

"میرا مغربی معاشرہ جس سمت چل پڑا ہے اسے روکنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔ اپنی سوسائٹی کے لئے میں مستقل احتجاج ہوں' مجھے اپنے معاشرہ کی تنظیم' طبقاتی تقسیم' اقتدار اور زبردستی سے وحشت ہوتی ہے"۔

اس کی انگلی سے خون بہنا بند ہو چکا تھا اس نے میرا جواب سن کر اپنی انگلی کو دیکھا اور میرے بستر پر لیٹ گیا۔ کافی اس نے ختم نہ کی تھی' وہ اب ٹھنڈی ہو چکی تھی' اسے دیکھ کر میں نے اس سے پھر پوچھا۔

"کافی ٹھنڈی ہو چکی ہے دوسری کافی بناؤں؟"۔

"کافی کو چھوڑو' باتیں کرو"۔

"جون تم اب تیس سے اوپر ہو' شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" میرا یہ سوال جون کے لئے غیر متوقع تھا۔ اسے سن کر وہ ذرا چونکا۔ اس کے بعد پھر زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"زندگی اور تجربوں نے مجھے کافی بالغ کر دیا ہے۔ اب مجھے عورت کی نہیں بلکہ موسیقی کی ضرورت ہے"۔

"جون! شراب نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ اس کی گرفت تم پر مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا اثر اب صرف تمہاری عقل اور حواس کو ہی متاثر نہیں کر رہا بلکہ یہ نشہ تمہاری اخلاقی حس پر بھی غالب ہوتا جا رہا ہے"۔

"اچھا!"۔

اب نشے اور نیند میں جون کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میں اٹھا' کافی کے کپ ٹیبل سے اٹھا کر انہیں باورچی خانے میں لے گیا وہاں سے پھر کھانے کے لئے کیک لایا اسے

مخاطب کیا تو اسے زور کا جھونکا آیا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بستر سے اٹھ کر کہا۔

"دونوں کمروں میں ابھی بہت کچھ کام ہے اسے آہستہ آہستہ کروں گا' اب میں چلتا ہوں"۔

"تم تھک گئے ہو' یہیں کیوں نہیں سو جاتے؟"۔

"نہیں اب مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے"۔

"کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟"۔

"کیوں؟"۔

"نشے اور نیند میں خود کو سنبھالنا تمہارے لئے مشکل ہے۔" جون پھر ہنسا اور کہا۔

"میں جسمانی اعتبار سے بڑا مضبوط ہوں مجھ میں خود کو سنبھالنے کی پوری قدرت اور صلاحیت ہے تم میرے ساتھ نہ جاؤ' رات کا آخری پہر ہے' ہفتے کی رات تم میرے ساتھ مت آؤ۔ اسکن ہیڈ آج شراب پی کر ر نگداروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہیمپسٹیڈ میں کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ مجھے چھوڑ کر تم تنہا گھر واپس آؤ گے اور اس دوران اگر ان میں سے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ تمہیں ضرور نقصان پہنچائیں گے۔ رات میں ہیمپسٹیڈ کی گلیوں میں وہ گدوں کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں"۔

"لیکن میں تھوڑی دور تو تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں!"۔

"اچھا۔" جون نے جواب دیا' اسے پھر جھونکا آیا تو اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ میں نے دروزاہ بند کر کے تالا لگایا۔ اس کے ساتھ نیچے اتر کر گلی میں آیا تو جون پھر رک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اب تم جاؤ' تمہارے دونوں کمروں کو سنوارنے میں پھر آؤں گا"۔

"جیسے تمہاری مرضی"۔

دوسرے دن Hampstead Tea Room میں جون سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس نے بچوں کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ تمہارے ملاقاتیوں کے کمرے کے لئے ایک تصویر خریدی ہے۔ کسی دن تمہارے گھر آکر اسے دمشق کے قالین کے قریب لگاؤں گا"۔

"تمہاری آمد گھر میں باعث عزت ہی نہیں باعث راحت بھی ہے"۔

(لندن۔ ۱۹۷۳ء)

یونہی تو نہیں جینا

ایک ادبی تجربہ جس میں ہیئت سے زیادہ مواد پیش نظر رہا۔
اس احساس نے اس تخلیق کو کیا کچھ بنا دیا۔ قارئین کرام ہی اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں، بہرحال اس انداز میں مختلف تہذیبی مسائل پر گفتگو جاری رکھوں گا۔

---کردار---

۱۔ فہیم ۲۔ پرویز ۳۔ اسلم ملک

فہیم : ایک ۳۰ سال کا جذباتی نوجوان جس کی زندگی کا بڑا حصہ کیریئر بنانے کے لئے امتحانات کی تیاری میں گزرا ہے۔ کامیابی نے اس کے ولولوں کو مہمیز لگائی لندن میں بھی وہ اسی کامیابی سے ہمکنار ہوا اب اس کے پاس پیسے اور ڈگری دونوں ہیں لیکن اب وہ کچھ ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ راستہ بھول گیا ہو اب اس کے پاس نہ تو ولولے ہیں اور نہ تمنائیں۔ کہاں جائے کیسے رہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم۔ پاکستان اور مسلمانوں سے سخت نالاں ہے کیونکہ... ملک اسے اتنے پیسے نہیں دے سکتا جتنی اس کی خواہش ہے پاکستان سے اس کی جو ناراضگی وابستہ ہے وہ ایک آگ کی طرح بھڑک رہی ہے جو اس کے دین و

ایمان کی طرف بھی بڑھ رہی ہے اسے اب نہ صرف پاکستان کا تذکرہ ناگوار گزرتا ہے بلکہ اسلام اور اس کی تہذیب میں بھی اسے اب ہزار کیڑے نظر آنے لگے ہیں، لیکن جب مغربی تہذیب کی طرف دیکھتا ہے تو اجنبیت کا شدید احساس یہاں بھی معلوم ہوتا ہے۔

پرویز : فہیم کا کالج کا دوست بڑی مضبوط قوت ارادی کا مالک۔ عقاب کی سی چمکدار آنکھیں جو ہمیشہ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایک نگہبان کی طرح ہر چیز کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ وہ بھی لندن میں اسکالرشپ پر آیا اور یہاں حیاتیات پر تحقیق کر رہا ہے۔ اسلام سے محبت اور لوگوں کے لئے خلوص اس کے کردار کے امتیازی عناصر ہیں۔ بڑی تنظیمی صلاحیت کا مالک ہے اور لندن میں جو گروپ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اس کا سرگرم کارکن ہے۔ ان ہی تہذیبی سرگرمیوں کے وجہ سے اس کی اپنی ریسرچ میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ لیکن اپنی تہذیبی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ اس تاخیر پر سوچنا تک نہیں وقت نکال کر وہ برابر لوگوں سے ملتا رہتا ہے۔ تنظیم اور سیاست غیر شعوری طور پر اس کے پورے کردار پر گہرے رنگ کی طرح چھاگئی ہے جس کی وجہ سے اس کی اور دوسری انسانی صلاحیت کچھ ایسی ہو کر رہ گئیں ہیں جیسے سردی کے زمانے میں ننھے پودوں کو پالا مار جائے۔

اسلم ملک : ایک پستہ قد جوان، جس کے صحت مند چہرے پر اس کی چھوٹی چھوٹی ہاتھی کی سی اداس آنکھیں ہر وقت کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہتی ہیں وہ لندن میں تقریباً ۹ سال سے ہے۔ کام کے بعد وہ فوراً لڑکیوں کی تلاش میں ریستورانوں کے طواف کیا کرتا ہے اور جہاں اسے کوئی قبول صورت لڑکی نظر آجاتی ہے تو غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ سب سے پہلے اپنے ان مصنوعی بالوں پر پھیرنے لگتا ہے جو اس نے لڑکیوں سے اپنے گنجے پن کو چھپانے کے لئے ابھی ابھی لگوائے ہیں۔ آج کل وہ بیکار ہے۔ کیونکہ رنگ اور قومیت کی وجہ سے اسے حساب کتاب کی نوکری نہیں مل رہی ہے اس وجہ سے وہ لندن کی زندگی اور انگریزوں کا اور مخالف ہوگیا ہے اور کبھی کبھی جب موڈ ہوتا ہے تو اس بحث میں وہ دوسرے فریق کا ساتھ دیتا ہے جو مغربی تہذیب کا ناقد ہو۔ لیکن یہ بحث جب طول پکڑتی ہے تو پھر اسے وحشت ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو موضع تبدیل کرنے کے لئے نوجوان لڑکیوں کی ان ننگی ٹانگوں کی طرف ہنستے ہوئے مگر شہوت ناک انداز میں اشارہ کرتا

ہے۔ ماضی کو یاد کرنا نہیں چاہتا۔ مستقبل کی فکر نہیں۔ صرف حال کو دلچسپ اور تفریح آمیز بنانا چاہتا ہے۔

مقام ـــــــ لندن ـــــــ کا

ایک جدید طرز کا ریستوان جہاں ایک فرانسیسی موسیقار صوفے پر گٹار پر فرینچ گیت گا رہا ہے۔ اس کے آس پاس خوبصورت نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بیٹھے۔ کبھی کبھی قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں اور کبھی کبھی تالیاں بجاتے ہیں اور بعض غیر ملکی نوجوان لڑکیوں کی تلاش میں بیٹھے سگریٹ کے لمبے کش لگا رہے ہیں اور کوئی صحت مند اور جاذب نظر لڑکی ریستوان میں داخل ہوتی ہے تو ان کی بھوکی اور اداس آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ کھردری دیواروں پر ہلکا گلابی رنگ جن پر تجریدی آرٹ کی تصویریں آویزاں ہیں۔ اس موسیقی کے ساتھ ہلکی رنگ برنگی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے یہ تینوں کردار اس ماحول میں بیٹھے ہفتے کی رات کو محو گفتگو ہیں۔

فہیم۔ ''لو بھئی اسلام انگلستان میں بھی آگیا' ہم تو یہ سمجھے تھے جہاں جہالت' غریبی اور بیماری ہوتی ہے وہیں مذہب آتا ہے۔'' (جب ایک لڑکی اندر آتی ہے تو یکایک خاموش ہو کر اسے حسرت سے دیکھتا رہتا ہے اور وہ جائزہ لے کر ایک علیحدہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے تو وہ پھر ایسا سنجیدہ ہو جاتا ہے جس میں مایوسی کے ساتھ تھوڑا سا غصہ بھی شامل ہے)

پرویز۔ ''واہ بھئی بات پوری کرو خاموش کیوں ہوگئے آخر یہ جملہ تمہارے کس مقالے کا مقدمہ ہے؟'' جیسے.... اور اس کے بعد مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

فہیم۔ ''کوئی بات نہیں۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لینے لگتا ہے''۔

پرویز۔ ''کیوں' آج اتنے مکدر کیوں نظر آرہے ہیں''۔

پرویز کو ذرا تشویش ہوئی۔

فہیم۔ ''ارے بھئی ہفتوں سے تنہا تھا راستے میں ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی جنہیں میں پاکستان سے جانتا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہوگئے اس دوستانہ نگاہ کے ساتھ مجھے دیکھا کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے ایک طرح کا سکون محسوس کیا۔ لیکن جلدی میں

تھا اس لئے انہیں دوسرے دن کھانے پر مدعو کیا۔ اور سوچا کہ ان کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزر جائے گا دوسرے دن وہ صاحب تشریف لائے ان کے لئے بہترین قورمہ تیار کیا جب ہم دونوں کھانے بیٹھے تو لقمہ اٹھانے سے پیشتر پوچھنے لگے۔ کہ گوشت ذبیحہ کا ہے یا غیرذبیحہ کا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ کہ میں نے اسے ایک انگریز کی دکان سے خریدا ہے اور غالباً" غیرذبیحہ۔ تو صاحب اس بات کو سنتے ہی انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور کہا یہ حرام ہے اور میں اس کو کھانے سے معذور ہوں۔ پہلے تو ان کی بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ صاحب ذرا پڑھے لکھے نظر آرہے تھے میں نے سن کر دوبارہ کہا ارے صاحب میں بھول گیا انہوں نے پھر کہا نہیں تو مجھے ان پر بڑا غصہ آیا۔ لیکن اپنے گھر میں ان سے کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ میرے مہمان تھے میں نے خاموشی سے کھانے کی پلیٹیں میز پر سے ہٹالیں اور ان سے پوچھا تو فرمایئے میں کیا خدمت کروں کیونکہ اس وقت تو ذبیحہ کی دکان بند ہوگئی اور میرے پاس صرف ترکاری کے کچھ ٹن ہیں اور کچھ انڈے کہنے لگے کہ کھانے کو اتنی اہمیت دے رہے ہو بیٹھو کچھ باتیں کریں"۔

"لیکن یہ کھانے کا وقت تھا اور میں بھی کام سے آیا تھا بھوک سے جان نکل رہی تھی اور پھر یہ بھی کوئی اچھی بات نہ تھی کہ وہ اس طرح چلے جائیں اس لئے میں نے پھر انڈے اور ٹن کی سبزی پر اصرار کیا وہ تیار ہوگئے اور طبیعت پر جبر کرکے اس وقت ان کے ساتھ یہ بے مزہ کھانا کھانا پڑا"۔

پرویز۔ "لیکن تمہارے اس جذباتی فقرے بازی سے میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا کہ تم اپنے مہمان کا مذاق اڑانا چاہتے ہو یا ان اصولوں پر اعتراض کر رہے ہو جن پر وہ عمل پیرا ہیں۔" (پرویز ذرا سنجیدہ ہوگیا)

فہیم۔ "یار ان کا مذاق تو نہیں البتہ ان اصولوں پر مجھے اعتراض ہے جنہوں نے انہیں اس ملک میں ایک عجیب مخلوق بنا کر رکھ دیا ہے اس ملک میں تو ہمارا رنگ۔ رہن سہن ہی ایک مصیبت بنا ہوا ہے اب یہ ان میں مذہب کو اور داخل کرنا چاہتے ہیں آخر اتنی ساری عجیب چیزوں کے ساتھ اس ملک میں کیسے رہا جاسکتا ہے"۔

پرویز۔ "تو تمہارا خیال ہے کہ صرف کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے سے یا کتے پال لینے سے وہ مشکلات دور ہو جائیں گی جو تمہیں اس وقت اس ملک میں

درپیش ہیں؟"۔

فہیم۔ "بالکل۔ جیسا دیس ویسا بھیس اور پھر انگریزی میں ایک مثل بھی مشہور ہے۔"

WHEN IN FROME DO AS ROMANS DO

پرویز۔ "نہیں اس ملک کے رنگ پرست کچھ اور بھی مطالبہ کرتے ہیں"۔

فہیم۔ "وہ کیا؟"۔

پرویز۔ "اپنی عورتوں کو اسکرٹ پہناؤ ان کے ساتھ گھل مل کر رہو اور ان کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اپنی عورتوں کو ان کے دوستوں کے ساتھ شراب خانوں' ناچ گھروں اور دوسری سماجی تقریبات میں شامل ہونے دو اور ان کو وہی آزادی دو جو یہاں کے لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں برتتے ہیں"۔

فہیم۔ "آخر اسکرٹ پہننے میں کیا حرج ہے۔ اسکرٹ سے اسلام کو کیا خطرہ ہے؟"۔

اسلم ملک۔ "اسکرٹ نہیں۔ منی اسکرٹ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ اور اونچی ہو۔ آخر ان کے پاس حسن اور صحت ہے تبھی تو وہ اسے دکھا کر داد چاہتی ہیں"۔

اسلم ملک نے اپنی بات ختم کر کے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

پرویز۔ "داد نہیں...."۔

فہیم۔ چھوڑ یار تو موضوع نہ بدل میں ذرا سنجیدگی کے موڈ میں ہوں۔ (فہیم یہ کہہ کر مسکرانے لگتا ہے)

پرویز۔ "اللہ کی یہ بڑی نعمت ہے اگر تمہارے پاس ہے تو خدا کے لئے اس کی حفاظت کرو اور قوم اور فرد میں یہ زندگی کی علامت ہے اسی سنجیدگی کے دائرہ کو ذرا وسیع کرو اور دیکھو کہ اس ملک میں ہم کچھ لینے آئے ہیں' کھونے نہیں"۔

فہیم۔ "تو آپ کے خیال کے مطابق ان کے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں جو آپ کو پسند ہیں"۔

ذرا طنز کے ساتھ۔

پرویز۔ "بالکل مغرب کی پوری تہذیب اور اس کے انسانی تجربوں کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور پھر اسلام ہمیں تنگ نظری کب سکھاتا ہے اور پھر ہمارے نبیؐ کا یہ ارشاد کہ "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے اسے لے لو" اور آپ کو معلوم ہے کہ ہماری

پوری قومی تاریخ کو اس ارشاد کی رہنمائی میں ہمارے اسلاف نے کتنی ہی چیزیں اپنی تہذیب میں شامل کیں کیونکہ وہ خیر تھیں۔ اور مسلمان اس کا حقدار ہے۔ لیکن یاد رہے دوسری تہذیب کی ساری چیزوں کو غلاموں اور بچوں کی طرح قبول نہیں کیا بلکہ اپنے تہذیبی معیار پر پرکھ کر قبول کیا اور جو چیزیں اسلامی تہذیب کے منافی تھیں' انہیں جہالت قرار دے کر ان سے اجتناب کیا اور یہ رویہ صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ہر زندہ قوم اور زندہ فرد کا ہوتا ہے۔ ہمیں مغرب سے اپنی ضرورت کی کئی چیزیں لینی ہیں اور کچھ ہم لے کر برت بھی رہے ہیں لیکن اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت جدید Technology ہے۔ اور مغرب سے اس وقت سب سے پہلے اسے لینا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کی تہذیب میں کچھ اور بھی کام کی چیزیں ہیں۔ لیکن ان کی باری ہماری معاشرتی زندگی میں بعد میں آئے گی۔ لیکن ان کو بھی ہم بحیثیت ایک مسلمان کے لے لیں گے۔ ایک غلام اور گم کردہ راہ کی طرح نہیں''۔

فہیم۔ ''آپ بہت دور نکل گئے ہمیں تو یہ بتائیے کہ اسکرٹ پہننے اور ان کا طرز معاشرت اختیار کرنے میں ہماری مسلمانیت کو کیا خطرہ ہے''۔

پرویز۔ ''جی ہاں بڑا خطرہ ہے۔ ہم اپنی اجتماعی انفرادیت کھو دیں گے اور صرف بھاڑے کے مزدور بن کر رہ جائیں گے''۔

فہیم۔ ''یہ آپ کی خطرے کی گھنٹی وبال جان ہے آپ لوگ آزادی سے مسلمان کو کچھ تجربے نہیں کرنے دیتے بس اسے ہر وقت ڈرا دھمکا کر اپنے برسوں کے پرانے خول میں رکھنا چاہتے ہیں۔ آخر اس نئے زمانے میں اسے تجربوں سے خود کچھ کیوں نہیں سیکھنے دیتے۔ تاکہ اعتماد سے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ آپ دیکھتے نہیں یہ مذہبی خوف اور الگ تھلگ رہنے کا اہتمام جن قوموں میں پایا جاتا ہے وہ آج سب سے پیچھے اور بہت سے آپ کی طرح۔ یہ اطالوی' ہسپانوی اور پر تگیزی بھی ہیں یہ بھی اپنے کیتھولک مذہب کا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں۔ لیکن کتنے بھوکے اور پیچھے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آج جن قوموں کا مذہب ہے وہی پست غریب اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں''۔

اسلم ملک۔ ''تو تمہارا خیال یہ ہے کہ ان ترقی پسند ممالک میں بیماری اور بھوک نہیں؟ ارے یار ہماری بیشتر بیماریاں روٹی نہ ملنے کی وجہ سے ہیں اور یہاں کی بیماریاں

ضرورت سے زیادہ کھانے سے پیدا ہوئیں ہیں اور میرے خیال میں دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی سوسائٹی اور قوم نہیں جہاں مسائل اور بیماریاں نہ ہوں"۔

پرویز۔ "بھئی ملک بہت بہت شکریہ تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ لیکن تمہاری بات میں تھوڑا سا اضافہ اور چاہتا ہوں کہ آج جن قوموں کے پاس مذہب ہے اور مذہب کے ساتھ غریبی' جہالت اور بیماریاں' سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا یہ بیماری' جہالت اور غریبی جو اس قوم میں پائی جاتی ہے اس تعلیم کا نتیجہ ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ یا یہ اس کے اپنے کرتوتوں سے پیدا ہوئی ہے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے متعلق تو اس وقت میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ اس وقت ہماری بحث کا موضوع نہیں البتہ اسلام کے متعلق کچھ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں شاید آپ کو اب بھی یاد ہو کیونکہ بچپن میں یہ دعا آپ نے ضرور سنی ہوگی"۔

"اے میرے رب ہمیں اس دنیا میں بہترین سے نواز اور آخرت میں بھی بہترین (اجر) سے سرفراز فرمائیو!"۔

"اور شاید آپ کے کانوں میں یہ آواز بھی پہنچی ہو کہ جب ایک مسلمان معاشرے میں لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی دنیا بھی برباد اور آخرت بھی"۔

"میں اس مسئلے پر کچھ اور سوالات کرکے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اسلام کے کردار اور زندگی کے متعلق اس کے رویئے کو بخوبی سمجھ سکو"۔

۱۔ "کیا اسلام اس مادی زندگی کی نفی کرتا ہے؟"

۲۔ "اس کے نظام شریعت میں انسان کی دنیوی زندگی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا ہے یا ناپسندیدہ اور اپنے نظام میں انسانی زندگی کو ایک جسم کی طرح دیکھا ہے یا اس میں ثنویت (Dualism) کا قائل ہے"۔

فہیم۔ "جس نقطہ نظر سے تم اسلام اور اسلام پر عمل کرنے والوں کو دیکھ رہے ہو۔ جس سے وہ تمہیں سب بھوکے ننگے' بیمار' بدحال' کاہل اور تنگ نظر دکھائی دے رہے ہیں لیکن ذرا غور کرو کبھی تم نے اپنے نقطہ نظر پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ جس نے اسلام اور اس کے ماننے والوں کی شکل بگاڑ دی ہے۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تمہارا نقطہ نظر کسی اصول پر استوار نہیں بلکہ اس کی تعمیر بڑے بے ڈھنگے پن سے ہوئی ہے۔ اس کی

تعمیر میں کچھ تمہاری غیر شائستہ خواہش، کچھ زمانے کا فیشن، بعض چلتے ہوئے فقرے اور کچھ نعرے! یہ ہیں تمہارے نقطہ نظر کے عناصر ترکیبی۔ آخر تم خود سوچو تم دینی زندگی کے کیوں خلاف ہو؟ آخر اس کے نظام زندگی کی کونسی چیزیں ناپسند ہیں؟

اس کی بندشیں؟ یا اس کی مابعد الطبیعات سے اختلاف ہے یا اس کے دائرہ عمل میں تمہیں ہر طرف خشکی نظر آتی ہے کیونکہ وہاں تمہارے ننگی گوری پنڈلیوں کے دیدار کو صحت مند عمل قرار نہیں دیا گیا۔

غور کرو محض اس بنا پر تم اسلام کو رد کرو گے کہ اس میں بندشیں ہیں۔ تو بتاؤ اجتماعی زندگی کے لئے اس دنیا کا کونسا فلسفہ ہے جس میں انسانوں کے لئے کچھ بندشیں اور اصول نہیں اور پھر آج جس آزاد معاشرے میں تم رہ رہے ہو تم سمجھتے ہو کہ اس معاشرے کی تہذیب میں اصول اور بندشیں نہیں؟

اس دنیا میں ہر فلسفہ اور ہر معاشرہ ایک خاص قسم کا آدمی چاہتا ہے اور اس قسم کا آدمی بنانے کے لئے وہ معاشرہ فلسفہ، اصول، بندشیں اور ادارے بناتا ہے جو اس قسم کا آدمی بننے میں مدد کرے جو اس مخصوص تہذیب کو مقصود ہے اور یہی معاملہ اسلام کے ساتھ بھی ہے آخر بتاؤ اس بنا پر تم اسلام سے کیوں ناراض ہو کہ اس کے پاس کچھ بندشیں ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تہذیب کے لئے اصول نہایت ضروری ہیں۔ اب اس نقطہ نظر سے تم اسلام کے طرز حیات کا مطالعہ کرو۔

اسلام کے نزدیک یہ کائنات اور اس کی ہر چیز اللہ نے انسان کے لئے بنائی ہے مسلمان کی آخرت اس دنیا میں بنتی ہے اس دنیا میں یہاں کی چیزوں کو برتتے ہوئے اور لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے۔ لیکن یہ دنیا اسلام کے نزدیک ہولی ڈے کیمپ نہیں جہاں سوائے چیزوں اور لوگوں کے استعمال اور عیش کے علاوہ کوئی کام نہیں بلکہ اس دنیا میں رہتے ہوئے۔ اس کے لئے ایک مشن بھی ہے۔ نیکی پھیلاؤ اور بدی کو روکو (امربالمعروف ونہی عن المنکر) یہ عمل اجتماعی زندگی میں مسلمان کو ہمیشہ متحرک رکھتا ہے جس سے معاشرے میں بڑے بڑے انقلاب بھی آتے رہتے ہیں۔

جس عمل کی میں اس وقت بات کر رہا ہوں یہ اسلام میں کوئی باہر کی چیز نہیں جسے ہم نے آج اپنے زمانے سے فیشن کی طرح سے لیا ہے۔ بلکہ یہ اسلام کی اپنی تاریخ کا ایک

اہم جزو ہے۔ اس انسانی تاریخ میں مختلف قوموں اور زمانوں میں اللہ کے رسولؐ اسی متحرک اصول کی وجہ سے انقلاب لائے اور نیکی کو ایک فیصلہ کن سماجی طاقت بنا دیا اور پھر حضور اکرمؐ کے بعد ہماری حالیہ ملی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں بڑی بڑی تاریخی تبدیلیوں کا سبب بنا ہے جس سے ہمارا معاشرہ ہی نہیں بلکہ دوسرے معاشرے بھی متاثر ہوتے ہیں اس مختصر سی گفتگو میں تفصیلات میں جانا میرے لئے ممکن نہیں اگر آپ کو مطالعہ کا شوق ہے تو اس نقطہ نظر سے انسانی تاریخ اور خصوصاً" حضور اکرمؐ کے بعد کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ آپ ذرا ان یادداشتوں کو جوڑنا شروع کیجئے۔ آخر دنیا اور آخرت کے متعلق کیا تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے۔ ہمارے زمانے کے مسلمانوں میں جو غریبی، پستی اور دوسری جسم اور ذہن کی بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ وہ ان کی اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر موجودہ مسلمانوں کی مفلسی اور پستی کو اسلامی تعلیمات کا اثر قرار دیا جائیے تو پھر گزرے ہوئے زمانے کے مسلمان جنھوں نے تاریخ سازی کا کام کیا ہے ان میں یہ بیماریاں کیوں نہیں تھیں حالانکہ دینی بیداری ہم سے کہیں زیادہ ان میں تھی۔ ابھی ابھی جس آزادی کا مطالبہ آپ نے کیا ہے اس مطالبہ میں نہ صرف آپ کا بلکہ ہماری پوری نسل کا رویہ پوشیدہ ہے۔ آپ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ گوارا نہیں کرتے۔ یہ رکاوٹ چاہے قانون کی صورت میں ہو چاہے مذہب کی صورت میں لیکن اس آزادی کی پشت پر کوئی اعلیٰ انسانی نصب العین نہیں۔

"وہ ساری خواہشیں جس میں پروپیگنڈے اور اشتہارات کی پیدا کردہ مصنوعی خواہشیں جن میں سے بہت سی خواہشات کا ان کی شخصیت سے کوئی جوڑ نہیں۔ وہ انہیں پورا کرنا چاہتے ہیں جو نظام سرمایہ داری کی پیداوار ہیں۔ جو خود آج نوجوانوں کی اس آزادی کے شکنجے میں ہے لیکن ہمارے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی آزادی کا تصور تو اور بھی پست ہے۔ کیونکہ مغرب کے لوگوں کے تصور آزادی میں کم سے کم اظہار ذات کا تصور تو ملتا ہے۔ لیکن ہماری پست آزادی عیش اڑانے سے آگے نہیں بڑھتی۔ ہم اپنے عیش کے لئے دولت چاہتے ہیں اور یہ دولت ہمیں چاہے کسی طرح ملے، جائز اور ناجائز طریقے سے۔ ہنر، ڈگری ان سارے ذرائع سے ہم صرف دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

لیکن بتائیے اس کام میں آپ اسلام کو کیوں درمیان میں لاتے ہیں کیونکہ اس وقت آپ کے نزدیک سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ زندہ رہا جائے۔ اور وہ بھی عیش کے لئے کہئے میرا اندازہ صحیح ہے؟"۔

فہیم۔ "ہاں زندہ رہنا سب سے بڑی حقیقت ہے آپ کے خیال سے اسلام کیا ہمارا پیٹ بھر دے گا؟"۔

پرویز۔ "اسلام ہی نہیں دنیا کا کوئی فلسفہ اور طرز حیات جادو کے ذریعے زندہ نہیں رکھ سکتا بلکہ زندگی کے وہ کچھ اصول مرتب کرتا ہے جس کے تحت اس دنیا میں آپ برسرپیکار ہیں اور اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کریں"۔

"لیکن آپ کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ آپ ہر قدم اپنی مرضی اور خواہش سے اٹھاتے ہیں۔ اور بعد میں بے چارے اسلام سے اس کی تصدیق چاہتے ہیں۔ بنیادی طور پر آپ اسلام کی تقلید کرنا نہیں چاہتے بلکہ اسلام کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ آپ کے خیال سے یہ رویہ زندگی میں کوئی ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے؟ کہ زندگی کا آغاز پہلے تو اصولوں کے بجائے من کی موج۔ تمناؤں اور ولولوں کے زیر اثر کیا جائے اور بعد میں سجاوٹ کے لئے دین اور اس کے اصولوں کو استعمال کیا جائے"۔

گفتگو ختم ہو جاتی ہے اور اس سکوت میں فہیم ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ ذہنی طور پر تنہا ہو گیا ہے اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ' بیچارگی' لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک رونما ہوئی۔ پرویز کی اس پر نظر پڑی تو اس نے موضوع تبدیل کر دیا تھوڑی دیر بعد فرنچ موسیقار نے گٹار پر ایک رومانی گیت شروع کیا۔

بعض اوقات تمہارے گھر کی طرف سے جو ہوائیں آتی ہیں
تو میں اپنے دل کو کچھ بھاری سا محسوس کرتا ہوں
اور مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے
تمہیں جانے بغیر' تمہاری مسکراہٹ کی روشنی
اور میری بزدلی...

پرویز بیٹھے بیٹھے وہاں کچھ گھٹن محسوس کرتا ہے لیکن ریستوان سے جانے کی یوں اجازت نہیں چاہتا اس طرح سے چلے جانے سے اس پر مولویت کی پھبتی کسی جائے گی

جب گیت ختم ہوگیا تو پرویز نے اس سے جانے کی اجازت چاہی پھر اس نے گھڑی کو دیکھا گیارہ کا عمل تھا وہ کھڑا ہوگیا اس کے دونوں ساتھیوں نے اس پر کچھ نہ کہا اور تینوں ریستورانوں سے نکل آئے (بل ادا کرکے) تینوں خاموشی میں بس کے اڈے پر آئے پرویز کو ٹیوب لینی تھی۔ اس لئے سلام کرکے اس نے اپنا راستہ لیا لیکن سارے راستے پرویز کو یہ احساس ملامت کرتا رہا کہ وہ باہر کے ماحول کا کتنا دباؤ محسوس کرتا ہے کہ وہ دین اور خدا سے محبت کرنے کے باوجود عام لوگوں میں جرات سے اس کا اظہار نہیں کرسکتا کیونکہ اب یہ فیشن کے خلاف ہے فیشن کا خیال آتے ہی اس میں ذرا سی جھنجھلاہٹ سی پیدا ہوئی اور اس نے سوچا کہ کیا دین و ایمان بھی فیشن کی طرح لیا جائے۔ فیشن تو دوسروں کو دکھانے کے لئے ہوتا ہے دوسروں کی دیکھا دیکھی ہوتا ہے۔ دین و ایمان کا تو یہ معاملہ نہیں۔

یہ تو خالص انفرادی معاملہ ہے۔

ذرا ٹھہر جاؤ

لندن یورپ کی جنتوں میں سے ایک دلچسپ جنت ہے یہاں میں ۱۸ سال سے رہ رہا ہوں۔ اس جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہاں عبادت اور ریاضت اور دعاؤں کی کسے فرصت ہوتی ہے کیونکہ یہاں ساری ہی چیزیں انسانی کوشش و کاوش سے حاصل کی جاسکتی ہیں میں یہاں بڑی آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آیا تھا۔ ان آرزوؤں اور تمناؤں نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت اور حالات بھی میرے مددگار رہے۔ میں جب بچوں کے سرکاری اسکول میں جغرافیہ کا ٹیچر مقرر ہوا تو اس کے طفیل ایک مکان خریدا اس کے لئے اچھا کرایہ دینے والا ایک عرب طالب علم ملا پھر کار آئی' بینک بیلنس پھلدار پیڑ کی طرح بڑھنے لگا۔ جب ان چیزوں سے فراغت اور حیثیت پائی تو پھر ان کی وجہ سے ایک مذہبی انجمن خدام ملت کی صدارت ملی پھر داڑھی رکھنے کا بھی اہتمام کرنا پڑا کیونکہ یہ موجودہ حیثیت کا مطالبہ تھا۔ اس مذہبی انجمن کی صدارت کی وجہ سے اپنی ذات میں تھوڑا سا اعتماد پیدا ہوا (لیکن ایمان کی بات کہہ دوں) اعتماد سے کہیں زیادہ غرور اور تمکنت۔ ہر وقت یہی سوار رہتا یا یوں سمجھئے جی چاہتا کہ لوگ میرے سامنے جھکیں۔ جن کو مجھ سے غرض ہے وہ میری خوشامد کریں۔ جلسوں میں قرآن مجید کی آیات کی تلاوت ہوتی' ابتداء میں ان آیات کے مفہوم پر توجہ رہی جس سے

قلب و ذہن پر اثر ہوتا ـــــ لیکن جب ان مقدس آیات کی تلاوت جلسے کا ایک معمول بن گئی تو ان کے مفہوم کی خوشبو میری توجہ سے محروم ہو کر معدوم ہونے لگی۔ تھوڑے عرصہ بعد تلاوت کی صرف آواز رہ گئی جو ایک کان سے میرے اندر داخل ہوتی اور دوسرے کان سے نکل جاتی اور میرا قلب و ذہن دوسری دلچسپیوں میں ڈوب جاتا۔

اپنے چہرے پر داڑھی مجھے اچھی لگی۔ پھر اپنے پیشے اور انجمن کی صدارت کی عطا کی ہوئی عزت و بزرگی کے ساتھ ساتھ قریبی جاننے والوں نے بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اس کی وجہ سے اسکول کے اسٹاف میں بھی میں غیر مقبول نہ ہوا البتہ میری ہم وطن عورتوں نے اس داڑھی پر ضرور ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن میں نے ان کی بالکل پرواہ نہ کی۔ کیونکہ ہماری عورتیں ابھی تک مغرب سے بہت مرعوب ہیں۔ یہاں جو فیشن چلتا ہے وہ ان کے لئے ایک ندرت بن جاتا ہے شاید انہیں معلوم نہیں کہ ان دنوں یورپ میں داڑھی رکھنا ایک دانشورانہ فیشن بن گیا ہے۔ مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں یورپ میں رہتے ہوئے یہاں کے چال چلن اور فیشن سے مرعوب نہیں ہوا جاتا۔ کیونکہ برابری یا ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جنون یہاں سب پر سوار رہتا ہے۔ داڑھی میں نے اس لئے رکھی کہ یہ میری معاشرتی ضرورت تھی اسے برقرار اس لئے رکھے ہوئے ہوں کہ یہ مجھے پسند ہے اور میری ذات کا ایک حصہ بن چکی ہے۔

جو چیزیں میرے پاس ہیں وہ یہاں بہت سے لوگوں کے پاس ہیں۔ یہاں کی دکانیں گھر، لوگوں کے پیٹ، ان کے دل و دماغ، عیش و عشرت کی چیزیں، خیالوں، آرزوؤں اور تمناؤں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں جگہ کا مسئلہ بڑا اہم ہے، چاہے وہ گھر میں ہو یا دل و دماغ میں۔ ضرورت سے زیادہ تصرفات سے جگہ کا حسن بگڑتا ہے۔ چیزوں کو گڈمڈ کرنے سے دل و دماغ پر بھی برا اثر پڑتا ہے زیادہ لذیذ کھانوں سے معدہ خراب ہوتا ہے مرد اور عورتیں موٹے بے ہنگم ہوتے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عیاشی میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں اس لئے انہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ چیزوں، خیالوں اور تمناؤں کو بدلتے رہیں۔ جو چیزیں اور تمنائیں پرانی ہو جائیں انہیں اپنے گھروں اور دل و دماغ سے خارج کر دیں خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے دوسری چیزیں خریدیں تاکہ کاروبار چلتا رہے، منافع بڑھتا رہے اور کارخانوں اور فیکٹریوں میں پیداوار بڑھتی رہے۔

معیار زندگی گھٹتے نہیں بلکہ پیداوار کے ساتھ برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صنعتی تہذیب کی روح ہے۔ یہی جدید آدمی ہے اس کا مطالبہ ہے۔ لیکن ان ساری چیزوں کو حاصل کر کے میں ایک مستقل بے چینی کا شکار ہو چکا ہوں۔ یہ بے چینی رات کی تنہائی میں مجھے بہت ستاتی ہے۔ جب میں اپنے وطن میں تھا تو مجھ میں اندھیرے میں ڈھونڈنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی ـــــ لیکن یہاں کے اندھیرے میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اور میں باورچی خانے کی بتی جلا دیتا ہوں' اس کی روشنی رسی کی طرح میرے سامنے سرکنے لگتی ہے۔ جیسے وہ میرے گلے کے قریب آرہی ہو۔ اس روشن رسی کو متحرک دیکھ کر میرے اندر ہر چیز ٹھہر جاتی ہے۔ سوائے خوف کے اس وقت میں کچھ محسوس نہیں کرتا۔ یہ خوف پھر ان چیزوں کو زندہ کر دیتا ہے جنہیں میں نے اپنے عیش و دبدبہ کے لئے حاصل کیا تھا یہ بھی روشن رسی کے ساتھ مل کر مجھے دبوچ لینے کے لئے آگے بڑھتی ہیں تو اس اندھیرے سے بھی میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں اور دوسرے کمرے' باورچی خانہ' غسل خانہ' سب کی بتیاں روشن کر دیتا ہوں تو اس روشنی میں میرے باہر کی رسی غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن باہر کی رسی کی آہٹ سے میرے اندر کی رسی جو جاگتی ہے وہ اس روشنی میں میرے اندر کسی چیز کا گلا دباتی رہتی ہے اس سے میں بڑی گھٹن محسوس کرتا ہوں اس وقت گھر سے نکل جاتا ہوں اور دیر تک سڑکیں ناپتا رہتا ہوں۔ اس حرکت سے میرا خوف بہل جاتا ہے تو پھر گھر میں آتا ہوں گھر کے اندھیرے کی اب مجھ میں تاب نہیں ہوتی۔ اس لئے پھر بتی جلا دیتا ہوں اس رات مجھے اس وقت نیند آتی ہے جب صبح کاذب کے ساتھ ٹھنڈی ہوا میرے رخساروں کو تھپتھپاتی ہے۔

عیش و دبدبے والی زندگی گزارتے ہوئے اس قسم کی بے چینی سے میرا اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ بعض مرتبہ یہ ۔بے چینی میرے اندر درد بن جاتی ہے تو ساری حسیں میرے اندر کند سی پڑ جاتی ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ لذت احساس سے بالکل محروم ہو جاتا ہوں۔ ان دنوں سوائے درد کے میں کسی چیز کو محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ آخر بغیر احساس لذت کے زندگی کیسے گزاری جا سکتی ہے۔ میں زندہ رہ کر کیا کروں اپنی کیفیت سے گھبرا کر کبھی کبھی میں خود کو مخاطب کر کے خود سے ہی یہ سوال کر لیتا ہوں۔ یہ سوال میری گھٹن کو کچھ کم کرتا ہے تو گہرے گہرے سانس لینے لگتا ہوں جیسے میں خود کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی

میں زندہ ہوں۔

اس بے چینی سے تنگ آکر میں نے کبھی ڈھکے چھپے عشق کے بارے میں سوچا۔ شاید کسی دلربا کے آنے سے اس اضطراب سے نجات مل جائے۔ اسکول میں اس ضرورت کے لئے بھی ایک ۳۷ برس کی اسکول ٹیچر مل گئی۔ اس عمر میں اسے بھی اپنے زمانے، اپنے لوگوں سے شکایت پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن تخیل میں ایسی ندرت کہاں جو ایسی تجربے کار ذہین عورت کو زیادہ دنوں تک مغالطوں میں رکھ سکے۔ میری بے چینی اور اجنبیت کا اسے بھی بڑی جلدی پتہ لگ گیا۔ اس لئے میرا پہلا عشق میری ہی وحشت کا شکار ہو کر رہ گیا۔ محنت کا عادی ضرور ہوں لیکن اس سے صرف چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لوگ نہیں! لوگوں کو حاصل کرنے کے لئے کچھ اور چاہئے عشق میں ناکامی کے بعد مجھے پھر اپنی بیوی یاد آئی۔ اسے لندن بلانے کے بارے میں سوچا۔ گھر والوں کو خط لکھا۔ اس خط کا سارے قریبی رشتہ داروں کو پتہ چلا۔ جوان بیٹی کو اپنی آنکھوں سے دور کر کے ہزاروں میل کیسے بھیجا جاسکتا ہے۔ مجھے لندن پیسے کمانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہاں سکونت اختیار کرنے کے لئے نہیں! یہ میری بیوی کے والدین کا رد عمل تھا۔ جس کا عزیزوں میں ذکر ہوا تو یہ بات اڑتی ہوئی میری بیوی کے چچا کے کانوں میں بھی پہنچی۔ میرے لندن آنے پر وہ پہلے ہی خار کھائے بیٹھے تھے۔ بغض نکالنے کے لئے انہوں نے طرح طرح کے وسوسوں کا نمک مرچ لگا کر ذکر کیا۔ جوان لڑکی کو اتنی دور بھیجنا مناسب نہیں۔ لوگ لندن کی ہوا سے بڑی جلدی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو لڑکی کہاں جائے گی۔ وہاں ساری زندگی اسے دولہا میاں کے رحم و کرم پر رہنا پڑے گا۔ یہ اندیشے میرے خسر کے دل کو لگے۔ انہوں نے مجھے جواب دیا کہ لڑکی لندن نہیں آئے گی۔ تم یہاں آنے کی کوشش کرو، تمہیں وہاں رہتے ہوئے اتنا زمانہ گزر چکا ہے ابھی تک جی نہیں بھرا؟ لیکن لندن سے واپس جانے کا مطلب تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو جنت سے کسی پاداش میں واپس کیا جائے۔ اس خط کا مجھ پر ان دنوں کچھ ایسا ہی رد عمل ہوا۔ میں نے پھر دوسرا خط اپنی بیوی کو لکھا اس خط کا مضمون ہی نہیں بلکہ لب و لہجہ بھی بڑا سخت تھا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ نہ آئیں تو میں یہاں دوسری شادی کی کوشش کروں گا۔ میری جوان بیوی سوتن کو کیسے گوارہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے فوراً" جواب دیا۔ میں آنے کے لئے ہر

وقت تیار ہوں تمہارے حکم سے میں کب باہر رہی ہوں اس خط کے ملتے ہی میں نے لندن سے انہیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ روانہ کیا۔

اس کے چچا اس ٹکٹ کی خبر سن کر حسد میں انگاروں پر لوٹنے لگے۔ سرکاری آفیسر ہوتے ہوئے ان مراعات سے نہ وہ خود فیض یاب ہوسکے تھے اور نہ ان کی اولاد! اس کے برخلاف ان کے غریب بھائی کی لڑکی کو لندن جانے کا موقع نصیب ہو رہا تھا۔ ٹکٹ آنے کے بعد وہ کیا کرسکتے تھے میری بیوی بھی لندن آنے کے لئے تیار تھی اور مجھے اس کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ وہ لندن آئی۔ پہلے تو یہاں آنا اسے خواب سا لگا اس کے بعد یہاں کی تنہائی نے اسے ستایا' اس کے بعد اسی سال وہ ماں بھی بنی۔ اللہ نے ایک خوبصورت بیٹا دیا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ لندن میں وہ میرے ساتھ صرف چند سال رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اس کے ایثار و محبت نے میرے اندر انسان سے محبت کرنے کی صلاحیت پیدا کردی تھی۔ اس کے جانے کے بعد یہ صلاحیت بھی میرے اندر سے رخصت ہوگئی۔

ان آسائشوں اور کامرانیوں کے بعد میں دنیا میں پھر تنہا رہ گیا۔ میرا اضطراب پھر پرانے درد کی طرح ابھر آیا۔ اس کے ساتھ معدے کی خرابی اور بدہضمی! میں ابھی تک لندن میں مرغن کھانوں کا عادی ہوں۔ انگریزی اور یورپی کھانے ابھی تک میرے منہ کو نہیں لگے۔ سب ابلے ہوئے گوشت اور ابلی ہوئی سبزی ترکاری کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ کبھی مجبوراً" انہیں کھا بھی لیتا ہوں تو طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ موسم لندن میں اکثر خراب رہتا ہے اس لئے نیند بہت کم آتی ہے۔ ساری رات بستر پر کروٹوں میں گزرتی ہے۔ یا یوں سمجھئے جب اس کیفیت کے ساتھ پرانی بے چینی بھی ساتھ ہو جاتی ہے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ الارم میرے بستر سے اٹھنے کے بعد بجتا ہے ضروریات سے فارغ ہوکر ہاتھ منہ دھو کر بغیر بھوک کے ناشتہ کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس کے بعد کار گیرج سے نکال کر اسکول بھاگتا ہوں۔

مستقل بے چینی کے ساتھ اس عجلت کا بھی عادی ہوتا جارہا ہوں۔ یہاں ہر چیز کی رفتار تیز ہے۔ اس تیزی کا ساتھ دینے کے لئے مجھے بھی تیز چلنا پڑتا ہے' یہ دوسری بات ہے کہ اس تیزی سے میرے اعصاب اور حواس پر کیا کچھ نہیں گزرتا۔ معمول کے کام

کے لئے وقت پر یا وقت سے پہلے میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتا ہوں۔ وقت دولت ہے' نہ وقت کو ضائع کیا جاسکتا ہے نہ دولت کو لیکن اب میرے بینک بیلنس کے بڑھنے کے ساتھ میری بے چینی کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں کبھی سر کے درد کے ساتھ دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کبھی یہ درد میرے جسم کے ہر حصے میں چیونٹیوں کی طرح رینگتا ہے۔ کبھی سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے' کبھی یہ بے چینی میرے اندر آواز بن جاتی ہے۔ اپنی اندر اس آواز کو سن کر میں گھبرا اٹھتا ہوں تو اپنے طبیب (ڈاکٹر) کے پاس جاتا ہوں۔

میری اس بے چینی اور طبیعت کی اس تبدیلی پر اسے بھی تشویش ہوتی ہے۔ میری ہر تکلیف کو وہ توجہ سے سنتا ہے۔ کبھی کبھی میرا معائنہ بھی کرلیتا ہے۔ اپنی ہر قسم کی تشخیص اور معائنہ کے بعد میرے جسم میں اسے کوئی بیماری نظر نہیں آتی' البتہ ہر وقت بکری کی طرح منہ چلانے سے میرا وزن ضرور بڑھ رہا ہے ڈاکٹر نے ہر وقت کے کھانے پر بھی تنبیہہ کی۔ لیکن میں کیا کروں' بے چینی کو بہلانے کے لئے مجھے کسی نہ کسی طرح کی حرکت کی ضرورت رہا کرتی ہے۔ انہیں حرکتوں میں سے کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کے لئے بکری کی طرح منہ چلانا بھی ایک حرکت ہے۔

ایک دن اس کی تنبیہہ کو نظرانداز کر کے میں نے اپنے ڈاکٹر سے سوال کیا۔ ''آخر میری بے چینی نے آواز کی صورت کیوں اختیار کرلی ہے؟''۔

''یہ آواز تمہارے اندر کس زبان میں ہوتی ہے کیا اسے سمجھنے کی تم نے کوشش کی؟ وہ تم سے کیا کہنا چاہتی ہے؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ اس وقت سوال سے نہیں بلکہ اس کی مسکراہٹ سے میں نے قدرے تکلیف محسوس کی۔ گھر آکر ڈاکٹر کے سوال پر میں نے سوچنا شروع کیا اپنے اندر اس آواز کا تعاقب میں نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ گھر میں پھر اندھیرا تھا۔ یہ بے چینی میرے اندر پھر گونجی سوائے افسوس اور خوف کے اس وقت مجھے اپنے اندر کچھ اور نہ ملا۔

دوسرے دن میں پھر اپنے ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس دن موسم بھی اچھا تھا اور ڈاکٹر کا موڈ بھی! اس نے ایک اچھا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔ ''بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں؟''۔

''یہ آواز اب مجھے بڑا پریشان کر رہی ہے''۔

"میرے خیال میں تم اسپتال میں جاکر نفسیاتی معالج سے ملو"۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں، آپ میرے معالج ہیں"۔

"ہاں آج ہی تم اسپتال چلے جاؤ۔ میں اسے خط لکھے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے خط لکھ کر ایک لفافہ میں بند کیا اور نفسیاتی معالج کا پتہ لکھ کر خط مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "دو ہفتہ کے بعد تم پھر مجھ سے ملنے آنا"۔

"بہت اچھا۔" خط لے کر میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ مطب سے نکل کر سیدھا اسپتال پہنچا، نفسیاتی معالج سے ملنے کی کوشش کی۔ Receptionist نے کارڈ پر تاریخ لکھ کر مجھے دی۔ تین دن کے بعد میں پھر اسپتال پہنچا۔

اسپتال کی نرس نے میرا نام پکارا۔ میں جلدی سے گھبرا کر اٹھا اس کے ساتھ ایک کمرے میں گیا اس کمرے کی ہر چیز سفید تھی۔ نرس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے اپنی پیشہ ورانہ تیز آنکھوں سے میرا جائزہ لیا۔ اس کے بعد شعوری مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر میرا جائزہ لیا اس کے بعد فائل میں ڈاکٹر کا لکھا ہوا خط پڑھ کر مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے"۔

"اندھیری رات میں اپنے اندر آواز سنتا ہوں۔ بدہضمی الگ، بعض اوقات بالکل نیند نہیں آتی"۔

"بیوی سے آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟ کیا ہر اعتبار سے وہ آپ کے معیار کے مطابق ہے؟"۔

"ڈاکٹر صاحب عرصہ ہوا لندن میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی موجودگی میں تو میں آدمی بنتا جارہا تھا"۔

"کبھی خودکشی کا خیال آیا؟"۔

"کئی مرتبہ، بڑے دلفریب انداز میں، لیکن خوف خدا نے خودکشی کے چارم (Charm) کو احساس جرم میں تبدیل کردیا۔ اور مجھے خیال آیا اگر اس طرح میں نے جان دیدی تو خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ خدا کو اس دنیا میں ناراض کرسکتا ہوں، آخرت میں نہیں! یہ احساس ہمیشہ میرے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ اس وجہ سے

خودکشی سے مجھے ہر وقت ڈر لگتا ہے"۔

"کبھی خود کو یا دوسروں کو دکھ دینے میں تمہیں مزا آتا ہے؟"۔

"دوسروں کو تو نہیں البتہ جب خود سے تنگ آجاتا ہوں تو خود کو اذیت دے کر مزا نہیں، سکون سا محسوس کرتا ہوں"۔

"زندگی میں کیا بننے کی تمنا تھی؟"۔

"وہ حالات اور عمر کے ساتھ بدلتی رہیں۔ سب سے پہلے لیڈر بننے کی تمنا' اس کے بعد آفیسر پھر فوج کا آفیسر' سب سے آخر میں تاجر' لیکن لندن اور یہاں کے حالات نے پرائمری اسکول کے جغرافیہ کا ٹیچر بنا کر رکھ دیا۔ اس کے طفیل ایک مکان' اس کے بعد کار اور اس کے ساتھ ایک مذہبی انجمن کا صدر!"۔

"لوگوں سے تمہارے تعلقات کیسے رہتے ہیں؟"۔

"میں اپنے اور لوگوں کے درمیان فاصلہ رکھنا پسند کرتا ہوں نہ ان کے قریب جاتا ہوں نہ انہیں اپنے قریب آنے دیتا ہوں"۔

"اپنے لوگوں کے درمیان یا سفید لوگوں کے درمیان؟"۔

"اپنے رنگدار لوگوں کو دیکھتے ہی میرے اندر شعلہ سا بھڑکتا ہے۔ انہیں دیکھنے یا ان سے ملنے میں کوفت محسوس کرتا ہوں بعض مرتبہ تو یہ کوفت وحشت بن جاتی ہے۔ میں کسی رنگدار آدمی کو چاہے وہ ہندو' مسلمان' عیسائی' کوئی بھی ہو اسے خود سے اونچا دیکھنا تو درکنار اسے اپنے برابر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ رنگدار آدمی کو کسی اہم مقام پر دیکھ کر جلن محسوس کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو یہ جلن میرے اندر رنگدار آدمی کو دیکھ کر کتے کی خاصیت بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک کتا دوسرے کو کھاتے دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ معلوم نہیں میرے اندر یہ خاصیت کیوں پیدا ہوئی؟ یہاں کے ماحول اور آب و ہوا کا اثر ہے یا صنعتی تہذیب کا پیدا کردہ انسانی رد عمل؟"۔

"لیکن تم تو اپنے لوگوں کی مذہبی انجمن کے صدر ہو۔ صدر ہو کر تم ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہو؟"۔

"ذرا ڈپلومیسی سے کام لے کر ان کی عقیدت۔ اطاعت اور خوشامد سے لطف لیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں کتنے لوگوں کا حاجت روا ہوں۔ کتنے لوگوں کی امیدوں کا مرکز

ہوں۔ لیکن ان میں سے کسی کو اپنے برابر دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا"۔
"مقامی سفید لوگوں سے تمہارے کیسے تعلقات ہیں؟"۔
"مقامی لوگوں سے تعلقات رکھنے کا خواہش مند ہوں۔ بلکہ بعض مرتبہ ضرورت پڑنے پر میں ان کی خوشامد پر بھی اتر آتا ہوں"۔
"عورت اور مرد دونوں کی؟"۔
"نہیں! سفید مردوں سے صرف معاشرتی تعلقات اور سفید عورتوں سے ذاتی تعلقات!"
نفسیاتی معالج کو اس جواب پر بے اختیار ہنسی آ گئی لیکن جب اسے اپنی حیثیت کا احساس ہوا تو خود کو سنبھال کر اس نے مجھے پھر مخاطب کیا۔
"سفید عورتوں سے تعلقات قائم کرنے میں کچھ کامیابی ہوئی؟"۔
"صرف تھوڑے عرصہ کے لئے۔ اس کے بعد کچھ معلوم کر کے اور کچھ محسوس کر کے وہ مجھ سے الگ ہو جاتی ہیں"۔
"اس علیحدگی اور بے تعلقی کی وجہ معلوم کرنی چاہی؟"۔
"ابھی تک نہیں! البتہ ڈاکٹر صاحب ایک بات ضرور ہے جسے ابتدا میں بتانا بھول گیا۔ اپنے اندر کسی چیز کے گم ہو جانے کا مجھے شدید احساس ہے۔ وہ گم شدہ چیز کیا ہے' یاد نہیں آتی--- البتہ وہ چیز جہاں رکھی رہتی تھی وہ جگہ اپنے اندر خالی خالی سی محسوس کرتا ہوں۔ ذرا سکون و طمانیت ملے تو اس گمشدہ چیز کو تلاش کروں"۔
"تو لندن میں تمہارے کسی کالے یا گورے آدمی سے ایسے تعلقات قائم نہیں ہوئے جسے دوستی قرار دیا جا سکے؟"۔
"تعلقات آدمی سے اس وقت قائم ہوتے ہیں جب دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور احترام کے جذبات کے ساتھ برابری کا بھی احساس ہو۔ اس انسانی رشتے کو قائم و دائم رکھنے کے لئے کوئی پائیدار چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہو۔ تیسری چیز وہ اعتماد ہے جو غالباً" انہی دو صفات کی موجودگی میں تجربے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ ویسے اسکول میں ایک اسکول ٹیچر سے میرے معاشرتی تعلقات ہیں۔ دبلا پتلا' شک اور ڈپلومیسی کا عادی' لوگوں سے خصوصاً" رنگدار لوگوں سے تعلقات قائم کرنے اور

رکھنے کا شوقین ' دل کا اچھا دوسروں کے کام آنا اس کا محبوب مشغلہ ہے پیسے خرچ کرنے میں اسے بڑا مزا آتا ہے ' خصوصاً" حسین لڑکیوں کے قہقہوں میں وہ زندگی محسوس کرتا ہے ان پر خرچ کرنے کے حوصلے اتنے ہوتے ہیں کہ قرض پر اتر آتا ہے دوسرے دن اس قرض کو اتار بھی دیتا ہے زیادہ دیر تک کسی کا زیر بار رہنا گوارہ نہیں کرتا۔ لیکن اس کے سنجیدہ اور مخلصانہ تعلقات ایک ترک مسلمان عورت سے ہیں۔ جو ترکی کے مسلمان معاشرے کو اجنبی سمجھ کر انگریزی سیکھنے لندن آئی۔ انگریزی سیکھنے کے لئے کپڑے سینے کی فیکٹری میں کام بھی کیا۔ تعلیم تو ختم ہوگئی لیکن اس کا یہ کام ابھی تک جاری ہے۔ مسٹر رچرڈ شادی کے تو قائل نہیں ' اس لئے اس مسلمان ترک عورت سے ان کے تعلقات اب محض افلاطونی ہوکر رہ گئے ہیں۔ وہ ترکی واپس جانا نہیں چاہتی ' اسے صرف مسٹر رچرڈ ' انگلش سوسائٹی کی خاموشی اور تنہائی بہت پسند ہے ' اور مسٹر رچرڈ موسیقی ' شراب ' کتابوں سے زیادہ اخبارات پڑھنے کے عادی ہیں۔ لیکن پالتو کتے کی طرح کسی بڑے مشہور مصنف کی کتاب اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ انگریزی کے متوسط طبقے سے ان کا تعلق ہے ' پبلک اسکول میں تعلیم بھی پائی ہے۔ لیکن اپنی قوم کی طبقاتی ذہنیت کے بڑے مخالف ہیں۔ انگریز ہونے پر فخر ' قوم پرستی اور طرف داری ضرورت کے مطابق! اسکول میں سب سے اچھے تعلقات خصوصاً" طلبہ سے ' کیونکہ بغیر امتیاز و تفریق کے سب کے کام آتے ہیں اس کے بدلے انہیں نیک نامی ' دوستی ملتی جس سے وہ بہت خوش ہوتے۔ اسکول کے بعد ان کا زیادہ تر وقت ترکی محبوبہ کے ساتھ گزرتا ' خصوصاً" فون پر اس تنہائی کی ماری ادھیڑ عمر بننے والی عورت کی لمبی گفتگو وہ سارے اجنبی رومانی خیالات کی دلدادہ پین لیڈی بن کر انگریزی سیکھ کر یورپ میں رہنے کی تمنا اس کے ساتھ اس کی پرانی نفسیاتی الجھن۔ خود کو آدھا یورپین سمجھنے کا خبط ' لندن کے ماحول میں پختہ ہوکر اس ترکی خاتون کی انفرادیت کے عناصر ترکیبی بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک دن مسٹر رچرڈ کو میں نے اپنے دین اسلام کے متعلق سید قطب کی ایک تصنیف کا انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لئے پیش کیا اس کا نام پڑھتے ہی وہ اسے چھونے سے ڈرنے لگے تو میں نے کہا۔ "آپ دنیا جہان کی خبریں اخبار میں پڑھتے ہیں ' یہ دنیا کی بہت بڑی آبادی کا دین ہے اس کے متعلق واقفیت حاصل کرنے میں آخر کیا حرج ہے؟"۔

"نہیں، نہیں، اگر مجھے مذہب ہی کا مطالعہ کرنا ہے تو عیسائیت کا مطالعہ کروں گا کیونکہ عیسائیت میرے مزاج اور روایات سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن خدا کو میرا ذہن ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہے"۔

"مسٹر رچرڈ! خدا تمہارے اندر ہے۔ اور تمہارے باہر بھی جب تم اس کی ضرورت محسوس کرو گے۔ اس کے ڈھونڈنے میں تمہیں کوئی دقت نہ ہوگی"۔

"اگر زندگی میں خدا کی تلاش کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اسلام کا خدا نہ ہوگا' عیسائیت کا خدا ہوگا"۔

"خدا صرف ایک ہے۔ ہر مذہب کا خدا الگ نہیں ہوتا"۔

میرا جواب سن کر مسٹر رچرڈ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جیسے اپنے اندر کے خاموش اندھیرے میں وہ کچھ تلاش کر رہے ہوں۔

"پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہاں کے سفید لوگوں سے تمہارے تعلقات ذاتی نہیں؟"۔

"ڈاکٹر صاحب! انسانی تعلقات کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ مجھے جس انسانی تعلق کی ضرورت ہے اس کا اتہ پتہ ان کے رویئے میں نہیں ملتا۔ میرے خیال میں مسٹر رچرڈ نے انسانی ہمدردی اور دوسرے پسندیدہ اخلاق کو اپنی ڈپلومیسی میں کچھ گڈمڈ سا کردیا ہے۔ ان کے رویئے میں ان کی حدیں صاف صاف نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ان کے کچھ ذاتی جذبے' احساس برتری اور دوسروں پر حکومت کرنے کی خواہش زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہیں ان جذبوں کی تسکین ان دنوں اپنے لوگوں میں انہیں ممکن نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے لوگوں میں اکثر و بیشتر میں فخر' گھمنڈ اور دوسروں پر حکومت کا جذبہ دباؤ کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ اپنے لوگوں میں ان جذبوں کی تسکین کے لئے انہیں سخت مقابلہ درپیش ہوگا۔ کامیابی وہاں اتنی ممکن نہیں جتنی رنگ دار لوگوں میں۔ یہاں سوائے ضرورت کے کوئی مقابلہ نہیں۔ جذبوں کی تسکین کے بعد اچھے تعلقات اور معاشرتی ربط!"۔

"یہ شک تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"۔

"یہ بھی مجھے یورپ میں ملا۔ ہر شخص مجھے یہاں یہی مشورہ دیتا ہے۔ کسی پر اعتبار نہ کرو' سوائے اپنی ذات اور اپنی جیب کے! ڈاکٹر صاحب یہ شک بھی اب میری بے چینی کا

مضبوط حصہ بن چکا ہے۔ مجھے کریدنے اور شک کرنے میں مزا ملتا ہے"۔

"اس مزے سے تمہیں کیا ملتا ہے؟"۔

"بالکل ایسی ہی تسکین جیسے کھجیلے کتے کو اپنے جسم کو کھجانے سے یا اپنی خارش زدہ انگلیوں کو کھجا کر سہلانے سے!"۔

"میرے خیال میں تمہارے خیالات کی نکاس کے لئے مختلف راستوں کی ضرورت ہے' زندگی میں مثبت قسم کی سرگرمیاں تلاش کرو۔ اس کے ساتھ اپنے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ رہنے کی کوشش کرو جن میں تم پلے بڑھے ہو۔ تم میں اور ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں"۔

"لیکن اپنے لوگوں کو دیکھتے ہی مجھ میں کتے کی خاصیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟"۔

"ابتدا میں کچھ بھی ہو' تمہاری اور ان کی ضرورتیں مل کر اس خاصیت کو ختم کردیں گی۔ جس مذہب کی روایات کے سائے میں تم پروان چڑھے ہو اس مذہب کے نزدیک انسانی فطرت خبیث نہیں۔ انسانی فطرت قومیت اور کلچر کے خانوں سے بدلتی نہیں صرف متاثر ہوتی ہے۔ انسان اللہ کی شبیہہ پر پیدا ہوا ہے وہ چاہے انگریز ہو' عرب یا ہندی' جرمن یا روسی' یہ سب پہلے انسان ہیں اور بعد میں کچھ اور!"۔

میری داستان سنتے ہوئے نفسیاتی معالج کے چہرے پر ایک قسم کی پیشہ ورانہ توجہ ابھر آئی۔ اس میں میری ذات سے کوئی دلچسپی نہ تھی سوائے میرے تجربوں اور مسائل کے! مجھے ذرا مایوسی ہوئی۔ اس نے کچھ گولیاں بھی دیں' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"کیا میں پھر حاضر ہوں؟" میں گولیاں لے کر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا اور نفسیاتی معالج سے پوچھا۔

"فی الحال نہیں! میں تمہارے ڈاکٹر کو خط لکھ رہا ہوں۔ اگر کسی قسم کی تکلیف ہو تو ان کے پاس جانا"۔

"بہت بہت شکریہ!" اس الوداعی شکریہ پر اس کے چہرے پر کچھ ذاتی قسم کی مسکراہٹ ابھری جو مجھے اچھی لگی۔

کمرے سے باہر آکر مجھے زور کا پیشاب لگا۔ ایک نرس قریب سے گزر رہی تھی اس سے استنجا خانہ معلوم کیا۔ اس نے دائیں رخ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جلدی

سے پیشاب کرتے ہوئے ساری گولیاں استنجا خانہ میں پھینک کر اس پر پیشاب کرنے لگا جب میرا معدہ خراب ہوتا ہے تو پیشاب خوب آتا ہے۔ اس وقت معدہ کے ساتھ کچھ ایسی ہی صورت تھی۔ پیشاب سے فارغ ہوکر اسپتال سے باہر نکلا' سڑک پر آیا' ٹھنڈی ہوا نے ذرا فرحت بخشی' ذرا آگے بڑھا تو ایک رنگ دار نوجوان میرا ہم وطن میری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھا' وہ مجھے دیکھ رہا تھا جب وہ قریب آیا تو اس نے مجھے نظرانداز کرکے دوسری طرف منہ کرکے کچھ اور دیکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت تازہ ہوا کے ساتھ ہتک کے تھپیڑے کو میں نے بری طرح محسوس کیا۔ اس ہتک کی وجہ سے مجھے اپنے ایمان' اپنے تصرفات' اپنی معاشرتی حیثیت کا بھی خیال نہ آیا۔ اس کا دباؤ میرے ذہن پر بھاری ہوگیا تھا چنانچہ اس کا ردعمل لازمی تھا۔ جب وہ قریب سے گزرا تو اسے نظرانداز کرتے ہوئے اس کے سامنے تھوک کر میں پھر اسی طرف دیکھنے لگا جس طرف وہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تھوک نے اس کی اکڑ میں اور تناؤ پیدا کردیا۔ میں نے اس کی پرواہ نہ کی' کیونکہ تھوکنے سے میری جلن کم ہوچکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راہ چلتے ہوئے مجھے ایک رنگدار بوڑھا نظر آیا وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے شفقت' پیار اور دوستی کا جذبہ تھا۔ وہ مجھ سے ذرا دور تھا--- لیکن اس فاصلے کے باوجود یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بوڑھا مجھ سے اپنی زبان میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اب میں غیراختیاری طور پر اپنے لوگوں کو نظرانداز کرنے کا عادی ہوچکا تھا۔ اس لئے اس کی شفقت کو محسوس کرنے کے باوجود میں نے اسے بھی نظرانداز کردیا' لیکن اس کی طرف سے منہ موڑ کر دوسری طرف نہ دیکھا' جب وہ بوڑھا ذرا آگے بڑھ گیا تو میں نے اسے پھر مڑ کر دیکھا تو وہ خود مجھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی دوستی اور شفقت کو نظرانداز کرنے سے اس کے چہرے پر کیسی شکایت آمیز مایوسی چھا چکی تھی' اس شکایت کے باوجود اس کی بوڑھی آنکھوں میں میرے لئے شفقت تھی اسے دیکھ کر مجھے خود پر بڑا غصہ آیا۔ غصہ کے ساتھ ملامت کا احساس بھی میرے اندر ابھرا تو میرا جی چاہا کہ اس کے قریب جاکر اپنی اس بدتمیزی کی معافی مانگوں۔ اس کی شفقت اور شرافت کا اعتراف کروں۔ اگر وہ مسلمان ہے تو سلام کروں۔ اس احساس کو لے کر جب میں اس کی طرف بڑھا تو وہ بس میں بیٹھ کر مشرق کی طرف روانہ ہوگیا اور

ملامت نے میرا گلا دبانا شروع کردیا' اور کھلی ہوا میں مجھے گھٹن محسوس ہونے لگی تو چلتے ہوئے میں پھر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

میرے اسکول میں ایک نئی ٹیچر آئیں۔ پورے چاند کی طرح پوری عورت۔ بے انتہا نسائیت کے ساتھ بے انتہا خصوصیت' آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے باتیں کرنا لیکن سر کے درد کی شکایت انہیں اکثر رہتی تھی۔ آنکھ کا درد بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا۔ میٹھی چیزیں کھانے کی بڑی شوقین تھیں' آدھی جرمن آدھی انگریز۔ اسکول کی تعلیم اور ٹیچر ٹریننگ کے زمانے میں اپنے ہم عمر نوجوانوں سے کچھ ہلکے پھلکے عشق کرچکی تھیں۔ لیکن وہ عورت جو ان کے اندر تھی وہ ہمیشہ انہیں پورے مرد کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی تھوڑے سے عرصہ کے بعد اب نوجوانوں کے بجائے ادھیڑ عمر کے آدمیوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی تھیں۔ ان کا نام کرسٹین (Christine) تھا۔ چہرے پر معصومیت ہمیشہ خاموشی کی طرح چھائی رہتی۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر آدمی بے انتہا رحم اور خلوص سے مغلوب ہو جاتا' لیکن نظر جب ان کے نہایت متناسب جسم اور اس کے زاویوں پر پڑتی تو آدمی میں برسوں کی پیاس کی طرح جنسی خواہش ابھر آتی۔ مس کرسٹین کے چلنے میں بڑا عجیب والہانہ پن تھا۔ ان کے جسم کا حسن اس کے وہ زاویئے تھے جو چلتے وقت ان کے لباس کے کپکپانے سے پانی میں لہروں کی طرح ابھرتے اگر کوئی دوستی اور دلچسپی کے ساتھ ان کی طرف پیش قدمی کرتا تو اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار لیتیں' اس کے علاوہ کچھ نہیں! مجھ سے بھی کچھ شناسائی سی پیدا ہوچکی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی معاشرتی مسکراہٹ میں تھوڑی سی اپنائیت پیدا ہو جاتی' مسکراتے ہوئے وہ مجھے کچھ عجیب انداز سے دیکھتیں اپنے متعلق اسکول کے ساتھیوں سے ان کی رائے بھی معلوم ہوئی کہ انہیں میرے داڑھی سے سجے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بڑی اچھی لگتی ہے۔ لیکن میری آنکھوں سے وہ ذرا تشویش میں پڑ جاتی ہیں۔ اس اطلاع کے بعد میں ہر روز بستر سے اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی آنکھوں کا جائزہ لیتا۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض مرتبہ مجھے خود اپنی آنکھوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ ان میں مردم بیزاری سمٹ کر کتنی ہولناک ہوچکی تھی' نگاہوں میں کتنی بے رحم تلوار کی سی دھار تھی' جو ہر چیز کو کاٹتی ہوئی چلی جائے' اس پر آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے۔ بعض مرتبہ صبح ہی صبح اپنی ان بے رحم آنکھوں میں اپنی محرومی اور خودغرضیوں

کو ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کی طرح تیرتے ہوئے محسوس کرتا تو آئینے میں اپنی آنکھوں کو دیکھنے میں مجھ میں تاب نہ رہتی۔ میں سر جھکا کر اپنی آنکھیں بند کرلیتا۔

ویسے میری آنکھیں چھوٹی چھوٹی سی ہیں۔ ان میں دل میں اتر جانے والی تیز نگاہیں سرچ لائٹ کی طرح چوکنا سی رہتی ہیں۔ لیکن میری مسکراہٹ انہیں اکثر چھپالیتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میری چپٹی ناک کے نتھنے مستقل بے چینی سے تپتے ہوئے' گھوڑے کے نتھنوں کی طرح دھواں نکالتے ہیں تو میں اپنے اندر کی آگ کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے اپنے باہر اپنے نتھنوں سے نکلتے ہوئے دھویں کو بھی محسوس کرتا ہوں۔ اپنی مستقل بے چینی اور آنکھوں کی ہولناکی کے احساس کے باوجود میں مس کرسٹین کو چاہت سے دیکھتا' اگر موقع ملتا تو تھوڑی سی باتیں بھی کرلیتا' جو مجھے اس وقت اچھا لگتا۔ مس کرسٹین جب کبھی مجھے دیکھتیں "ہیلو" ضرور کہتی لیکن (اس شکایت کے بعد جو اضطراری طور پر ان کے منہ سے دوستوں کے سامنے نکل گئی) وہ میرے ساتھ بیٹھ کر تبادلہ خیال نہیں کرتیں۔ مس کرسٹین کی اس سرد مہری کے احساس کی موجودگی میں اپنی آنکھوں کے علاوہ مجھے اپنے خیالات کی صحت پر بھی شبہ ہونے لگتا۔ اس روز جب مجھے مس کرسٹین کی رائے اپنے بارے میں معلوم ہوئی' میں اسکول سے سیدھا اپنے گھر آکر بستر پر پڑ گیا۔ اور مایوسی میرے اعصاب میں اس قدر سرایت کرگئی کہ میں تھکان سے چور چور ہوگیا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی کے بعد مس کرسٹین کی مجھ سے پھر ملاقات ہوئی تو ہمت کرکے میں نے ان سے بات چیت شروع کی' جب انہوں نے دلچسپی لی تو میں نے اسکول کے باہر کے ریستوان میں انہیں کافی کی دعوت دے دی۔ انہوں نے اسے بھی قبول کرلیا اور میں انہیں ریستوان میں لے گیا۔ اس دن موسم اچھا تھا۔ موسم کے ساتھ وہ بھی خوش تھیں' اچھے موسم اور دل کی خوشی کے ساتھ انہوں نے اچھا لباس پہن رکھا تھا۔ ریستوران میں مس کرسٹین کو مزید خوش کرنے کے لئے میں نے کافی کے ساتھ وہاں کے مشہور کیک کی بھی پیشکش کی۔ (دراصل اسکول سے باہر یہ ہماری پہلی ملاقات تھی) انہوں نے کیک کھانے سے معذرت کرتے ہوئے صرف کافی پر اکتفا کیا۔ ویٹرس آرڈر کے مطابق صرف دو کافی لائی اور ہمارے سامنے رکھ کر چلی گئی۔ کافی کو دیکھ کر کرسٹین نے

اپنے بیگ سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اسے میری طرف بڑھایا تو میں نے معذرت کرتے ہوئے انکار کیا۔ "آپ کی پیشکش کا بہت بہت شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" اس وقت سگریٹ لینے سے انکار کرتے ہوئے میں نے ذرا خفت سی محسوس کی کیونکہ ان کے اس التفات کی خاطر مجھے ان سے زیادہ سے زیادہ انسیت کی ضرورت تھی۔ اس انکار پر کرسٹین نے میرا ہلکا سا جائزہ لیا اور کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا اسکول میں میں نے آپ کو کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

اس مرتبہ ذرا میری ہمت بڑھی تو میں نے کہا۔ "جی مجھے سگریٹ پینے کا شوق نہیں"۔

"سوائے پڑھانے اور کھانے پینے کے' آپ کو کسی اور چیز کا شوق نہیں؟"۔

"کھانے پینے' پڑھانے کے علاوہ آپ سے ملنے کا بھی شوق ہے۔" میرے جواب پر کرسٹین کی باچھیں کھل گئیں۔ واقعی اس وقت اس برجستہ جملے نے Flirting کا حق ادا کردیا اس سے مجھے خوشی کے ساتھ اپنی ذات پر اعتماد بھی حاصل ہوا۔

"اسکول میں آپ کے دوسرے ہم وطن لوگ اور بھی ہیں کبھی میں نے آپ کو ان کے ساتھ نہیں دیکھا؟"۔

"لندن میں' میں ان سے ملنے نہیں آیا۔ میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ ان میں پلا بڑھا ہوں۔ ملنے کا شوق تو آپ سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے لوگ مجھے بور کرتے ہیں۔" کرسٹین نے میرا جواب سن کر کافی کا کپ اٹھایا' ایک چسکی لی خاموشی سے ریستوران کا جائزہ لیا۔ اس وقت یہاں اکثر میزیں خالی تھیں۔ صرف کونے میں ایک دھیڑ عمر کا انگریز اسکول ٹیچر تنہا بیٹھا اخبار پڑھنے کے ساتھ کافی پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیں بھی دیکھ لیتا۔ کرسٹین کی نظر جب ریستوران کا جائزہ لیتے ہوئے اس پر پڑی تو اس نے "ہیلو" کہا' کرسٹین نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔ وہ اپنا معاشرتی فرض ادا کرکے پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد کرسٹین کی نظریں مجھ پر آکر ٹھہر گئیں۔ کافی کی چسکی لے کر پھر مجھ سے سوال کیا۔

"لندن میں آپ کے بال بچے بھی ساتھ ہیں؟"۔

"صرف ایک لڑکا ہے"۔

"اور بیوی؟"۔

"وہ اللہ کو پیاری ہو گئی"۔

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" کرسٹین کی زبان سے افسوس کا لفظ ضرور نکلا۔ لیکن چہرے پر بالکل دوسرا رنگ، جس سے میرے دل نے بڑی رجائیت محسوس کی، پھر کچھ سوچ کر میں نے سوال کیا۔

"اور آپ؟"۔

"ہاں، میرے بھی ایک لڑکا ہے"۔

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" میرے سوال اور تعجب پر کرسٹین کو ہنسی آ گئی، اسی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پھر پوچھا۔

"کیا میں ماں نہیں لگتی؟"۔

"بالکل نہیں، آپ کی عمر ماں بننے کی کب ہے"۔

"اسی عمر میں تو بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں۔" کرسٹین نے اس پہلی ملاقات میں اس موضوع پر ذرا صاف صاف طریقہ سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا، مصلحت کی خاطر میں نے بھی اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ کریدا۔ اس لئے غلطیوں والی عمر کو معمہ کی طرح چھوڑ کر پھر اپنائیت کے تاثر کو پیدا کرنے کی خاطر اس کے لڑکے کے متعلق سوال کیا۔

"کیا آپ کا لڑکا آپ کے ساتھ رہتا ہے؟"۔

"نہیں، اسے ایک ایسی شادی شدہ عورت کو دے دیا ہے، جسے بچے کی شدید ضرورت تھی"۔

"کیا وہ آپ کو یاد نہیں آتا؟" یہ سوال بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ جس کا مجھے بڑا افسوس ہوا کیونکہ میرا یہ سوال تو براہ راست اس کی ذاتی زندگی میں ایسی مداخلت تھی جس کا دروازہ اس نے پہلے ہی بند کر دیا تھا۔ میرے اس سوال پر کرسٹین کی آنکھوں میں ماں کی آنکھوں کی طرح نرمی آگئی اور نظر بچا کر اس نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ جب مجھے فرصت ملتی ہے اسے دیکھنے ضرور جاتی ہوں"۔

اس جواب کے بعد کرسٹین پھر سنجیدہ ہو کر اداس پڑ گئی مجھے اپنی حماقت پھر ستانے لگی کہ میں نے یہ کیا کیا۔ عورت سے معاملہ کرنے کی مجھ میں بالکل صلاحیت نہیں۔ مرحوم بیوی بے چاری شریف اور وفادار تھی، اسے جب میرے پلے باندھ دیا گیا تو اس غریب کو

نباہ کے لئے خود ہی میں ترمیم کرنا پڑی۔ میں ویسا کا ویسا ہی رہا جیسا ماحول نے مجھے بنا دیا تھا' کافی پینے کے دوران تھوڑی سے خاموشی رہی۔ اپنی حماقت کے خوف کی وجہ سے اس خاموشی کو توڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ اس وقت سوائے خوف کے میرے ذہن میں کچھ اور نہ تھا۔ اداسی کے بعد خاموشی کرسٹین پر بار تھی۔ جب میرے منہ سے کچھ نہ نکلا تو اس نے میری کافی کی دعوت کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر جانے کے لئے کہا۔ مگر بدحواسی میں میں نے دوبارہ کافی کی دعوت دی۔

"نہیں' اب چلنا چاہئے' کافی دیر ہو چکی ہے"۔

"اس کا خیال نہ کیجئے۔ یہ ریستوران گاہکوں کے لئے ہی ہے آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے میرے ساتھ بیٹھنے کی زحمت گوارا کی۔ یقین مانئے یہ میری عزت افزائی ہے جس کے لئے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔" میرے اصرار اور وکٹوریہ کے عہد کے آداب و خوشامد پر وہ ذرا خوش ہوئی۔ اپنے بیگ کو پھر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن زیادہ دیر نہیں"۔

"بالکل نہیں۔" میں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر پھر کرسٹین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ویٹرس کو دو کافی کا آرڈر دیا اس وقت مجھے کرسٹین کی رضامندی کی طرح اس کی آنکھیں بھی اچھی لگیں۔ ان میں تھوڑا سا لحاظ تھا۔ ویٹرس اس مرتبہ کافی جلدی لے آئی اس نے پھر سگریٹ نکالا۔ اور سلگا کر اس کا کش لے کر کچھ سوچا اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بڑے دنوں سے میری خواہش ہے کہ تم سے دیانت داری سے بات چیت کروں' کیا اس دیانت داری اور بے تکلفی کی اجازت ہے؟"۔

"بڑی خوشی کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"تم اس ملک میں کیوں آئے؟ تم یہاں خوش ہو؟"۔

"کرسٹین! اگر میں یہاں خوش نہ ہوتا تو اتنے برس اس ملک میں کیسے گزارتا۔ میرا یہاں مکان ہے۔" اس مرتبہ میں نے ذرا تیزی سے جواب دیا جیسے میں اس تیز لب و لہجہ کو اختیار کر کے اپنی اس مستقل بے چینی کو چھپانا چاہتا ہوں۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ کینسر کی طرح میرے اندر طرح طرح کے روپ دھار رہی ہے۔ لیکن اس مرتبہ کرسٹین میرے لب و لہجہ کی تیزی سے بالکل متاثر نہ ہوئی۔ اس نے پھر میری آنکھوں کا

تعاقب کیا۔ اس کی آنکھوں کو مجرموں کی طرح میں نے دیکھا ان میں تلوار کی طرح تیز دھار والے کئی سوال تھے جو میری آنکھوں کو چیر کر میرے اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر نیچی کرلیں۔ کیونکہ انہوں نے ہی تو مجھے کرسٹین کے سامنے ننگا کرکے رکھ دیا تھا۔ اس وقت اس صوت میں' میں اس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

"نہیں' مسٹر راشدین یہاں کوئی خوش نہیں۔ مختلف کیفیتوں کو یہاں لوگوں نے خوشی کا نام دے رکھا ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنے دکھوں کو ناسور کی طرح چھپا کر یہی کہتا ہے' میں بہت خوش ہوں' میرے بہت سے دوست ہیں' اور اتنا مصروف رہتا ہوں کہ ان دکھوں سے ملنے کی فرصت نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہاں سب ہی مختلف قسم کی تنہائیوں میں مبتلا ہیں۔ مغربی آدمی نے اپنی جستجو اور مادی تحفظ کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ یہاں خوشی کا لوگوں کو سورج کی روشنی کی طرح انتظار رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ آتی ہے لیکن ان کے وسوسے اور عادتیں اسے پھر بادلوں کی طرح چھپا لیتے ہیں یہاں لوگوں کے دکھوں اور ذاتی ضرورتوں نے ان کے دل اتنے سخت کردیئے ہیں کہ دوسروں کے دکھوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت ان میں ختم ہوچکی ہے۔ یا یوں سمجھو ان سے چھین لی گئی ہے' کیونکہ اب یہ اس کے قابل نہ رہے یہاں اکثرو بیشتر کو اپنے مطلب سے مطلب رہتا ہے۔ دوسروں کے دکھوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے جب ان مصروف لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو یہ نہ اپنے دکھ دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں' نہ دوسروں کے دکھ سن کر اپنی صحبت کے مزے کو کرکرا کرتے ہیں۔ اس مختصر سی معاشرت میں اگر تھوڑا سا اشتراک مل جائے جسے وہ خوشی سمجھتے ہیں تو اسے غنیمت قرار دیتے ہیں"۔

"نہیں' نہیں۔ میرے ساتھ یہاں ایسی کوئی بات نہیں میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہاں میرا اپنا مکان ہے۔ مستقل ملازمت ہے' اس ملک کی شہریت' اس کے علاوہ لوگوں کی خدمت کے لئے ایک دیسی مذہبی انجمن کی صدارت۔ اللہ نے بہت کرم کیا ہے مجھ جیسے معمولی آدمی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے؟"۔

اس مرتبہ پھر میری بدحواسی میرے لب ولہجہ پر غالب آگئی (کرسٹین کے خیالات کی شہ پاکر) انہیں دبانے کی ناکام کوشش کی لیکن ناکام رہا"۔

"نہیں مسٹر راشدین۔ تم معمولی خواہشوں والے آدمی نہیں۔ اس مرتبہ کرسٹین

نے میری آنکھوں پر بالکل توجہ نہ دی بلکہ سڑک پر گزرتے ہوئے راہ گیروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ کے خیال میں میں کیا ہوں؟" کرسٹین سے اس مرتبہ میں نے کچھ اس انداز سے سوال کیا جیسے میں اس کے سامنے بالکل ننگا ہو چکا ہوں۔

"تم نہ خود سے دیانت دار ہو نہ دوسروں سے۔ ہمارے یہاں کے بہت سے لوگوں کی طرح تم لوگوں اور چیزوں کو استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہو۔ اس رویئے سے کہیں خوشی ملا کرتی ہے؟"۔

"معاف کیجئے! مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ میں یہاں بچوں کو محنت سے پڑھاتا ہوں۔ اس مصروفیت کے باوجود اپنے لوگوں کی خدمت کرتا ہوں' جس کی وجہ سے مذہبی انجمن کی صدارت کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی"۔

"نہیں یہ تو محنت اور خدمت تم صرف اپنے پست مفاد کی حفاظت کے لئے کرتے ہو۔ اس خدمت اور محنت کی ذریعہ نہ خدا کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو سکی ہے' نہ لوگوں کی محبت' لوگوں کی ضرورت سے تو تمہیں کبھی ہمدردی نہ رہی۔ لوگوں سے ملنے میں تمہیں وحشت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ہر اس آدمی سے وحشت ہوتی ہے جس کا تمہارے یہاں کوئی مصرف نہیں۔ آدمی سے ملتے وقت سب سے پہلے تم اس کا اندازہ لگاتے ہو کہ تمہارے یہاں اس کا کیا مصرف ہے"۔

"نہیں' کرسٹین تمہارا یہ تجزیہ صحیح نہیں"۔

"تو تمہاری آنکھیں تمہاری مسکراہٹ کا ساتھ کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے تمہاری مسکراہٹ بہت پسند ہے"۔

"یہ میرے اختیار میں کب ہے؟"۔

"نہیں مسٹر راشدین' یہ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ تم اس وقت جو کچھ ہو مجھے پسند نہیں۔ معلوم نہیں یہ مسکراہٹ تمہارے یہاں کہاں سے آئی۔ کس چیز نے تمہاری مسکراہٹ میں ایسی کشش اور توانائی پیدا کی؟"۔

"ہاں اب مجھے یاد آیا۔ میری دادی صبح ہی صبح فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید کے بعد میرے چہرے پر پھونکتیں' پھر میرے لئے کچھ دعائیں کرتیں' اس کے بعد چڑیوں کی

کنڈیلی صاف کرکے اس میں انکے لئے تازہ پانی رکھتیں' اس کے بعد بھیگی روٹی کے ٹکڑے انہیں ڈالتیں"۔

"کیا وہ دعا تمہیں یاد ہے؟"۔

"نہیں یورپ میں رہ کر میں سب کچھ بھول گیا صرف ایک آواز رہ گئی ہے جو میرے اندر کبھی کبھی چیختی ہوئی محسوس ہوتی ہے جیسے وہ کسی کو بلا رہی ہو"۔

تھوڑی سی دیر اور

قد اس کا ذرا دبتا ہوا' بدن کچھ دبلا پتلا' ناک بالکل آلو کی طرح' مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہمیشہ چمکا کرتی۔ جس کا ساتھ اس کی آنکھیں بہت کم دیتیں۔ اور ہمیشہ مسکراتے رہنا اسے بڑی مشقت کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اس کے لئے یہ ایک نعمت تھی جو زمانہ سازی کے جذبے نے عطا کی تھی۔ عمر بھی اس کی کوئی زیادہ نہ تھی لیکن مستقبل میں جس قسم کی زندگی گزارنے کا اس کا ارادہ تھا اس ضرورت کے لئے اپنے کردار میں اس نے کچھ اور چیزوں کو بھی جمع کرلیا تھا۔

اپنے طور طریق' لب و لہجہ' چہرے کے تاثرات' سب ہی اس نے سوسائٹی کے ان برے لوگوں سے لئے تھے جو اس کے خیال میں شہرت اور دولت کے مالک تھے۔ لیکن ان کامیاب لوگوں کی فہرست میں اتباع کے لئے وہ انہیں چنتا جو خاندانی اور حسب نسب کے اونچے تھے اور پشتوں سے جن کے گھر کبھی عیش و عشرت سے خالی نہ ہوئے۔ اس کے چہرے پر لوگوں نے بہت کم انکساری اور خاکساری کو نمایاں دیکھا تھا۔ وہی راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض مرتبہ اس کی روزمرہ کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آجاتے جہاں وہ بڑی ہوشیاری اور انکساری کا استعمال کرتا۔ جب کام نکل جاتا تو وہ انہیں اپنے کردار میں سے اس طرح نکل کر پھینک دیتا جیسے یہ اس پر ایک بار ہو۔ وہ انہیں اپنے اوپر سے ایک

ناپسندیدہ لباس کی طرح اتار کر پھینک دیتا جسے اس نے ضرورت کے لئے پہن لیا تھا۔

لندن کی برف باری، سرد ہواؤں اور تلخ تجربوں میں اس کا انسانی وجود پٹتے پٹتے بالکل کچھوے کی پیٹھ کی طرح ہو گیا تھا اور وہ چہرہ جسے وہ اپنے ساتھ پاکستان سے لایا تھا اس میں کافی تبدیلی آگئی تھی، ریاضت سے حاصل کیا ہوا چہرے کا تاثر پرانے پلاسٹر کی طرح اکھڑ کر کہیں گر پڑا تھا، اور حیرانی اس کے چہرے پر پھنسیوں کی طرح پھوٹ پڑی تھی۔

لندن اس کی جدوجہد کی آخری منزل تھی۔ جہاں اس کی تدبیروں نے لاکر اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ یہ شہر بھانت بھانت کے انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا ان معروف لوگوں میں رہ کر سب سے پہلے تنہائی کا اسے شدید احساس ہوا اور بعض مرتبہ تو یہ احساس اُس کے اندر اتنا شدید ہو جاتا کہ اسے اپنے ارمان بھی یاد نہ رہتے تو اپنی کیفیت سے وہ خوفزدہ ہو جاتا۔ اس لمحہ شعوری طورپر وہ اپنے ارادوں، ارمانوں کو یاد کر کے انہیں پھر جگانا چاہتا۔ اکثر اس کے اندر سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھی کوئی ارمان آخری مرتبہ اس کے اندر اس طرح چمک کر ٹوٹتا جیسے وہ آسمان پر کسی ستارے کو ٹوٹ کر خاک ہوتا دیکھتا۔ جو زندگی اس نے گزاری تھی اس نے اسے بڑا سوشل بنا دیا تھا۔ لیکن اب تو لوگوں کو دیکھتے ہی اسے آدمیوں سے چڑ ہونے لگتی اور چہرے پر ایک تناؤ پیدا ہو جاتا۔ خصوصاً" اپنے ہم رنگ کالے لوگوں کی قربت سے تو اسے وحشت ہوتی۔ خود کو زندہ محسوس کرنے کے لئے اس نے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کیں۔ بہت سے نسخے بھی آزمائے۔ کچھ نفسیات کی کتابوں سے مشورے بھی اپنی زندگی میں شامل کئے۔ لیکن ہر تدبیر نسخے اور نفسیاتی مشورے تھوڑی دیر کے لئے اس کے اندر تھوڑا سا ارتعاش پیدا کرتے۔ کچھ ایسا ہی ارتعاش جو شراب کے نشے اور زناکاری سے حاصل ہوتا ہے اس کے بعد بالکل شراب کے نشے کے ہرن ہو جانے کی طرح پھر وہ اپنے اندر ہول کی گونج سنتا رہتا۔

لندن کی زندگی میں وہ حرکت کا بالکل ایسا ہی عادی ہو گیا تھا جیسے کوئی ڈرگ کا عادی اپنے اندرونی خلجان اور گھبراہٹ سے خود کو بچانے کے لئے اسے طرح طرح کی حرکتوں کی ضرورت رہتی جسمانی حرکت جو مستقل اس کی زندگی میں تھی تنہائی میں اپنے داڑھی کے بال نوچتے رہنا۔ جذباتی ذہنی حرکتیں یہ موقع اور محل کے اعتبار سے مختلف رہا کرتیں۔

ایک نسخہ اپنی ذات پر اسے اور کامیاب نظر آیا اور وہ تھا بہترین لباس زیب تن کرنا۔ آمدنی معقول تھی اس لئے وہ کوشش کامیاب ہو جاتی۔ رہن سہن میں بھی اس تعیش پسندی کو برقرار رکھا اور ایک ایسے پوش علاقے میں جاکر (کمرہ نہیں) فلیٹ لیا جہاں اس کے کالے بھائی بندوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ دیسی کھانوں کا استعمال عرصہ ہوا وہ بند کرچکا تھا' جب کبھی وہ اپنے گھر میں کچھ پکاتا۔ وہ انگریزی کھانے ہوتے۔ لیکن گھر پر کھانے کا اتفاق اسے بہت کم ہوتا اکثر وہ لندن کے اچھے ریستورانوں میں جاکر کھانا کھاتا۔ اس اہتمام پر اس کی تقریباً" ساری کمائی ختم ہو جاتی۔ اسے اس کا غم نہ ہوتا۔ اس کے نزدیک یہ پیسوں کا بہترین مصرف تھا۔ آخر سوائے اپنی ذات کے اس کے پاس اور کیا تھا۔

اس عیش و عشرت سے جو متحرک کیفیت اسے ملتی۔ اس کی عمر مقابلتاً" دوسری مصروفیتوں سے زیادہ ہوتی۔ پہلے پہلے تو اس میں تھوڑا سا مزہ بھی آتا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس مزے کی موجودگی میں وہ اپنے اندر کے دکھ سے بچ جاتا۔ لیکن اس مزے کے مسلسل استعمال سے یہ عیش و عشرت دراز ہوکر رہ گیا اب اس پر عیش زندگی سے بھی غیراختیاری طورپر اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ جس پر بعض مرتبہ اسے خود تعجب ہوتا کیونکہ اپنے کردار کے اس پہلو سے وہ خود پہلے واقف نہ تھا۔

خط و کتابت اس کی صرف ماں سے تھی وہ ہر خط میں اپنی صحت' اپنی پریشانیاں اور اس کے والد کا حال لکھتی جو اب اکثر بیمار رہتے تھے۔

باپ کی بیماری سے متعلق سطروں کو وہ کبھی دوبارہ نہ پڑھتا کیونکہ ان کے یاد آتے ہی ان کی دین داری اور مفلسی یاد آجاتی۔

باپ اور دین دونوں بچپن ہی سے اس کے لئے بوجھ بن گئے تھے۔

حالانکہ تفسیر پر ہی اس نے آکسفورڈ سے ڈگری لی تھی۔ انکساری اور خاکساری میں اس کا بچپن اور لڑکپن دونوں گزرے تھے اور اس کے خیال میں اس کا سبب اس کے والد تھے۔ اس خاکساری نے بچپن ہی سے جذباتی طورپر اسے لہولہان کردیا تھا کیونکہ طبیعت کے اعتبار سے وہ ایک حریص تھا۔ ظاہرداری اور دنیا کے مزے اسے بچپن میں ہی اپنی طرف کھینچتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے قصبے میں گزرتی ہوئی کاروں کو بڑے شوق اور حسرت سے دیکھا کرتا۔ اور لڑکپن میں تو کار کو قصبے میں دیکھ کر اپنی غریبی کی پیدا کردہ مجبوری کو

یاد کرکے اس کی آنکھوں میں آنسو تک آجاتے۔ اور دل میں وہ اپنے باپ کو برا بھلا کہتا رہتا، کہتا کہ خدا نے اس گھر میں کیوں پیدا کیا۔ اس کے والد واقعی ایک سادہ مزاج آدمی تھے۔ سادگی اور انکساری سے انہیں بڑا جذباتی اور ذہنی سکون ملتا قصبے میں ایک چھوٹا سا کھیت تھا اس سے کچھ ضروریات پوری ہو جاتیں اور پھر زندگی کا بیشتر حصہ سیاسی اور مذہبی تحریکوں میں گزرا۔ اس کے لئے جیلیں کاٹیں لیکن وہ طبعاً" کاہل اور سونے کے حد سے زیادہ شوقین تھے ان ساری صفات نے مل جل کر انہیں راضی بہ رضا قسم کا آدمی بنا دیا تھا۔ دین کے معاملے میں وہ بہت مخلص تھے اور جو انکساری ان کے کردار میں پیوست ہوتی تھی وہ اسی خلوص کا نتیجہ تھی۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ جب کھیت سے ان کی ساری ضروریات پوری نہ ہوتیں تو قصبے کے دیندار امیر لوگوں کی طرف دیکھتے اور کوئی کام تلاش کرنے کے بجائے امیروں کی نفسیات اور ان کے مزاج کا مطالعہ کرتے رہتے کہ کب اور کیسے ان سے زندہ رہنے کے لئے لیا جائے۔

اس طرح ان کی عظیم انسانی صفت کے ساتھ یہ کاہلی ایک جونک کی طرح چمٹ کر رہ گئی تھی۔ اس عمل نے ان کے عزیمت کو جلا کر بھسم کرکے رکھ دیا تھا۔ جیسے اس میں کسی نے فلیتہ لگا دیا ہو۔

اس مجبوری نے ان کے کردار کو سن کرکے رکھ دیا تھا اور کچھ عرصہ بعد تو ان کے اندرون کی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ جب اس سادگی اور قناعت کو وہ نبیوں، ولیوں کی زندگی اور شعروشاعری میں پڑھتے تو ان کے اندر کوئی آواز نہ اٹھتی اور یہ عظیم انسانی صفت ایک گونج پیدا کرکے پھر ان کے اندر سے نکل جاتی اور وہ خالی کے خالی بیٹھے رہ جاتے۔

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا باپ نے اپنے دینی جذبے سے وفاداری کے تحت پہلے اسے حفظ قرآن کرایا۔ اس کے بعد قاری صاحب کے مشورے پر (جو اس کی ذہانت سے بے حد متاثر ہوئے تھے) اسے عربی مدرسے میں داخل کرادیا۔ جس سے وہ بالکل خوش نہ تھا لیکن اس کے علاوہ کرتا کیا اور کچھ کرنے پر وہ قادر کب تھا۔ مدرسے میں جب تک رہتا ایک ایک لمحہ اس پر بار بنتا جاتا اور جب وہاں سے فارغ ہوکر گھر واپس آتا تو ایک قیدی کی آزادی محسوس کرتا قصبے میں اب کافی اچھے مکان بن گئے تھے ان نودولتیوں کے بچے

جب کبھی چھٹیاں گزارنے قصبے میں آتے تو پھر دھوپ میں وہاں ان کی کاریں چمکنے لگتیں اور دور تک قصبے کی شکستہ سڑک پر دھول کی ایک لمبی لکیر چھوڑ جاتی اس لکیر پر جب اس کی نظر پڑتی تو اس کی حسرت اس کے اندر ایک کرب کی صورت اختیار کر لیتی اور وہ سوچنے لگتا کہ میں صرف چیزوں کو ترسنے کے لئے پیدا ہوا ہوں اللہ نے ان میں سے کوئی ایک چیز میری تقدیر میں کیوں نہ لکھی؟ تھوڑی دیر کے بعد یہ محرومی کا احساس اسے حاسد بنا دیتا اور وہ ان امیروں کو گالیاں دیتا رہتا۔ بعض مرتبہ تو یہ نفرت اس حد تک بڑھ جاتی کہ رات کے اندھیرے میں جا کر ان کی کاروں کو نوکیلی کیل سے کھرچ کر خراب کرتا اور کبھی ٹائر کے نیچے کیل ٹھونک کر چلا آتا اور یہ محرومی تو اسے اس وقت بالکل پاگل بنا دیتی جب والد کی تنگی کی وجہ سے ہفتوں بن بگھاری دال اور سبزیوں پر گزارہ کرتا اور اس پر بھی والد اللہ کا شکر ادا کر کے دسترخوان سے اٹھتے تو اس وقت وہ نفرت میں آپے سے باہر ہو جاتا۔

لیکن وہ ذرا گھنا قسم کا لڑکا تھا۔ اس لئے جی کڑا کر کے وہ اپنی نفرت کو بھی پی جاتا اور اپنے اندرونی رد عمل سے کسی کو باخبر نہ ہونے دیتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے دل کو ضرور مخاطب کرتا۔

اسلام یہی سکھاتا ہے لیکن خالی پیٹ میں شکریہ کیسے ادا کروں بغیر محنت کے دوسروں کو کھانے کے لئے نہیں بلکہ لٹانے کے لئے مل رہا ہے۔

عیش اور چٹورے پن کے ارمان خود اس کی اپنی شخصیت سے تعلق رکھتے تھے۔ قصبے کے امیرزادوں نے ان ارمانوں کو سکھا کر حسرت بنا دیا تھا۔ جس سے اس کا دل ہمیشہ نفرت اور اذیت ناک خیالات سے بھرا رہتا لیکن طبعاً" باپ کی طرح کاہل وہ بھی تھا' باپ اپنی حاجت کے لئے امیروں کو دیکھتا اور یہ یہی سب کچھ خدا سے طلب کرنا چاہتا۔

اپنے دل کی جلن سے تنگ آکر جب وہ خود کلامی پر اتر آتا تو عارضی طور پر اسے تھوڑا سا سکون مل جاتا۔ اس عالم میں جب وہ کسی دوسرے کام میں لگ جاتا تو اس کا دھیان بٹ جاتا۔

جیسے پہلے عرض کیا ذہین اور حریص وہ بچپن سے تھا مفلسی کی پیدا کردہ مجبوری نے سوچنے اور محسوس کرنے کی دھار کو اور تیز کر دیا تھا۔

قصبے کے دینی مدرسے سے جب وہ فارغ ہوا تو اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کا اسے کچھ اندازہ سا ہونے لگا۔ اس اندازے سے اس میں اعتماد بھی پیدا ہوا۔ لیکن اس اعتماد نے اس کے اندر تھوڑی سی بے چینی بھی پیدا کردی۔ اس کی دنیاوی تمنائیں تو اسے پہلے ہی سے ستا رہی تھیں کیونکہ اپنے قصبے کے سادہ ماحول میں سوائے کھیتوں' چند چھوٹے چھوٹے کام' اسکول اور چھوٹے سے اسپتال کے علاوہ کیا تھا۔ اس گھٹن کو لے کر وہ گھنٹوں سوچتا رہتا کہ آخر اس "قید خانے" کی دیواروں کو کیسے توڑے آخر ایک دن اس نے ایک اخبار میں ملتان کے ایک دارالعلوم کا اشتہار پڑھا' جہاں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی تھوڑا سا انتظام تھا۔ طلباء کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مفت اس اشتہار کو پڑھ کر خوشی سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا آنے لگا یہ اخبار وہ ایک لائبریری میں پڑھ رہا تھا سب کی نظر بچا کر اس نے وہ اشتہار چپکے سے پھاڑا اور اپنی جیب میں رکھ کر گھر آکر اپنے باپ کا انتظار کرنے لگا۔ اس دن باپ بڑی رات گئے گھر آئے۔ ماں بیٹے دونوں خوشی سے ان کا انتظار کر رہے تھے گھر کی دھیمی لالٹین کے اجالے میں والد صاحب نے جب دونوں ماں بیٹے کو سر جوڑے دیکھا تو مسکراتے ہوئے ان کے پاس آئے پہلے انہیں سلام کیا اور پھر پوچھا۔

"آج کیا بات ہے تم دونوں نے میرے خلاف کوئی اسکیم بنائی ہے"۔

"چھوڑو ان جلی باتو کو ہر چیز تمہیں دشمن ہی نظر آتی ہے۔" بات کا آغاز کرتے ہوئے ماں کے چہرے پر ایک خاص قسم کا نسوانی دلربا طنز جھلکا۔

"تو آخر کیا بات ہے؟"۔

"میں تعلیم کے لئے ملتان کے ایک دارالعلوم جانا چاہتا ہوں۔" عبید نے آدھی بات سنا کر پہلے اپنی مزید تعلیم کے متعلق رد عمل معلوم کرنا چاہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے بسم اللہ کرو نیک کام میں کیا دیر جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا وہ میں کردوں گا۔" والد صاحب بڑے گھمبیر ہوگئے تھے۔

"چھوڑو اپنے کرنے کو گھر میں دو وقت کی روٹی تو پیٹ بھر کر ملتی نہیں پڑھائی کا بوجھ تم سے کیسے سنبھلے گا۔ یہ تو اللہ کا لاکھ احسان ہے کہ اس نے کوئی لڑکی نہ دی ورنہ مصیبت پڑ جاتی۔" ماں طنز کرکے مسکرا رہی تھی۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔" والد صاحب اس مرتبہ واقعہ ناراض ہوگئے تو پھر عبید ان سے مخاطب ہوا۔

"ابا۔ اللہ نے اس کا بھی انتظام کردیا آپ فکرمند نہ ہوں، مدرسے کی طرف سے ہر چیز ملے گی"۔

"اچھا۔" باپ کی آنکھیں خوشی میں چمک اٹھیں اور انہوں نے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔

دارالعلوم پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی، عمارت اس مدرسے کی واقعی بڑی جدید تھی بالکل یونیورسٹی کی طرح جس سے اس کی طبیعت کو تھوڑی سی فرحت ملی۔ کھانا بھی اسے پسند آیا۔ یہاں ہفتے میں تین دن اسے گوشت کھانے کو ملتا اس سے متصل جو مسجد تھی وہ بھی جدید۔ مسجد کے اندر ایک لان تھا جہاں ہری گھاس بالکل مخملی فرش کی طرح نظر آتی۔ نماز کی پابندی ہر طالب علم پر ضروری تھی جو اسے بڑی ناگوار لگتی تھی، اور دوسری ناگوار چیز اس مدرسے میں شیخ الجامعہ کا مزاج اور ان کی اصول پسندی۔ لیکن اس کھلی فضاء اور عمدہ کھانے کی خاطر اسے اس نے گوارا کرلیا۔ البتہ یہاں جو طلباء تھے وہ اسے بالکل پسند نہ تھے اس کے خیال میں اگر زمانے کو دیکھتے ہوئے جو تبدیلی ان کے اندر آئی تھی وہ صرف یہ کہ اب ان میں سے بہت سے طلباء یہاں سے فارغ ہوکر علوم شرقیہ میں امتحان دے کر مدرسوں اور امامت کے فرائض انجام دینے کے بجائے اسکولوں کی مدرسی کی طرف دوڑنے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن ملتان میں آکر اب یہ مدرسی اور اسکول کی ماسٹری اس کی نظر میں زندگی میں ایک فل اسٹاپ کی حیثیت رکھتی تھی جہاں آگے کچھ نہ تھا بس مختصر سی چادر اس کے باہر پیر پھیلانے کی گنجائش کہاں۔ تو پھر یہ زندگی اس کے گھر سے کب مختلف تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے اس آئیڈیل کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس کو ٹھکرا کر وہ چاہتا کیا۔ اس کا واضح تصور اس کے پاس نہ تھا۔ ملتان ایک تاریخی شہر ہے وہ اسے بالکل برگد کی طرح پھیلا ہوا نظر آیا۔ کبھی کبھی تو اس شہر میں آوارگی کرتے ہوئے اسے ایسا احساس ہونے لگتا جیسے یہ ایک سمندر ہو حالانکہ سمندر کی وسعت کا تخیل اسے صرف کتابوں کے

مطالعہ سے ملا تھا۔

اسے سب سے زیادہ مزا ملتان کی گلیوں میں گھومنے میں آتا۔ جہاں شام میں اندھیرا اور گہرا ہو جاتا۔ اندھیرا اس کے لئے ہمیشہ باعث کشش رہا بعض مرتبہ وہ خود کو اس میں چھپانا چاہتا اور کبھی اسے اپنے تخیل کے مشق کے لئے استعمال کرتا۔

یہ نیم تاریک چھوٹی چھوٹی گلیاں اسے اپنے مستقبل کی الجھی ہوئی ڈوریں نظر آتیں' ان میں آوارگی کرتے ہوئے وہ سوچتا کہ مجھ جیسے بے سہارا آدمی کا مستقبل تو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ پڑھنے لکھنے کا اسے بچپن سے ہی شوق تھا لیکن قصبے میں پرانی کتابوں' اخبارات اور رسالوں کے سوائے اسے کیا ملتا۔ لیکن ملتان اس کے لئے ایک جدید شہر تھا' جہاں اس کے دارالعلوم کی طرح قدیم و جدید کی آمیزش بڑی نمایاں تھی۔ ملتان میں آوارگی کے ساتھ آوارہ مطالعے کی طرف اس کی طبیعت پھر بہکی کیونکہ دینی کتابوں میں اس کا دل کب لگتا تھا اس لئے جب دارالعلوم سے اسے جیب خرچ ملتا تو اپنی رقم کی ایک مد وہ کتابوں کے لئے ضرور رکھ لیتا اور جس کتاب کا ٹائٹل اسے دیدہ زیب نظر آتا وہ اسے خرید لیتا ان کتابوں میں اشتراکیت سے متعلق بھی کچھ کتابیں ہوتیں جنہیں بڑی حفاظت سے چھپا کر اپنے کمرے میں لاکر تکئے کے غلاف کے اندر چھپا دیتا رات میں جب سب سو جاتے تو وہ انہیں پڑھنے کے لئے اٹھتا' بعض مرتبہ تو مطالعے میں اسے اتنا جاگنا پڑتا کہ صبح کی نماز قضاء ہو جاتی جو مدرسے کے نظام میں کوئی اچھی بات نہ تھی۔

دینی کتابوں اور ہلکی پھلکی کتابوں کے آوارہ مطالعے سے اس کے ذہن کا ایک سانچہ بن گیا تھا۔ اس لئے مارکس ازم پر جب وہ کوئی فلسفیانہ کتاب پڑھتا تو اس کے ذہن میں بہت کم پڑتا خصوصاً" نفسیات اور جدلیات پر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا لیکن ان مباحث کے بعد جب ان کتابوں میں مذہب کی نظریاتی بنیادوں پر نعرے بازی کے انداز میں چوٹیں کی جاتیں تو وہ فقرے اس کے ذہن میں پیوست ہو جاتے' اور دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں سے دین کی صداقت کو مجروح کرتے رہتے۔ ان بھاری بھرکم نعروں کی تاب نہ لاکر مارکس ازم کو پوری طرح سمجھے بغیر دین کی بنیادوں پر شک اس کے اندر جھکڑ کی طرح چکر کاٹنے لگتا۔

بھاری بھرکم لوگوں' پیروں سے مرعوب ہونے کی کمزوری تو اس کے اندر پہلے سے

موجود تھی جب یہ بھاری بھرکم نعرے لگا تار اس کے قلب و ذہن پر دستک دیتے رہے اور جب اس کے اندر کچھ نہ رہا تو آخر ایک دن خود اس نے پھر دل کو مخاطب کیا اور کہا۔

یہ مذہب ایک ڈھکوسلا ہے۔ جاہلوں اور کمزوروں کو تسلی دینے کے لئے یہ بات باآواز بلند اس نے اپنے دل کو مخاطب کر کے کہی۔

مارکس ازم کے آدھے سمجھے ہوئے مطالعے نے اسے لامذہب کر دیا تو اس کی وہ ساری گھٹن اور ناگواریت جو دینداری کی وجہ سے اپنے اندر محسوس کرتا تھا۔ اب کھل کر ایک حملہ آورانہ کیفیت میں اس کے اندر تبدیل ہو گئی۔

اب جب کبھی اس کا کسی دیندار آدمی یا کسی دینی قدر سے واسطہ پڑتا تو طبیعت میں ایک قسم کی غصہ آمیز جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی۔ اور اس جھنجلاہٹ سے اس کا اس وقت پیچھا چھوٹتا جب وہ کسی کے سامنے مذاق میں کسی دینی قدر پر ضرب لگاتا اسلام کو ترک کر کے اپنے ذہن میں وہ ایک شدید قسم کا انقلابی بن چکا تھا اور مارکس ازم پر زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرتا لیکن پورے طور پر اس کا ذہن اسے ہضم نہ کرپاتا۔ اس مطالعہ کے دوران جب اس کے ہاتھ کمیونسٹ ادیبوں اور انقلابیوں کی سوانح عمریاں لگتیں تو ان کو پڑھ کر جہاں اس میں لطف پیدا ہوتا وہاں اپنی زندگی سے ان مشہور آدمیوں کی زندگی کا مقابلہ کر کے اس میں خود پر اعتماد بھی پیدا ہوتا کیونکہ بیشتر ادیب اور دانشور انقلابی اسی کی طرح غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

مارکس ازم کے مطالعے نے اس سے خود کلامی کی عادت چھڑوا دی اور جب لینن کے مضامین کا اس نے مطالعہ کیا تو اس کے سامنے (اس کی دانست میں) چودہ طبق روشن ہو گئے اور اس نے پہلی مرتبہ اپنی مکاری کو نئے معنوں سے مسلح کیا اور دارالعلوم میں کوئی اہم مقام یا حیثیت حاصل کرنے کی سوچنے لگا یہ جدید دینی مدرسہ ملک کے رئیسوں اور تاجروں کے چندوں پر چلتا تھا اور سال میں کبھی ایسے دن بھی آجاتے۔ جب پیسے کی تنگی کی وجہ سے طلباء کی ضروریات پر ضرب پڑتی۔ جس سے طلباء میں ایک قسم کا اضطراب پیدا ہو جاتا شیخ الجامعہ جو پرانی وضع اور پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس اضطراب کو اپنے مزاج کی سخت گیری سے دبانا چاہا، جس سے طلباء میں مزید اشتعال انگیز رد عمل پیدا ہوا اور دارالعلوم میں اس نے ہڑتال کرادی۔

ہڑتال کے دوسرے دن اس مدرسے کے نگراں صاحب تشریف لائے اور طلباء کے وفد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھوڑی دیر بعد اس کا انتظام بھی ہوگیا۔ پہلے تو سارے طلباء صرف اس کو وہاں بھیجنا چاہتے تھے جس پر اپنے دل میں وہ بہت خوش ہوا لیکن پھر سوچ کر چند ایسے طلباء کو بھی اپنے ساتھ لے لیا جس پر اس کی گرفت ذرا مضبوط تھی۔ ایک گھنٹے کی ملاقات میں نگراں صاحب نے اسے بخوبی سمجھ لیا اور اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دیدی کہ کبھی وقت ہوا کرے تو وہاں آیا کرے۔

ہڑتال نے کچھ طلباء کو دیا لیکن اس کے حق میں تو یہ الہ دین کا چراغ ثابت ہوئی۔ کسی مراد کے بر آنے پر مقامی تاجروں میں سے کبھی کبھی طلباء کو اپنے گھروں پر دعوت کے لئے بلالیتے اور ان دعوتوں میں وہ تمام کھانے انہیں میسر آتے جو صرف امیروں کے دسترخوان سے مخصوص ہیں۔ لیکن اس ہڑتال کے بعد نگراں صاحب نے طلباء کو رام کرنے کے لئے دو چار دعوتیں دارالعلوم میں ہی کرادیں۔

عبید کا نگراں صاحب کے یہاں آنا جانا شروع ہوگیا کوٹھی ذرا پرانی وضع کی تھی لیکن اس کے چاروں طرف کھلا ہوا میدان تھا۔ زنان خانے کی طرف جو حصہ تھا وہاں کچھ گھنے پیڑ اور پھلواری بھی تھی اور وہیں ایک بھینس بھی جگالی کرتی نظر آتی۔ نگراں صاحب ذرا دراز قد بھاری بدن کے تھے بدن کسرتی تھا لیکن اب عمر کی وجہ سے ان کے جسم کا گوشت ڈھیلا پڑ کر ہلنے لگا تھا لوگوں کی خاطر تواضع اور حقے کا بے انتہا شوق تھا فصل پر میووں کا کوٹھی پر ڈھیر لگا رہتا۔ اس لئے دوستوں کی خوب تواضع ہوتی۔ نگراں صاحب اپنی نگرانی میں تمباکو خود گھر پر تیار کراتے اور جب انگوروں کی فصل آتی تو پہلے اس کا خمیرہ تیار کیا جاتا پھر وہ تمباکو میں استعمال ہوتا ذمہ داریوں نے اپنی ضرورت سے زیادہ ملنسار اور خلیق بنا دیا تھا باتیں بھی مسکراتے ہوئے دھیمے انداز میں کرتے اور ان کی عقاب کی سی تیز آنکھیں دوران گفتگو مخاطب کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثر کا تعاقب کرتی رہیں کہ وہ اس کی باتوں سے کس حد تک متاثر ہو رہا ہے۔ رئیسوں اور تاجروں کی نفسیات کے وہ ماہر تھے۔ ایک ماہر موسمیات کی طرح وہ ان کے مزاجوں کے رخ کو دیکھ کر دارالعلوم کے لئے چندے کا اندازہ لگالیا کرتے۔ دارالعلوم کے علاوہ کچھ اور بھی قومی ادارے تھے جہاں کسی نہ کسی حیثیت میں ان کا عمل دخل رہتا۔ ملکی سیاست سے بھی شغف تھا۔ قومی اداروں

سے لے کر ملک تک ان کے پاس پروگراموں کا ایک انبار تھا وہ ایک ہدایت کار کی طرح تیز اور مستعد قسم کے آدمیوں خصوصاً" نوجوانوں کے منتظر رہتے تاکہ وہ ان کے پروگرام کو آنکھ بند کر کے قبول کرلیں اور کولہو کے بیل کی طرح چکر لگاتے رہیں۔ اپنے پروگراموں پر اصولی تنقید وہ کبھی گوارہ نہ کرتے تھے ہاں اگر کسی کو ہدایات کو سمجھنے میں دشواری ہو تو اس سے وہ گفتگو کرلیا کرتے۔

اپنے کارکنوں میں سوائے تخلیقی صلاحیت کے وہ ہر انسانی صلاحیت کو ابھار کر ان کی تربیت کر کے ان سے وہ ایک طرف اپنا کام لیتے دوسری طرف ان میں ذاتی اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور اتفاق سے اگر کوئی سر پھرا تنقید سے کام لے کر اپنے ذہن سے کچھ کام لینا چاہتا تو پھر وہ اسے ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے زیر کرنے کی کوشش کرتے جب وہ زیر نہ ہو پاتا تو پھر اسے ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے مفلوج کرنے کی کوشش کرتے وہ خود بڑے خاموش اور غیرجذباتی قسم کے آدمی تھے لیکن ان کی اندرونی شخصیت کی گہری چھاپ ان کے پروگراموں میں ملتی' ان پروگراموں میں ان کا تخیل بڑا غیرواقعاتی ہو جاتا۔ لیکن اپنی اس کمی کو وہ اس میں Thrill شامل کر کے موثر بنا دیتے ان کی دو بیویاں تھیں پہلی بیوی سے جو لڑکا تھا وہ ذرا باغی قسم کا تھا جب تک وہ ملتان میں رہتا گھر سے کھاتا پیتا رہتا اور جب نگراں صاحب کی سردمہری سے تنگ آجاتا تو پھر کسی دوسرے شہر میں چلا جاتا اور جو کام ملتا وہ کرتا جب کام سے تنگ آجاتا تو پھر لوگوں سے شکایت کرتا رہتا کہ میرے باپ نے مجھے اس قابل بھی نہ رکھا کہ میں بے ایمانی بھی کرسکوں۔ ویسے نئی بیوی سے ان کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے چھوٹا بچہ تو ابھی تک گھر میں ہی کھیلا کرتا البتہ دو بچے جن کی تعلیم کی ابتدا انگریزی نرسری اسکول سے ہوئی مشنری اسکول سے ہو کر کالج پر تھوڑے عرصے کے لئے رک گئی تھی۔ ویسے ان دونوں بچوں کو انہیں یورپ اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں بھیجنے کا ارادہ تھا۔ ان دونوں لڑکوں کی تربیت میں انہوں نے کئی چیزوں کا اہتمام رکھا تھا۔ جب گھر میں کوئی بڑی شخصیت آتی تو ان کا ان سے تعارف کراتے اپنی محفلوں میں انہیں بیٹھنے کی تاکید کرتے' لیکن ان سے کبھی حقہ نہ بھرواتے۔ اس کے لئے دارالعلوم کا جو غریب ملازم تھا یہاں آکر شام کے وقت اس خدمت کو انجام دیتا۔ ان دونوں بچوں کا کام صرف یہ تھا کہ وہ خود کو علم میں ڈبو دیں۔ اس

لئے گھر کا سودا سلف بھی ان سے نہ منگایا جاتا۔ مختصر یہ کہ عام زندگی کی ان کو جھلک نہ دکھائی جاتی۔ سوائے اس زندگی کے جس میں لیڈری اور سرپرستی کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ ملک میں دینی مدرسوں کی بقاء کے وہ بڑے حامی تھے۔ اور اس نظام کے خلاف ملک میں کسی طرف سے آواز اٹھتی تو وہ اس کے خلاف جوابی مہم شروع کرادیتے لیکن اپنے کسی بچے کو اس دینی مدرسے میں تعلیم کے لئے نہ بھیجتے۔ البتہ بچوں کی دینی تعلیم کے لئے دارالعلوم کے ایک استاد کو بلالیتے اور اسے کچھ پیسے دیدیتے۔

عورتوں کی تعلیم کے بھی اس زمانے میں وہ قائل ہوگئے تھے۔ لیکن عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے سخت مخالف۔ دوستوں کی مجلسوں میں اس موضوع پر زوردار تقریریں کیا کرتے لیکن جب ان کی بچی نے میٹرک کرلیا تو پھر انہیں زمانے کی روش کو دیکھنا پڑا کہ آج کل کے لڑکے بیویوں کی کالج کی ڈگریوں کو بھی ایک طرح کا جہیز تصور کرتے ہیں اور کالج کی پڑھی لکھی بیوی کے آجانے سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل ہو یا نہ ہو لیکن اس سے شوہر صاحب کا سماجی مرتبہ ضرور بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے نگراں صاحب کو بھی اپنی حیثیت کے اعتبار سے اپنی بچی کے لئے ایک شوہر کی ضرورت تھی اس لئے چپکے سے اپنی بیٹی کو اپنے بھائی کے گھر راولپنڈی بھیج دیا جہاں وہ ایک سرکاری افسر تھے اور وہاں کالج میں اس نے داخلہ لے لیا۔

نگراں صاحب کے گھر آنے جانے کے ابتدائی دنوں میں نگراں صاحب اور عبید دونوں ایک دوسرے کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے رہتے۔

نگراں صاحب نے اپنے تیز مشاہدے کے ذریعے اس کے کردار کی بنیادی عنصروں کا پتہ لگالیا۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگیا کہ یہ حریص اور ذہین ہے۔ لیکن اس کی مکاری کی وجہ سے وہ یہ پتہ نہ لگاسکے کہ یہ دہریہ بھی ہے اپنے اس روپ کو اس نے بہت سے پردوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ جہاں کسی آدمی کی نظر نہ پہنچ سکتی تھی رہا اس کا گنوار پن وہ تو چند دنوں کے بعد ہی ان پر ظاہر ہوچکا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ ایسا کوئی طریقہ دریافت نہ کرسکے تھے جس سے وہ اس کی حرص پر اپنا قابو بالکل اس طرح رکھ سکیں جس طرح ایک جنگلی گھوڑا لگام کے ذریعے سوار کے قبضے میں رہتا ہے۔ دوسری طرف عبید ان کی قربت کی خوشی میں سرشار تھا۔ عبید کی زندگی میں نگراں صاحب دوسرے کردار تھے جس کے ایک

ایک قدم پر اس کی نظر تھی وہ اس کی نظر میں بلا کے ذہین اور تجربے کار تھے۔ اس نے بہت جلدی ان کی ضرورتوں کا اندازہ لگالیا جب اس نے نگراں صاحب کا مطالعہ کھل کر کرلیا تو پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے نگراں صاحب کے اور قریب پہنچنا چاہا۔

گھر میں ہمیشہ سودا سلف لانے والے کا رونا رہتا آخر ایک دن عبید نے اس کام کے لئے پابندی سے اپنی خدمات پیش کردیں نگراں صاحب نے ابتداء میں تو ذرا تکلف سے کام لیا لیکن اس کے اصرار پر پھر خاموش ہوگئے۔ اب وہ مدرسے سے فارغ ہوتے ہی سیدھا نگراں صاحب کی کوٹھی پر جاتا گھر کا سودا سلف لانے کے بعد پھر وہ بغیر پوچھے کمرے کی صفائی بھی کردیتا کبھی نگراں صاحب گملوں میں لگے ہوئے پھولوں کے سوکھنے کا تذکرہ کرتے تو اس نے ان میں بھی پانی دینا شروع کردیا۔ ایک دن تو وہ سر کو پکڑے اداس بیٹھے تھے تو عبید نے ان کے مزاج پوچھے۔

انہوں نے درد سر کی شکایت کی تو وہ بغیر ان سے کہے ان کے قریب جاکر ان کا سر دبانے لگا تو اس کام میں بھی وہ بڑا ماہر نظر آیا سر دبواتے وقت انہوں نے اس کی تعریف بھی کی تو پھر اس نے تیل کو پوچھا تو خود اٹھے اندر سے سر کے تیل کی شیشی اور تولیہ لائے اور اسے دیدی۔ ملتان کی گرمی زمانے میں مشہور ہے۔ اس لئے جب کبھی گرمی زیادہ پڑتی تو اس دن ذرا جلدی مدرسے سے آجاتا اور کوٹھی میں پانی کا چھڑکاؤ کرتا تھا۔

عبید نگراں صاحب کی خدمت میں بڑا خوش تھا۔ اور اس خوشی کی نوعیت بھی اس کی دوسری خوشیوں سے مختلف تھی کیونکہ ان خدمات کو وہ اپنے ارمانوں کی تکمیل کی قیمت سمجھ کر ادا کر رہا تھا۔ ایک دن اسی قسم کی خدمتوں میں اپنا وقت گزار کر عبید نے نگراں صاحب کی ایک بڑی نادر کمزوری دریافت کی جب کوئی ان کی کوٹھی میں ان کے کسی کارنامے کا ذکر کرکے انہیں اپنے زمانے کا عبقری ثابت کرنا چاہتا تو ان کے چہرے پر اندرونی سرور میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ کچھ اس طرح چمکنے لگتی جیسے کسی کو ہلکا سا پسینہ آجائے' یہ مسکراہٹ دیر تک چہرے پر ٹھہری رہتی اور انہیں بڑا لطف دیتی رہتی۔ اس دن کے بعد سے اب اس کا معمول ہوگیا کہ وہ نگراں صاحب میں کسی نہ کسی ہنر کو تلاش کرکے بڑے احترام آمیز انداز میں ذکر کرتا۔ نگراں صاحب ابھی تک اس کی حرص کے

لئے کوئی پنجرہ تیار نہ کرپائے تھے۔ لیکن اس کی خدمت کے معترف وہ ضرور ہو گئے تھے۔ اس کی خدمتوں نے انہیں نفسیاتی طور پر اسیر کر کے رکھ لیا تھا' جس کی وجہ سے اب نہیں اس کی فکر تھی آخر ایک دن جب وہ نگراں صاحب کے سر کی ہولے ہولے مالش کر رہا تھا نگراں صاحب نے بڑی اپنائیت کے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"عبید کیا خیال ہے تمہیں الازہر میں تین سال کے لئے بھیج دیا جائے"۔

"میرے ایسے نصیب کہاں۔" عبید کے منہ سے خوشی میں بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔

"نہیں اللہ نے اس کے اسباب پیدا کردیئے ہیں حکومت مصر نے حکومت پاکستان سے چند طلباء طلب کئے ہیں حکومت مصر کے خرچ پر۔" اس مرتبہ مزید تشریح کر کے انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور عبید کے چہرے پر رد عمل کو پڑھتے رہے۔

عبید کی نظریں نگراں صاحب سے ٹکرائیں تو اس نے تعظیم سے سر جھکا لیا اور کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔

الازہر مصر کی آج بھی عالم اسلام میں کیا حیثیت ہے اس سے وہ بخوبی واقف تھا پھر اس نے بھی تو اس سے متعلق بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ جن سے دلچسپی اسے ضرور رہتی لیکن اپنی بساط کو دیکھ کر اس طرف جانے کی کبھی نہ سوچی مصر جانے کی خوشی کئی دن تک اسے مسرور کئے رہی بعض مرتبہ تو اپنے مستقبل کے متعلق وہ سوچتا بھی کہ وہ کیا ہو؟ الازہر اسے کیا دے سکتا ہے۔ اسے ہفتوں تک اپنے اندر اور اپنے آس پاس کوئی جواب نہ ملا ایک رات پھر سر کی مالش کے دوران نگراں صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے ذرا غنودگی کے انداز میں کہا۔

"اگر تم نے وہاں محنت سے کام لے لیا تو بڑے کام کے آدمی ہو جاؤ گے"۔

"کس کام کے قابل قبلہ!" اس نے اپنا ہاتھ روک کر ذرا اضطراب سے پوچھا۔

"دین اور دنیا دونوں بن جائیں گی۔" معنی خیز مسکراہٹ سے عبید کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ان کی ہنسی دیکھ کر وہ بھی ہنس دیا اور پھر ان کے اس جملے کو معنی پہناتا رہا اپنے سوچنے کے دوران پہلے دین کے تصور کو اس نے نذر انداز کردیا لیکن جب اس کے تجرباتی ذہن نے کمپیوٹر کی طرح اس کے سامنے دین کی اہمیت کو رکھا تو پھر اسے احساس ہوا کہ

جس منزل کی طرف اس کا رخ ہے وہ دین کی ہی آماجگاہ ہے۔ اس لئے اب اپنی زندگی کے بنانے سے اسے خارج نہیں کر سکتا عقیدے کے طور پر نہیں پیشے کے طور پر اسے زندگی بھر اب اسے اس کی ضرورت رہے گی اس لئے اپنے سارے انقلابی اداروں کے لئے اسے منافق اور زمین دوز بننا پڑے گا اس موقع پر پھر اسے دین بھی یاد آیا کہ اصل چیز مقصد ہے وہ چاہے کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔

اس کے تصور میں اب ایک لمبی سی لکیر کھنچ گئی تھی جو سیدھی مصر پر جاکر ختم ہوتی جہاں کا ماحول پاکستان کی طرح گھٹا گھٹا نہ تھا۔ جمال ناصر کی اشتراکیت ان دنوں ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھی۔ اس کے خیال میں عرب اب زیادہ ترقی پسند ہوگئے تھے۔ وہ ترکوں کی طرح نہ تھے جو اب پھر رجعت پسندی کی طرح بڑھ رہے تھے آخر اسلام کی طرف جاکر آج کے زمانے میں وہ کون سا کارنامہ انجام دے سکیں گے لیکن آدھی صدی تک مغرب کی سیکولریت کو قبلہ سمجھ کر انہوں نے سوائے کوٹ پتلون اور اسکرٹ اور دوسری طاقتوں کے طفیلی بننے کے علاوہ کیا حاصل کیا۔ مغرب سے متاثر ہوکر وہ تو جاپان کی طرح بھی کوئی مادی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ اس وقت یہ فقرہ بھی اسے یاد آیا جو اس نے ایک رسالے میں ترکوں پر ایک مضمون میں پڑھا تھا ان دنوں یہ جملہ بھی اسے اپیل کر گیا تھا۔ لیکن اب اس کا سارا اثر اس کے ذہن سے کافور ہوگیا۔ مارکس ازم نے ان دنوں نہ صرف جذباتی بنایا تھا بلکہ اس کا غسل ذہن کرکے اسے صرف ایک رخہ بنا کر رکھ دیا تھا اور اب اس کی نفسیات کچھ ایسی ہوکر رہ گئی تھی کہ سوائے ان خیالات، نعروں کے جو مارکس ازم سے مطابقت رکھتے ہوں یا ان کی منقبت ہوں اسے بہت عزیز تھے اور وہی اس کی سماعت اور بصارت پر خوشگوار اثر ڈالتے تھے۔ عبید کے تخیل میں حال اور مستقبل کی آگہی کے ساتھ بلا کا حقیقت پسندانہ توازن تھا اور اسی کی رہنمائی میں اس نے جتنے قدم آگے بڑھائے تھے اس نے مار کم کھائی تھی۔ اور جو مار بھی اس پر پڑی وہ بڑی معمولی تھی جس کو اس نے یاد رکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی حسب معمول وہ پھر نگراں صاحب کے ہاں تھا جب مجلس برخاست ہوگئی تو انہوں نے پھر حقہ سنبھال کر اس کی نے کو پانی سے بھگونا چاہا تو عبید پھر سعادت مندی کے انداز میں اٹھا اور حقہ ان کے ہاتھ سے لے کر غسل خانے میں چلا گیا وہاں اس کا پانی بدلا سارے حقے کو تازہ کیا۔ اس کے بعد چلم میں

انگور کے خمیرے کا تمباکو رکھ دیا۔ اس پر آگ رکھی اور احتیاط سے اٹھا کر نگراں صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے چہرے پر پھر مسکراہٹ ابھری اور انہوں نے حقہ کو کس کر بغیر اسے دیکھے پھر کہا۔ "مصر جانے والے طلباء میں تمہارا بھی نام ہے"۔

"بہت بہت شکریہ۔ آپ کے مجھ پر پہلے ہی بہت احسانات تھے"۔

"لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ تم کر کے کیا دکھاتے ہو۔" نگراں صاحب نے جواب دے کر اس مرتبہ بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عبید خاموش رہا کیونکہ اس خبر سے جو خوشی اسے حاصل ہوئی تھی وہ تو اس سے سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی اور سوائے اس خوشی سے لطف لینے کے کوئی اور خیال اس کے ذہن میں تھا بھی نہیں۔

نگواں صاحب خود بھی ایک خاندانی رئیس تھے دور اور قریب کے کچھ رشتہ دار حکومت کے اہم عہدہ پر تھے۔ اس لئے ایسے معمولی کاموں کی ان کے نزدیک حیثیت کیا تھی۔ ایسے چھوٹے موٹے کاموں کو کرا کر وہ اپنے کردار کے غرور آمیز کبر کے عنصر کے تسکین کا سامان فراہم کرلیا کرتے لیکن عبید سے تو ان دنوں واقعی انہیں دلچسی سی ہو گئی تھی۔ وہ واقعی اسے کام کا آدمی دیکھنا چاہتے تھے آخر اس کے کامیاب ہونے کے بعد لوگ اس کی طرف دیکھیں گے تو انہیں اور ان کے دارالعلوم کو کیسے بھول سکیں گے جس نے ایسے نوجوان پیدا کئے آخر وہ چندہ دینے والوں کو بھی تو کچھ دکھانا چاہتے تھے اس لئے اسے پاسپورٹ اور دوسری دفتری خانہ پری کے لئے کراچی جانے کے لئے کہا کراچی سے پہلے اسے اس کے گھر بھیج دیا جب وہ کراچی جانے سے پہلے اپنے قصبے میں آیا تو زندگی میں پہلی مرتبہ اسے قصبے کی فضاء بڑی دلفریب معلوم ہوئی قصبے کے قریب ایک نہر بھی بہتی تھی صبح ہی صبح وہ وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا اور سر اٹھا کر لمبے لمبے سانس لیتا رہتا تاکہ اپنے قصبے کے حسن اور انبساط کو وہ اپنے اندر جذب کر سکے اس کے ماں باپ دونوں خوش تھے بلکہ اس کے باپ کو تو اپنے لخت جگر کو دینی تعلیم کے لئے دور جانے کی خوشی ایک والہانہ کیفیت سے کم نہ تھی آخر اس کے پاس خدا کے حضور میں اس بچے کو دینے کے علاوہ کیا تھا وہ گھر میں اس کا ایک ایک چیز کا خیال رکھتے بعض مرتبہ تو اس کے باپ کو اس کے لئے

قرض بھی لینا پڑتا۔

ماں کی محبت باپ کی محبت سے بالکل الگ تھی اس میں ایثار کا جذبہ کچھ ضرورت سے زیادہ گہرا ہوگیا تھا اس کے باپ سے چھپا کر جو کچھ اس کے پاس اثاثہ تھا وہ سب اس کے کپڑوں پر چپکے چپکے خرچ کرنے لگی۔

نماز تو ہمیشہ اس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے پڑھی جب وہ تنہا ہوتا تو کبھی مسجد کی طرف رخ بھی نہ کرتا لیکن اس مرتبہ جو وہ گھر آیا تو اس نے اس دکھاوے کی نماز کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا والدین کو اس پر بڑا تعجب ہوا۔ آخر ایک دن جب یہ تینوں مل کر کھانا کھا رہے تھے تو اس کے باپ نے ذرا تشویش کے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"بیٹا اب تم عالم دین ہوگئے ہو۔ لیکن تمہاری نمازیں؟ یہ تو دین کا ستون ہیں۔ اب تمہارے پاس دین کا علم ہے۔ خدا سے تمہارا تعلق اور مضبوط ہونا چاہئے اور جو کچھ آج تمہیں ملا ہے اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے"۔

باپ کی ان باتوں نے اس کے ذہنی توازن کو بگاڑ کر رکھ دیا جس کی وجہ سے وہ اپنی مکاری کو بھی برقرار نہ رکھ سکا۔ اور انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے وہ میری محنت کا پھل ہے۔ خدا نے اس میں میری کیا مدد کی؟ اور پھر آپ لوگ خدا پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرکے اپنی صلاحیتوں کو بھی کند کر بیٹھے ہیں جب لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ آپ اس وقت یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی طرف دیکھو جن کو یہ بھی نہیں مل رہی۔ آخر ہم ان لوگوں کی طرف کیوں نہ دیکھیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ کھانے کے لئے ہی نہیں بلکہ لٹانے کے لئے بھی ہے"۔

عالم دین بیٹے کا یہ جواب سن کر دونوں میاں بیوی پر ایک پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔ غریب ماں تو خوف کی وجہ سے ان کلمات کو سن کر رو پڑی لیکن اس چوٹ نے اس کے شوہر کو اسی طرح سنبھال کر رکھ دیا جیسے کوئی لڑائی میں زخم کھا کر مقابلے کے لئے پھر چوکنا ہو کر کھڑا ہو جائے۔

جواب دینے سے پہلے اس کے باپ نے سب سے پہلے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے اندر کے آدمی کو پڑھنا چاہا۔ لیکن اب عبید کی آنکھوں کی چمک پھر اس کی

مکاری کے بادلوں میں چھپ چکی تھی۔ باپ نے پھر اپنے غم کو ضبط کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"اس وقت تم نے مذہب اور فلسفے کا بڑا بنیادی سوال اٹھایا ہے۔ مختلف مذاہب اور فلسفوں میں خدا کے متعلق مختلف تصورات ہیں۔ اس وقت مجھے ان سے کوئی غرض نہیں ہمیں تو غرض اس وقت اس سے ہے جو اسلام نے ہمیں دیا۔ اور جس نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی روح کو متاثر کیا ہمارے نزدیک خدا قادر مطلق ہے جو اس کائنات کے مسائل سے الگ ہو کر ایک تماشائی کی حیثیت سے ان کا مطالعہ نہیں کر رہا نہ ہی وہ ان اصولوں کی جبریت میں مقید ہے جو کائنات کے لئے اس نے بنائے ہیں۔ نہ وہ کسی خاص قوم اور خاص نسل کا جانبدار ہے وہ سارے انسانوں سے محبت کرتا ہے وہ رب العالمین ہے۔ اس کی مدد کے تصور پر بھی تم ذرا غور کرو۔ مدد کے بھی مختلف تصورات ہیں۔ ایک تصور یہ ہے کہ کسی کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے مسائل حل کرے۔ ایسے مواقع فراہم کئے جائیں' جو ضرورت مند کے کام آئیں اور تیسرا تصور وہ ہے جو تمہارے ذہن میں جاگزیں ہے کہ پریوں کی کہانیوں کے کرداروں کی طرح دیو اور جنات شہزادوں کی ضروریات پوری کردیا کرتے دراصل خدا سے اسی قسم کی مدد تم بھی چاہتے ہو کہ تمہیں پکی پکائی مل جائے۔ اس روشنی میں تم خود اپنی مدد کے تصور پر غور کرو کیا تم کاہل اور خودغرض نظر نہیں آتے؟ تم خدا کے صرف اس وقت احسان مند ہونا چاہتے ہو جب وہ تمہاری خواہش اور ارادے کے وجود میں آتے ہی تمہاری ضروریات مہیا کردے۔ سوچو تمہارے لئے جب ہر چیز خدا نے پوری کردی تو اس دنیا میں تم صرف چرنے کے لئے آئے ہو؟

آخر اس دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ کہ دوسرے شکار کریں اور وہ گیدڑ کی طرح کھائیں یا ہر چیز تیار کر کے آسمان سے اس کے لئے بھیج دی جائے۔ آخر جب زندگی اس طرح گزرے تو آدمی پھر کیا بن جائے گا تم مجھ سے بہتر دین کو جانتے ہو کہ اسلام ایک جدوجہد کا دین ہے اس کے پیش نظر اس زمینی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اس نے زندگی سے محبت کرنا سکھایا ہے اور اسی محبت کے ذریعے وہ اسے نکھارنا اور سنوارنا چاہتا ہے۔

یقیناً خدا اس قوم اور فرد کی حالت نہیں بدلتا جو خود پہلے اسے بدلنے کی کوشش نہ کرے' اسلام کو حرکت عزیز ہے۔ حرکت کی سمت اگر صحیح ہے تو اس میں برکت ہے۔

اور میں تو یہ اور کہوں کہ نہ مذہب اسلام بلکہ دنیا کا کوئی فلسفہ حتیٰ کہ کمیونزم بغیر محنت اور جدوجہد کے آپ کو کوئی چیز محض اس بناء پر نہیں دے سکتا کہ اب آپ کمیونسٹ ہیں اس لئے جو چاہے وہ لے لیں اسی طرح اسلام پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں کہ اب خدا آپ کی ہر ضرورت کا ذمہ دار ہے آپ صرف ضرورت کا اظہار کردیں۔ بلکہ اسلام ایمان کے بعد عمل کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اس لئے ایمان کے بعد عمل اور جدوجہد مل کر اس دنیا میں کچھ کرکے دکھاتے ہیں"۔

عبید خاموش رہا اس وقت اپنی غلطی کا اسے شدید احساس ہوا کہ جذبات میں آکر اس نے اپنی اصل کو کیوں ظاہر کردیا' پھر اسے اپنے باپ سے بھی خوف آنے لگا کیونکہ وہ اسے بچپن سے جانتا تھا کہ اس نے اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود جب اسلام اور دنیا کا سوال آیا تو اس نے ہمیشہ اسلام کی خاطر دنیا کی طرف سے منہ موڑ لیا' اپنی غلطی کے احساس کے تحت وہ کانپنے لگا۔ جب اس سے بغیر کچھ کہے اس کا باپ دسترخوان سے اٹھ کر گھر کے باہر چلا گیا تو وہ خوف میں بدحواس ہوگیا کہ کہیں وہ میرے خیالات کو ملتان جاکر شیخ الجامعہ اور نگراں صاحب کے سامنے نہ رکھ دے۔ اس وقت کی بدحواسی کے تحت وہ خود پر ملامت کرنے لگا اور بغیر کچھ سوچے باپ کے پاس پہنچ کر روہانسا ہوکر کہنے لگا۔

"مجھے معاف کیجئے۔ بعض مرتبہ میں پاگل ہو جاتا ہوں۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے' گھر سے دور رہ کر تنہائی میں بعض مرتبہ میری عجیب سے حالت ہو جاتی ہے"۔

باپ نے اس کی طرف پھر دیکھا۔ اس وقت واقعی غلطی کا احساس اس پر طاری تھا خود ملامتی اور خوف نے اس کی آنکھوں کو مطلع کی طرح صاف کردیا تھا۔ باپ کو اس وقت بچپن کا عبید نظر آنے لگا۔ اور اس طرح اس کی مکاری نے اسے پھر خطروں سے بچا لیا۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹا تو اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ نمازوں میں باقاعدگی تلاوت قرآن اور دینی رنگ کو لوگوں کو دکھانے کے لئے خود پر طاری کرے اس مختصر سی مدت کو عافیت میں گزار دے جو مصر جانے میں باقی ہے۔

اس منافقت آمیز احتیاط کی موجودگی میں اس کا سارا مزہ کرکرا ہوکر رہ گیا تھا۔ اب یہ

قصبہ اسے کاٹنے لگا۔ آخر بڑے دنوں کے انتظار کے بعد اسے نگراں صاحب کا خط ملا جس میں اس سے کراچی پہنچنے کے لئے کہا گیا۔ رات کھانے پر پھر والد صاحب سے ملاقات ہوئی بڑے ادب سے عبید نے ان کے سامنے خط رکھا انہوں نے اس کو پڑھا۔ ماں دونوں باپ بیٹوں کی طرف تشویش سے دیکھتی رہی کہ آخر اسے بھی تو بتایا جائے کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ والد صاحب نے جب خط پڑھ کر واپس عبید کو دیا تو پھر وہ بے قرار ہو گئی اور ان سے مخاطب ہوئی۔ آخر مجھے بھی تو بتاؤ خط میں کیا لکھا ہے آخر یہ میرا بھی تو بیٹا ہے۔

"ہاں ہاں یہ سب جانتے ہیں کہ یہ تمہارا بیٹا ہے' لیکن اب یہ کراچی جا رہا ہے۔" باپ نے ذرا مسکرا کر کہا۔

"کراچی کیوں؟ مصر کیوں نہیں؟" ماں نے پھر اضطراب سے سوال کیا۔

"میرے خیال میں دفتری خانہ پری کا قصہ ہو گا۔" اس مرتبہ عبید نے جواب دیا۔

"تو کب؟" اماں نے پھر سوال کیا۔

بیٹے کی جدائی کے احساس سے ماں پھر افسردہ ہو گئی اور اس سے اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔

اسٹیشن پر باپ اس کے ساتھ آیا ماں دروازے پر کھڑی روتی رہی جب یہ دونوں ایک گھنے پیڑ کے اوٹ میں آئے تو پھر وہ دروازے سے باہر آ کر ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

ابھی وہ ٹرین میں تھا کہ کراچی کے مضافات کی پھیلی ہوئی جدید وضع کی بستیوں نے اس کے رہن سہن کے تصور میں روحانی پیاس گھول دی اس تصور کی زد میں آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ بھی کسی خوبصورت عورت کے ساتھ ایسے کسی مکان میں رہے لیکن وہاں پہنچ کر اس شہر کی مصروف اور ایک دوسرے سے بیگانہ زندگی نے اس کے احساس کو اس کے اندر دفن کر دیا یہاں تو کسی عورت نے بھی نظر بھر کر اسے نہ دیکھا۔

اس شہر میں دفتروں کے چکر کاٹنے کے بعد جو وقت اور طاقت اس کے پاس بچتی تو وہ تھوڑی سی دیر بس میں اور تھوڑی سی دیر ٹرام میں بیٹھ کر کیماڑی پہنچ کر خود کو بے کراں

سمندر کی وسعت کی نذر کردیتا۔ زندگی میں سمندر کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ لیکن اب وہ خود اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کے پانی کو اپنے ہاتھ سے چھو سکے ایک دن وہ خود کشتی میں بیٹھا اپنے چلو میں سمندر کا پانی لیا تھوڑی دیر اسے دیکھ کر اسے چکھا اور باقی جو بچا وہ پھر سمندر کے سپرد کردیا وہ کشتی میں بیٹھا منوڑہ جارہا تھا کہ دور افق کے کنارے جہاز کھڑے دھواں الگ رہے تھے۔ ان کی روشنیاں آنکھوں کی طرح جھپکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں لہروں نے الگ طوفان مچا رکھا تھا کبھی کبھی وہ اس کی کشتی کو بھی چھو جاتیں اور پانی کے چھینٹوں کو کھا کر سب کشتی کے مسافر قہقہہ مار کر ہنستے تو ہنسی اسے بھی آجاتی۔ منوڑہ پہنچ کر وہ لوگوں کے ساتھ ساحل کی طرف جانے والی تنگ گلی میں تو لوگوں کے ساتھ ضرور گزرتا لیکن جب اسے سمندر کا ساحل نظر آتا تو وہ لوگوں سے الگ ہو جاتا اور ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر لہروں کا تعاقب کرتا رہتا لہروں کے اس تعاقب سے اسے بڑا مزا آتا۔ پھر ان ہی لہروں کے سامنے وہ اپنی پوری زندگی لے بیٹھتا' ہر واقعہ' ہر حادثے اور ہر شخصیت کو معنی پہنانے کی کوشش کرتا جو اس وقت اسے یاد آتے۔

اس وقت سمندر کی قربت میں اسے بڑا جذباتی سہارا مل گیا تھا اس کے پاس کسی کے لئے دوستی کے جذبات تھے تو صرف اس بحرہ عرب سے۔ اس کی لہروں نے ابھر کر دب کر اس کے اندر اس کی تمناؤں کو پھر جگا کر ان کی تربیت کر ڈالی۔ اس کے تخیل نے اس تربیت کے اعتماد کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ سمندر کو وہ رات کی تاریکی میں بھی دیکھتا۔ موجودہ کامیابی نے جو اسے تھوڑی سی خوشی دی تھی اس سے واقعی مزا آگیا۔ یہ مزہ ایک لکیر کی طرح اس کے دل پر کھنچ کر رہ گیا۔ سمندر کے کنارے وہ مزا بھی اسے یاد آیا تو لطف کو ایک گدگدی کی طرح محسوس کرکے اسے ہنسی آگئی۔ موجودہ کامیابی نے اعتماد کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خودسری بھی اس کے اندر پیدا کردی تھی۔ جس لمحے یہ دونوں چیزیں اس کے اندر جمع ہو جاتیں تو پھر مفلسی کا احساس اسے زیادہ دکھ نہ پہنچاتا۔ سمندر سے جب وہ اپنی قیامگاہ کی طرف جارہا تھا تو اسی تصور میں غلطاں تھا اور اپنے ماضی نہیں حال اور مستقبل میں کودتا پھاندتا پھر رہا تھا۔

کراچی میں وہ صرف چند روز رہا۔ سوائے سمندر کے یہاں کی کسی چیز سے اس کی طبیعت خوش نہ ہوئی۔ اس لئے جس دن دفتروں کے چکر سے اسے فراغت ملی اس دن وہ

ٹکٹ کٹا کر نگراں صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے ٹرین میں سوار ہو گیا اور نگراں صاحب کی کوٹھی میں آداب بجا لایا۔

ملتان آکر اس نے پھر زندگی محسوس کی یہاں کتنے لوگ تھے جو اسے جانتے اور پہچانتے تھے۔ خصوصا" دارالعلوم کے طلباء کی احترام آمیز مرعوبیت میں اسے بڑا لطف آیا اب تو یہ مرعوبیت اور بڑھ گئی تھی وہ ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے اسے بار بار یاد دلاتے کہ وہ اس مدرسے اور ان طلباء کو نہ بھولے۔

پہلے دن مصر پہنچ کر خط لکھنے کی انہوں نے فرمائش کی تو دوسرے دن بازار سے طلباء کے پتے لکھنے کے لئے ایک خوبصورت سی ڈائری لے آیا۔

اب جو اس سے مطالبہ کرتا اس کا نام اور پتہ (محض دل رکھنے کے لئے) اس میں لکھ لیتا۔ حالانکہ ان کا نام لکھتے ہوئے بھی وہ ایک ناگوار بوجھ اپنے اوپر محسوس کرتا۔ لیکن اب اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ کامیاب زندگی کے لئے بہت سی ایسی چیزیں اور عادتیں گوارہ کرنا پڑتی ہیں جو آگے بڑھنے میں مد ثابت ہوں۔

اس منافقت کے علاوہ زمانے کو دیکھتے ہوئے (اپنی ضرورتوں کے پیش نظر) اس نے اپنے اندر کچھ اور چیزیں بھی داخل کرلی تھیں' جو طبعا" اسے ناپسند تھیں لیکن کام نکالنے کے لئے وہ زندگی میں کار آمد ضرور تھیں۔ اپنی ضروریات اور طبیعت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے اپنا ایک ذاتی فلسفہ بھی وضع کیا تھا' جس میں آس پاس کے سارے ازم' دین' مذہب و فلسفہ اس کے نزدیک اوپر جانے کی سیڑھیاں تھیں اور بعض مرتبہ تو وہ انہیں اپنا لباس تصور کرتا۔ جو ایک طرف اس کی حفاظت کرے اور دوسری طرف سجاوٹ۔ اس کے علاوہ زندگی کو دوسرے معنی پہنانے والی باتیں اس کے نزدیک محض بکواس اور شکست کھائے ہوئے لوگوں کی آواز۔

اس زمانے کا مصر جب جمال عبدالناصر کے اقتدار کی جوانی کے دن تھے' مصری عرب قومیت جس کی ابتداء' فرعونیت کی مدح سرائی سے شروع ہو کر روحانی سوشلزم میں' اس طرح آکر ڈوب گئی تھی جیسے دور سے کودتا پھاندتا ہوا دریا خود کو سمندر میں غرق کرکے اپنی انفرادیت کو کھو دے۔ مغرب کا صدیوں کا استحصال اور اقتدار' دوسری طرف یہودیوں کے حملوں کا عربوں کو بے دست و پا بنا دینا۔

ان حادثوں نے عربوں کو دہشت زدہ کر کے کمیونزم میں پناہ لینے پر مجبور کردیا تھا۔ لیکن یہ تو عربوں کے ناتجربے کار جذباتی دانشوروں کا رویہ تھا۔ لیکن عرب عوام، مغرب کی لوٹ کھسوٹ یہودیوں کے حملوں کی ہتک ان کے اپنے شیوخ کے عیش پرور اعمال یہ سب مل کر ان پر ایک عذاب کی طرح مسلط تھے۔

ایک طرف وہ بے آبرو بن کر بھوکے مر رہے تھے۔ دوسری طرف یہ شیوخ بیسویں صدی کی الف لیلیٰ کی فضاء اپنے محلوں میں قائم کئے ہوئے تھے اور عوام اور زمانے کی ضرورتوں کی طرف سے انہوں نے پیٹھ کرلی تھی۔ عبید نے قاہرہ کے چند ماہ کے قیام میں عالم عرب کو پڑھ لیا تھا جس سے اسے مایوسی ہوئی پھر اسے اپنی محرومیاں اور ارمان یاد آئے، تو مارکس ازم اور زندگی سے اس نے جو کچھ سیکھا تھا۔ اب اسے صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنے لگا اور اس مارکسیت کی تربیت کی ہوئی جدوجہد کا ثمرہ اسے یہ ملا کہ وہ مصر کے ریڈیو اسٹیشن پر کچھ پروگراموں میں حصہ لے کر زوردار اشتراکی نعروں سے اپنے فیچر بھرنے لگا۔ جس نے انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے سے زیادہ اس کے حق میں کام کیا۔

قاہرہ کی زندگی اوپر سے تو اسے مغربی نظر آتی۔ لیکن اس کے اندر جو کچھ تھا وہ پاکستان سے اسے مختلف نظر نہ آیا۔ عوام اور خواص کی ذہنیت اور اخلاقی سطح بڑی پست تھی۔ بغیر رشوت کے یہاں بھی کام نہ چلتا تھا۔ اور یہ رشوت دیمک کی طرح الازہر کو بھی چاٹ رہی تھی اس دینی ادارے میں بھی کوئی مشکل پیش ہوتی تو اسے بھی کچھ نذر کئے بغیر حل نہیں کیا جاتا۔ لوگ اپنے معمولی معمولی مفاد کے لئے خدا اور نبی کی اولاد کی قسمیں کھا کر اپنا کام نکالتے۔ لیکن مسلمانوں کے اس معاشرے میں اس پستی کو دیکھ کر اسے کوئی دکھ نہیں ہوا بلکہ اس کو دیکھ کر اس کا یقین اور پکا ہوگیا۔

حکومت کا وظیفہ اور نشرگاہ سے کچھ معاوضہ اس کے لئے اتنا تھا۔ جس سے وہ زیادہ تنگی محسوس نہ کرتا۔ دوسری نعمت اسے جو مصر میں ملی تھی وہ تھی آزادی اور معاشی آسودگی۔ ان دونوں نے مل کر سب سے پہلے اسے شراب کی طرف متوجہ کیا۔ اب اپنے افلاس زدہ ماضی کا تصور اس کے اندر قدرے دھندلا پڑتا جارہا تھا۔ اس کے گھر اور دینیات کے مدرسے کی تربیت نے جو اس کے کردار میں ایک پلاسٹر کی حیثیت اختیار کرلی

تھی۔ اس عیش نے اب اسے بھی کافی کھرچ کر صاف کردیا تھا وہاں ظاہرداری کی خاطر صوم و صلوٰۃ کا پابند رہنا پڑتا جو پہلے ناگوار اور بعد میں اذیت ناک بن گیا تھا۔ لیکن یہاں الازہر میں ان چیزوں کے متعلق کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا۔

مدینہ البوث میں اگر کسی چیز کی فکر تھی تو یہ کہ بارہ بجے وہاں آجانا چاہئے۔

خیر اسے تو اس نے گوارہ کرلیا۔ لیکن یہ پابندی ہفتے کے آخری روز اس پر بڑی ناگوار گزرتی کیونکہ اس رات وہ نیل کے کنارے جاکر اپنے ذوق کی تسکین چاہتا۔ اسے دیکھ کر یہاں پھر کراچی کا سمندر یاد آیا تو وہ ساحل کے قریب پہنچ کر پانی کے ہلکوروں سے ایسا ہی اس وقت انبساط محسوس کرتا جیسے اس کے اندر کسی چیز کی صورت گری ہو رہی ہے۔ بعض مرتبہ تو اس صورت گری کے ارتعاش سے شدید قسم کا جنسی ہیجان محسوس کرتا تو اسے پھر عورت یاد آتی تو وہاں سے اٹھ کر قاہرہ کے پررونق بازاروں میں گھومتا رہتا اور نوجوان بھاری جسم والی مصری لڑکیوں کی ننگی پنڈلیوں کا نظارہ کرتا رہتا' جو لو کے تیز جھونکے کی طرح اسے جذباتی طور پر جھلسا کر گزر جاتیں۔

صبح آٹھ بجے وہ سو کر اٹھتا کچھ دیر بستر پر انگڑائیاں لیتا رہتا جب کافی کی طلب محسوس ہوتی تو پھر اسے بستر سے اٹھنا پڑتا۔ ضروریات سے فارغ ہوکر ناشتے کے لئے قریب کے ایک ریستوران میں چلا جاتا۔ وہاں سے پھر الازہر۔ وہاں پہنچتے ہوئے اس کی کلاس کا ایک آدھ گھنٹہ ضرور ختم ہو جاتا۔

جامعہ سے فراغت دوپہر کو ہوتی تو سارے دن کا تصور اس پر وبال بن جاتا اور جب رات ہوتی تو وہ پھر خود کو زندہ محسوس کرنے لگتا۔

یہ دن جو اس پر بار بن جاتا وہ اکثر ریستورانوں میں بیٹھ کر گزارتا یہ ریستوران عموماً الازہر کے اردگرد ہوتے جہاں شہر کی مفلوک الحال آبادی خودرو جنگل کی طرح پھیلی ہوئی نظر آتی۔ یہ زندگی بھی پسماندگی اور تعفن سے بھری ہوئی تھی۔ جس کا تجربہ اسے پاکستان میں ہوچکا تھا یہ مدقوق لوگ دھول اور اونٹوں کی لید سے ملی ہوئی گرد۔ اس پر اگر بارش ہو جائے تو ایک مصیبت۔ ان مفلسوں کی دنیا جہاں غربی' منشیات' جو الغرض وہ تمام جسم اور روح کی بیماریاں جو قرنوں سے غریبوں کے ساتھ جونکوں کی طرح چمٹی ہوئی ہیں۔ یہ سارے غریب لوگ وہاں الازہر کے نگراں بن کر ان ساری ضروریات کے لئے دن گزار

رہے تھے۔ جو انہیں صدیوں سے برباد کر رہی تھیں۔

عبید بھی یہاں ذہنی طور سے اس ماحول سے الگ ہو کر ان لڑکیوں کی تلاش میں رہتا جو مفلسی کی وجہ سے یہاں اپنا جسم بیچنے آتیں۔ اسے گداز جسم والی عورت بہت پسند تھی جس کا جسم مور کے پنکھ کی طرح پھیلا ہوا ہو۔ جب ایسی نوجوان لڑکی اسے وہاں نظر آتی تو ریستوران سے اٹھ کر اس کا پیچھا شروع کردیتا۔ اگر اس سے معاملہ طے ہو جاتا تو قریب کے قبرستان میں کسی مزار سے ملحق حجرے میں اس کے ساتھ منہ کالا کرتا۔ اس کے بعد شدید ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتا۔ دوران مباشرت اس لڑکی کے چہرے پر اس کے لئے کوئی چاہت نہ ہوتی بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا ہوا کہ کسی لڑکی نے ایسے موقعہ پر اپنا جسم اس کے سپرد کرکے کپڑے سے اپنا منہ چھپا لیا تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا' اس قسم کے حادثے کے بعد ہفتوں کسی خوبصورت صحت مند لڑکی کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہ ہوتی۔ طرح طرح کے وسوسے اسے کچوکے دیتے رہتے' کبھی اسے اپنی مردانگی پر شبہ ہونے لگتا۔ اور کبھی اپنی شخصیت کا تصور لے کر بیٹھ جاتا اور سوچتا کہ میری شخصیت میں اتنی دلکشی بھی نہیں جو کسی عورت کو میری طرف متوجہ کرسکے۔ آخر ابھی تو میں جوان ہوں اس سوال کو لے کر پھر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا جائزہ لیتا تو اس کے آئینے میں اس کی خوفناک آنکھیں جو منافقت کی مسکراہٹ کے بار سے پتھرا سی گئی تھیں اسے بڑی ناگوار گزرتی۔ پھر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آلو جیسی ناک پر ہاتھ رکھتا تو اسے اپنی دوسری کمی کا احساس ہوتا۔ وہ غم زدہ ہو کر آئینے کے سامنے سے ہٹتا تو پھر اپنا قدرے پستہ قد اور دبلے پن کا احساس ہوتا۔ اور بستر پر جاکر دھڑام سے گر پڑتا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد جب بار بار اسے اپنی غیر معمولی ذہانت اور کامیابیوں کا خیال آتا تو اپنی ذات پر اسے پھر اعتماد ہونے لگتا۔ اور وہ طے کرتا کہ اب وہ اپنے پیسوں کے زور پر نہیں بلکہ اپنی صفات کے زور پر عورت کو حاصل کرے گا۔ لیکن قاہرہ میں اس کی وہ حیثیت ایسی کب تھی جہاں وہ اوپر کے طبقے کی حسین عورتوں میں اپنے جوہر دکھاتا۔ ابھی تک تو وہ اپنے عربی لب و لہجے کی اجنبیت تک کو دور نہ کرسکا تھا۔ اپنی اس مجبوری کا خیال کرتے ہی پھر اسے طبقاتی احساس کمتری آکر دبوچ لیتی۔ جو بچپن سے اس کے ساتھ سائے کی طرح تھی پھر وہ سوچتا اپنے ارادوں تدبیروں اور جدوجہد سے میں اپنی کس کس کمی کو پورا کروں۔ آخر میں اس مفلس

دیندار کے گھر کیوں پیدا ہوگیا۔ ان دنوں وہ آسودہ تھا اس آسودگی میں طرح طرح کے مزے بھی کرتا لیکن یہ طبقاتی احساس کمتری کے اندر اب ایک ایسے درد کی مانند ہو گئی تھی جس کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا' بس جب یہ احساس اس پر سوار ہوتا سوائے سر پھوڑنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

عیش شراب اور زناکاری نے تلون کی رفتار کو بھی اس کے اندر خاصہ تیز کردیا تھا۔ جس کی وجہ سے کوئی مزا' کوئی مقام' کوئی آدمی زیادہ دیر اس کے اندر نہ ٹھہرپاتا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ جب وہ کسی لذت کے مزے میں چور ہوتا اس وقت یہ طبقاتی احساس کمتری جب درد بن کر اٹھتا تو سارا مزہ کافور ہو جاتا اور اپنے وجود کی نفی محسوس کرنے لگتا۔ اس وقت وہ اپنے آپے سے باہر ہو جاتا۔ اور کوئی فارغ البال مخاطب ہوتا تو اس پر جنگلی جانور کی طرح حملہ کرنے کی سوچتا تاکہ اپنے وجود کی نفی کے ساتھ وہ اپنی طاقت سے اس کی بھی نفی کردے۔ بچپن میں تو یہ احساس اس کے پاس ایک ننگے تجربے کی طرح تھا جو غصے اور حسد کی طرح اس کے اندر خون کے ساتھ گردش کرتا۔ بعد میں مارکس ازم نے اسے ذرا تعلیم یافتہ بنا دیا تھا لیکن مجبور وہ اس وقت بھی تھا اور مجبور یہاں بھی' اس لئے قاہرہ میں اپنی حیثیت کا خیال کرکے اسے بھی ضبط کرلیتا۔ کیونکہ اس قسم کے ضبط کی اس کے اندر بڑی گنجائش تھی۔

مصر کے قیام کے زمانے میں دو عناصر اس کے اندر بڑے قوی ہو گئے تھے پہلا اس کے دل کی امنگ' دوسرا تھوڑی سی تربیت جو خود اس کے مزاج کی پابند تھی۔ اس لئے جب اس کے اندر ایک ساتھ کئی ارمان اور تمنائیں جمع ہو جاتیں تو وہ ان سب کو آپس میں اپنے اندر ٹکراتا رہتا جو سب سے قوی ہوتی اسے اپنے ارادے کے سپرد کردیتا ویسے اسے اپنی ساری تمنائیں اور ارادے عزیز تھے' لیکن مہم پر مہم سر کرنے کے باوجود وہ خالی خالی سا رہنے لگا اور جب یہ خالی پن بھی اس کے اندر طول کھینچتا تو پھر وہ کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے اندر سے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو اور تنہائی سے ڈر کر وہ پھر لوگوں میں آجاتا۔

(لندن۔ ۱۹۷۴ء)

چشمِ پُرنم بھی نہ تھی

جہاں وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا وہ بڑا شاداب علاقہ تھا یہاں کہرزدہ پرانی عمارتوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ اس پورے علاقے کو بنگلوں سے سجایا گیا تھا اور ان کے عقب میں گھنے پیڑوں کی ایک باڑ تھی جو دور سے اس علاقہ پر جھالر کی طرح نظر آتی' ان بنگلوں کے اردگرد صاف ستھری خاموش سڑکیں پھولوں کی کلیوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں ان چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے متصل جو فٹ پاتھ تھی اس پر خوبصورت Plane کے درخت سر اٹھائے جھومتے رہتے' فٹ پاتھ پر ان درختوں کی قطار دور تک لکیر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آتی۔ بنگلوں اور ان رنگ و سجاوٹ میں بھی یہاں کے رہنے والوں نے اپنے اپنے ذوق اور آسودگی کا اظہار کیا تھا۔ تقریباً" ہر بنگلے کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے' کسی من چلے نے تو کسی اینٹیک شاپ سے کوئی پرانا مجسمہ خرید کر اپنے گھر کے دروازے کے قریب رکھ دیا تھا۔ لیکن جب گرمیوں کا زمانہ آتا تو ان بنگلوں کے دامن میں پھیلے ہوئے باغیچوں میں رنگ برنگ پھول جھومنے لگتے۔ ڈرائنگ روم پر نہایت باریک نائلون کے پردے ٹانگ دیئے جاتے تاکہ راہ گیر فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے اس کمرے میں پڑے ہوئے قیمتی قالین' نیلی دیوار پر آویزاں تصویریں اور کتابوں کے شیلف کو دیکھتے جائیں۔ گرمیوں کے زمانے میں دن کا اجالا رات کے دس بجے تک رہتا۔ جب رات ہوتی تو ان

کمروں میں بجلی کی دھیمی روشنی پھیل جاتی اور یہ چھوٹی سی دنیا ذرا فاصلے سے بڑی دلفریب نظر آتی۔ لیکن یہاں آدمی اور آدمی کے درمیان فاصلے بڑے طویل تھے۔ جو بعض کیا اکثریت کے یہاں زندگی بھر کم نہ ہوئے اور جہاں یہ فاصلے کم بھی ہو جاتے تو یہاں کے رہنے والے ایک دوسرے سے چوکنا سے رہتے۔ لیکن اس ملی جلی ہوشیاری اور بے اعتمادی کے باوجود یہاں کے ہر آدمی میں دوسرے آدمی کو متاثر کرنے کی شدید خواہش موجود تھی۔ اکثریت اپنے مادی تصرفات' آسودگی' نفاست اور نخوت کو بڑے طمطراق سے پیش کرتے۔ تنہائی کے شدید احساس نے ان کے چہروں کو مرجھا کر رکھ دیا تھا اور ان چہروں پر دل کی خوشی تو کبھی کبھی ایسے ہی چمکتی جیسے یہاں کے آسمان پر سورج۔

جس بنگلے میں عبید رہتا تھا اس کے دائیں طرف ایک ڈاکٹر بائیں طرف ایک فیکٹری کا مالک' جن کی کاریں رات کے وقت روشنی میں چمکا کرتیں لیکن مہمانوں کی صورتیں تو شاذونادر ہی نظر آتیں سالوں پڑوسیوں کی طرح رہتے ہوئے یہاں کوئی کسی کو جاننے کی کوشش نہ کرتا۔

عبید سے متصل جو دوسرا کمرہ تھا اس میں ایک اطالوی ویٹر رہتا' نیچے کی منزل میں ایک اسپین کا شادی شدہ جوڑا اور ایک پاکستانی' ان سب کو رہتے ہوئے ایک عرصہ ہوچکا تھا' لیکن ہر آدمی ایک دوسرے سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتا اور اگر کبھی اتفاق سے کسی کی دوسرے سے مڈبھیڑ ہو بھی جاتی تو یہ پڑوسی پہلے ایک دوسرے سے نظر بچانے کی کوشش کرتے' اتفاق سے ان کی آپس میں نظریں مل بھی جاتیں تو معاشرتی آداب سے مجبور ہوکر مسکرا ضرور دیتے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں بھی وہ کفایت شعاری سے کام لیتے۔

عبید ویسے تو خود نخوت اور علیحدگی کے احساس سے ہروقت مسلح رہتا۔ لیکن کبھی کبھی اس احتیاط میں چوک بھی ہو جاتی تو دوسرے کی نخوت اسے جھلسا کر چلی جاتی۔ اس چوٹ کو کھاتے ہی وہ آپے سے باہر ہو جاتا ردعمل کے طور پر وہ نظریں دوسری طرف پھیر لیتا۔ اس وقت اس کی گردن میں تھوڑی سی اکڑ کے ساتھ اس کے نتھنے بھی پھول جاتے اور اس احساس کو اپنے ذہن سے جھٹک کر پھینکنے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ لوگوں سے تعلقات میں وہ اپنے پرانے اصول کا قائل تھا۔ جس کے سہارے وہ اپنے قصبے سے لندن تک آیا

تھا اور وہ اصول یہ تھا کہ تعلقات اس سے رکھے جائیں جس سے کوئی فائدہ ہو یا اس شخص کا سوسائٹی میں کوئی مقام ہو جسے وقت اور ضرورت پر استعمال کیا جا سکے' اس معیار پر اس کے پڑوسیوں میں سے کوئی بھی پورا نہ اترتا تھا۔ جو پاکستانی تھا وہ پہلے فیکٹری میں مزدور تھا لیکن اب اسے حکومت کی پالیسی کے تحت ایک نیم سرکاری دفتر میں چھوٹی موٹی کلرکی کی ملازمت مل گئی تھی' جسے وہ دوستوں میں اپنے ذاتی تعارف میں سول سروس کا نام دیتا۔ رہے اطالوی اور اسپین والا وہ بھی ایک ہوٹل میں بیرے تھے۔ آخر ان سب لوگوں کی یہاں کے معاشرے میں کیا حیثیت تھی۔ عبید سوچتا کہ بالفرض اگر ان سے کوئی کام بھی نہ نکلے لیکن سوسائٹی میں ان سے تعلق ظاہر کرکے کون اس کے مرتبے اور ذوق کی داد دے گا۔ علم اور تنخواہ کے اعتبار سے وہ ان سب سے اونچا تھا۔

یہ تو اس کے جذبات کا دھارا تھا جو گندے نالے کی طرح اس کے اندر بہتا رہتا لیکن اس کا ذہن اور ذوق بالکل دوسرے سمت کی طرف تھے۔ اخبارات دیکھنا برطانوی معاشرے میں ایک طرح سے ضروریات زندگی میں شامل ہے۔ اس لئے اخبار وہ بھی دیکھتا لیکن اخبارات کی ان خبروں میں سب سے پہلے ان خبروں کو جو ترقی پسند اور رجعت پسند طاقتوں یا ان کے ٹکراؤ سے متعلق ہوتیں انہیں پڑھتا۔ اس کے بعد وہ اخبار میں پاکستان سے متعلق خبریں تلاش کرتا کہ وہاں ترقی پسند طاقتوں کا کیا حال ہے اور ملا کتنا کمزور پڑا ہے اس تلاش کے بعد جو وقت بچتا وہ لندن کی ڈائری اور عورتوں کے فیشن سے متعلق جو تصاویر اور مضمون ہوتے اسے پڑھتا تاکہ ریستوران میں اس مطالعہ سے مدد ملے اور تبادلہ خیال میں اسے کوئی جاہل یا لاعلم تصور نہ کرے' رہا اس کا مارکس ازم جس سے زندگی میں اس نے کچھ کام لیا تھا یہاں آکر کند چھری کی طرح ہو کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی ریستوران کے مباحثوں میں اس نے مارکس ازم سے جانبداری کا اظہار بھی کیا تو اسے محسوس ہوا کہ لوگوں میں وہ اور بھی اجنبی بن گیا اور پھر لندن میں مارکس ازم پر اس کے خیالات سے کس کو دلچسپی تھی' اور یوں بھی اوپیر لڑکیوں سے تعلق پیدا کرنے میں ماکس ازم نہیں بلکہ لندن کے کلبوں کے نام' لذیز کھانے' کاروں کے نئے ڈیزائن' نئے نئے ملکوں کے حالات اور خود پاکستان اور ہندوستان کے رسم و رواج ایسے موضوعات تھے جن پر اوپیر لڑکیاں گھنٹوں بیٹھ کر اس کی باتیں سن سکتی تھیں۔

لندن میں وہ جس قسم کی زندگی ان دنوں گزار رہا تھا اس میں عورت سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ اس پر بری طرح سوار تھا کیونکہ اب وہ ۳۵ کے لگ بھگ تھا اور اس لطف اندوزی کے ساتھ اسے اس کا بھی شدید احساس تھا کہ اب اس کا قدم بڑھاپے کی طرف بڑھ رہا ہے اس لئے اس لذت کو وہ ارمان کی طرح اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہتا تھا وہ ہمیشہ صحت مند خوبصورت لڑکیوں کی قربت کا آرزومند رہتا۔ لیکن عورت کی اس طلب اور جدوجہد نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا ویسے تو سات سمندر پار والوں کے نزدیک یورپ پانی کا سمندر نہیں بلکہ خوبصورت سنہری بالوں والی لڑکیوں کا سمندر ہے لیکن ان خوبصورت لڑکیوں پر گرفت مضبوط رکھنا بڑا مشکل ہے۔ تلون' من کی موج' آزادی' یورپ کی جدید عورت کی یہی تو اہم خصوصیات ہیں۔ عبید کو پہلے تو ان حسینوں کو سمجھنے میں وقت لگا۔ اس کے بعد جو وقت بچا وہ ان سے تعلقات پیدا کرنے کی تیکنیک کے وضع کرنے میں صرف ہوا۔ بار بار کے تجربوں میں جب اس کی تیکنیک کی دھار تیز ہوئی تو پھر اس کی تربیت اس کی عاشقی کے آڑے آئی۔ تھوڑا سا حجاب اور جھجک جو مشرقیت اور دیندار ماحول سے اس کے کردار میں سرایت کر گئی تھی' عاشقی کے دوران یہ تربیت میکانکی طور پر اس کے رویئے کو متاثر کرتی رہتی' جس سے بدحواس ہو کر وہ خود سے بیزار ہونے لگتا اور سوچتا کہ اب جبکہ اس مشرقیت اور دینداری سے میرا کوئی تعلق نہیں تو پھر میرے اندر یہ طاقتور کیوں ہے؟ اس کی عاشقی کو متاثر کرنے والی دوسری چیز اس کی مارکسیت تھی جس کی اس کے ذہن اور جذبات پر مضبوط گرفت تھی اس لئے لڑکیوں کے سامنے تبادلہ خیال میں بات کہیں سے شروع ہوتی وہ اسے سیاست پر لاکر اس کا جدلیاتی تجزیہ کرتا رہتا۔ خیر مجلسی آداب کے طور پر تو اس گرم جوشی سے تھوڑا سا لطف لے لیا جاتا لیکن جب یہ جدلیت شیطان کی آنت کی طرح ان لڑکیوں کے سامنے پھیل جاتی تو وہ اس سے بور ہو جاتیں کیونکہ آج یورپ میں اس قسم کی نوجوان لڑکیوں سے عاشقی کرنے کے لئے سیاست پر گفتگو کا مطلب ان کی شہوت کا نشہ اتارنے کے مترادف ہے' لیکن عبید بھی کیا کرتا وہ بھی اپنی عادت اور تنہائی سے مجبور تھا۔ سوائے اس عاشقی کے اب مستقبل کے لئے اس کے پاس زندگی کا کوئی نقشہ نہ تھا۔ پہلے تو عیش پرستی اور کاہلی اسے دیمک کی طرح چاٹتی رہی اب اس عاشقی کی طلب نے اس کے اندر ایک طوفان سا مچا رکھا تھا اس طوفان سے اسے

ذہنی اور جذباتی تکلفی تو اٹھانی پڑتی لیکن اس تکلیف کے ساتھ اسے زندہ رہنے کا بھی احساس ہوتا۔

اس کا فلیٹ بڑا صاف ستھرا تھا وہاں چیزیں بڑے قرینے سے رکھی ہوتی تھیں' دیواروں پر کچھ تصویریں آویزاں تھیں لیکن یہاں کی ہر چیز سے تنہائی گھٹن کی طرح اٹھ کر اس کا گلا دبانے لگتی' اس وقت اسے اپنے فلیٹ میں ایک طرح کا خوف محسوس ہوتا تو کھڑکی کھول کر باہر سڑک پر جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہتا اور کبھی کلاسیکی ریکارڈ گراموفون پر چڑھا کر بستر پر پڑ جاتا۔ دفتر میں وہ بھی ایک کلرک تھا۔ آٹھ گھنٹے وہاں چند فائلوں کی خانہ پری کرنے کے بعد سب سے زیادہ وقت خاموشی اور جمائیاں لینے میں صرف کردیتا البتہ چائے اور دوپہر کے کھانے کے اوقات میں دفتر کے دوسرے کلرکوں کے ساتھ دو چار فقروں کا تبادلہ ضرور ہو جاتا۔ ویسے خاموشی اس میس روم میں بھی اکثر چھائی رہتی۔ دفتر میں اکثریت انگریزوں کی تھی اس لئے جس دن موسم ذرا اچھا ہوتا تو لوگوں کا موڈ تبدیل ہو جاتا اور خاموشی کے بجائے وہ تبادلہ خیال کو ترجیح دیتے لیکن عبید پھر بھی خاموش رہتا اور کبھی آسمان کی طرف تکنے لگتا اگر وہ صاف ہوتا لیکن ایسے خوشگوار موقع پر اس کے دفتر کے ساتھی اسے بھی مخاطب کرکے ہنسنے اور ہنسانے والے فقرے کہہ کر اپنی فیاضی کا ثبوت دے دیتے۔

وہ دفتر ہمیشہ سوٹ پہن کر آتا۔ کبھی کسی قیمتی سوٹ میں وہ ملبوس ہوتا تو دفتر کے کلرکوں کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتیں' ان کی آنکھوں میں رعب' اچنبھا اور حسد سب ہی کچھ ہوتا لیکن جب ان کی نظریں اس وقت عبید کی نظروں سے ملتیں تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگتے' جیسے انہوں نے اسے سوٹ میں دیکھا ہی نہیں' اپنے چہرے اور آنکھوں سے تاثر کو مٹانے میں انہیں کمال حاصل تھا نظریں پھیرتے ہی ان کے چہرے اور آنکھوں میں کچھ بھی نہ رہتا۔ سب کے چہرے سپاٹ بن کر رہ جاتے۔ لندن میں رہتے ہوئے اب ایسی آنکھوں کو پڑھنا اس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا اس انسانی رویئے کی تمام جزویات ایک ایک کرکے اس کے اندر تیروں کی طرح پیوست ہو جاتیں اس پر دکھ کے ساتھ ساتھ وہ بے بسی بھی محسوس کرتا اور انہیں جاہل سمجھ کر اپنے دل کو مطمئن کرلیا کرتا' لیکن یہ رنگ کے امتیاز کی پیدا کردہ اذیت اس وقت اس کے لئے بڑی دردناک بن

جاتی جب دفتر کا ایک بوڑھا انگریز کلرک صبح چائے کے وقت اپنا اخبر کھول کر کالے تارک وطن لوگوں کے متعلق کوئی سنسنی خیز خبر سنا کر بڑے تضحیک آمیز انداز میں برطانیہ میں رہنے والے کالوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا کہ انہیں واپس جانے کے لئے پیسے دینے کی کیا ضرورت ان کے پاس دولت کی کیا کمی ہے۔ اس سیاسی تبصرے کے وقت عبید پھر اس کی طرف سے نظر پھیر کر کھڑکی سے باہر لان کو دیکھتا رہتا اور ایسا ظاہر کرتا جیسے وہ اس وقت کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اذیت تو وہ اس وقت اٹھا رہا ہوتا لیکن اس احساس کے ساتھ دو خیال اس کے ذہن میں ضرور موجود ہوتے۔ رنگ کی پیدا کردہ ذلت اس وقت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کیونکہ اس کے لئے اس نے دو فقرے پہلے ہی دریافت کر لئے تھے کہ یہ جاہل ہیں اور انسانی تاریخ میں اجنبی لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک ہوتا رہا ہے لیکن اس ہتک کا براہ راست تعلق اس وقت اس سے بھی تھا کہ دفتر میں بیٹھ کر آداب کے طور پر بھی اس بوڑھے کلرک نے اس کی موجودگی کا خیال نہ کیا۔ اس وقت اس کے زرخیز تخیل نے اسے یہ بتایا کہ اس کی انفرادی حیثیت بھی آخر یہاں کیا ہے؟ اور اس حادثے میں یہی احساس تھا جو اس کی اذیت کو اور بڑھائے دے رہا تھا۔ جب یہ اذیت اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن پھر بھی وہاں کسی نے اس سے نہ پوچھا کہ کیسے مزاج ہیں۔

بوڑھے کلرک کی اس جرات نے اسے چوکنا سا کردیا اس لئے وہ پھر اپنے آفیسر انچارج کی طرف متوجہ ہوگیا۔ یہ آفیسر ذرا ہنس مکھ آدمی تھا' مروت و انسانیت بھی بقدر ضرورت اس کے یہاں موجود تھی۔ بے انصافی اور وہ بھی رنگ کی بنا پر اسے ہمیشہ ناگوار گزرتی اور دفتر میں وہ ہمیشہ رنگدار لوگوں کا خیال رکھتا۔ دفتر میں اس کا زیادہ وقت دفتر سے متعلق کاموں میں صرف ہوتا جس کے لئے بار بار سیڑھیوں پر آتے جاتے اس کے جوتوں اور قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اس کا نام مسٹر برٹ تھا' ذرا بھاری بدن' نیلی چمکیلی آنکھیں اور سنہرے بڑے بڑے بال پیشانی پر ہمیشہ جھومر کی طرح پڑے رہتے اور کبھی ہوا سے اڑا کرتے' ایک دن جب آفس میں کوئی نہ تھا تو عبید نے اس سے میس روم کے حادثے کا ذکر کیا۔ اس نے اس پر معذرت چاہی اور کہا میں اس کا کوئی انتظام کروں گا لیکن مسٹر عبید تم اسے نہ بھولو کہ یہ ہماری بوڑھی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ عمر کسی

قسم کی تبدیلی اور اجنبیت کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اپنے آفیسر انچارج کی اس معذرت نے عبید کو اس وقت خوشی نہ کیا بلکہ علم اور آکسفورڈ کی ڈگری سے جو نخوت اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی اسے بھی زندہ کردیا۔ دفتر میں اسے آخر کیا کرنا پڑتا لیکن اس ملازمت سے جو سیکورٹی اور تھوڑی سی عزت اسے حاصل تھی' اس کی خاطر اس ملازمت کے بچانے کے لئے اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ حالات اور لوگوں کے مطالعہ سے کبھی کبھی وہ بیزار ہو جاتا اور یہ بیزاری اسے اس کے ذہن اور جسم کو بھی تھکا کر رکھ دیتی۔ لیکن زندگی گزارنے کا فن اسے آتا تھا اس لئے اس نے مسٹر برٹ کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے اخلاق اور نفسیات دونوں کو برتنا شروع کردیا۔ پڑھنے پڑھانے اور خود زندگی کو برتنے میں بہت سے ڈھنگ اور تجربے اس کے ہاتھ لگ گئے تھے اور پھر وہ خود بھی تو ایک ذہین آدمی تھا زندگی میں اپنے مفاد کی حفاظت اور لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے جو طریقے اس نے آزمائے تھے وہ مزاج کے اعتبار سے سب اخلاقی تھے لیکن لندن آکر اسے بڑی جلدی احساس ہوگیا کہ یہاں وہ لوگوں کو اخلاق سے رام نہیں کرسکتا۔ کیونکہ آدمی یہاں ہمیشہ چوکنا رہتا ہے تو پھر اس نے اخلاق کو نفسیات میں لپیٹ کر آزمایا' یہ تیکنیک کامیاب رہی لیکن اپنی ضرورت کے پیش نظر اس نے اس اخلاق اور نفسیات میں خوشامد کو چاشنی کی طرح اور شامل کردیا' جس سے مسٹر برٹ اس پر اور مہربان ہوگئے اور اپنی تیکنیک کی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں خوش ہوکر شکرگزاری کے لئے اس کے سامنے اور جھک گیا جب کرسمس آتی تو مسٹر برٹ کی میز پر ایک لائٹر اور سگار کا پیکٹ رکھ کر اس خوشامد کو اور دونی کردیتا۔ دفتر اسے واقعی تھکا دیتا۔ اس کا کام نہیں اس کا ماحول' وہاں سے فارغ ہوکر وہ سیدھا اپنے فلیٹ میں آتا اور گداز بستر پر ایک زخمی کی طرح گر پڑتا۔ اس آرام کے ملتے ہی اس کا جوڑ جوڑ اور دکھنے لگتا اس وقت اس میں آرام اور تازگی کی شدید خواہش پیدا ہوتی بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا کہ اس آرام سے تازگی اسے بالکل نہ ملتی تو اسے اپنے ڈاکٹر کا مشورہ یاد آتا کیونکہ وہ کافی موٹا ہوچکا تھا اور لندن میں موٹاپا عاشقی میں ایک قسم کی رکاوٹ ہے موٹی عورتیں اور موٹے مردوں کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے اس لئے ہر وقت مزیدار چیزوں کے کھاتے رہنے سے خصوصاً عورتیں جب موٹی ہو جاتی ہیں تو پھر انہیں اپنا موٹاپا کم کرنے کے لئے ڈاکٹر کی طرف توجہ

دینا پڑتی ہے۔ دوائیں' انجکشن' ورزشیں' فاقے اور مخصوص قسم کی خوراک' سب ہی سے موٹاپے کو کم کرنے کے لئے مدد لی جاتی ہے۔ ان مزیدار کھانوں اور اس پر بیئر نے عبید کو ضرورت سے زیادہ موٹا کردیا تھا خصوصاً" اس کی توند' پہلے تو ضرورت سے زیادہ کالا رنگ اور اس پر پستہ قد اس کے لئے ایک عذاب تھا اس پر اس موٹاپے کا مزید اضافہ۔ آخر ڈاکٹر کے پاس اسے بھی جانا پڑا' ڈاکٹر نے اسے سب سے پہلے سالن گوشت کو ترک کرنے کا مشورہ دیا تو عبید نے ذرا فخر سے اس کا جواب دیا کہ اسے عرصہ ہوا وہ ترک کرچکا ہے۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ہی رویہ تھا جیسے کوئی پس ماندہ ملک کا آدمی یورپ میں رہ کر اپنی کسی چیز سے بے تعلقی کا اظہار کرکے خود کو ترقی پسند مغربی ثابت کرے۔ پھر ڈاکٹر نے کچھ غذاؤں میں تبدیلی کا مشورہ دے کر اسے تیراکی کا مشورہ دیا' ڈاکٹر کا یہ مشورہ عبید کے بڑا کام آیا۔ اس تیراکی نے اس کے بدن میں توازن پیدا کرکے اسے چکنا بھی کردیا جس کا اظہار سوئمنگ پول پر کئی لڑکیوں نے کیا جس سے اسے بے انتہا خوشی ہوئی اور کسی حد تک اپنی جسمانی شخصیت پر اعتماد بھی پیدا ہوگیا۔ اور بعض مرتبہ تو وہ خود اپنے برہنہ جسم پر ہاتھ پھیر کر لطف سا محسوس کرتا۔ یورپین لڑکیوں سے عشق کے لئے اسے نیک فال تصور کرتا' سوئمنگ پول میں آتے ہی پہلے تو سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیتا اس کے بعد پول میں تیرتی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لیتا رہتا' جب کسی سڈول جسم والی لڑکی کا تیرنا اس میں آمادگی پیدا کرتا تو پہلے وہ ریٹائرنگ روم میں جاکر کپڑے اتار ڈالتا اس کے بعد پول کے پاس آکر لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ان میں سے کوئی پول سے نکل کر اوپر آتی تو اسے پھر دھکا دے کر دھکیل دیتا اور اس کے ساتھ خود بھی پول میں کود پڑتا تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ تیرتا' چھینٹے اڑاتا' اپنے کرتب دکھاتا۔ لڑکی اس پورے عمل سے بڑی محظوظ ہوتی' اس ٹھنڈے پانی میں اس کے جسم کے اندر ارمان مچل کر اسے بے قابو سا کردیتے اس کے بعد پھر وہی ہوتا جو پول کی باہر کی زندگی میں اس کے ساتھ ہوتا رہتا' لڑکی مسکراہٹ کے ساتھ "پھر ملیں گے" کا رسمی جملہ کہہ کر وہاں سے چلی جاتی۔ دروازے پر مڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کرتی' اور پھر وہ تنہا رہ جاتا اور سارا کھیل اس کے لئے خواب بن جاتا۔ لیکن اس تیراکی سے جنسی آسودگی اسے ضرور مل جاتی اور کافی دنوں تک وہ عورت کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔

جسم کی تازگی اور دل کی اداسی کو لے کر وہ پھر آتا' اسی اداس دل کے ساتھ اپنے سوکھے بالوں کو ذرا بکھیر کر چہرے اور ہاتھوں پر کریم لگا کر سب سے پہلے گلے میں سرخ رومال باندھتا۔ اس کے بعد ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ زین کی پتلون سرخ رنگ کی قمیض اس پر نیلا سوئٹر' میلا سامبر کا اہنکل شو اور اوپر سے ضرورت سے زیادہ میلی سفید بھیڑ کی کھال کا اوورکوٹ اپنے جسم پر اس طرح رکھتا جیسے یہ ہینگر میں لٹکا ہوا ہو' اس کے بعد ٹیبل سے قیمتی فرانسیسی Colibri لائٹر' امریکی Camle سگریٹ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال کر ہاتھ میں کوئی جدید ناول کی جلد لے کر باہر نکلتا گھر سے ذرا فاصلے پر اخبار والے کی دکان تھی وہاں سے شام کا اخبار لے کر لندن کے اس پوش علاقے میں ایک ریستوران میں جاکر بیٹھتا جو یہاں ادیبوں اور فنکاروں کا جزیرہ کہلاتا ہے۔ اس تاریخی علاقے کے گرد ایک فضا تھی جسے یہاں کی پرانی عمارتوں تنگ اور نیم تاریک گلیوں نے بڑا دلکش بنا دیا تھا۔ ریستوران بڑا دلکش تھا تقریباً" ۴ گز لمبا اور ۴ فٹ چوڑا چھت بڑی نیچی جس کے کناروں پر انگور کے گچھے اور اس کے پتوں کی بیل تھی جسے ریستوران کے دھوئیں نے گہرا براؤن کردیا تھا جگہ کے مختصر ہونے کے پیش نظر کرسیوں کے بجائے بیضوی ٹیبلوں کے گرد دو اسٹول رکھے ہوئے تھے' موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے یہاں ہمیشہ تاریکی رہتی جسے قندیلوں کے گرد محدب شیشوں نے اور دلفریب بنا دیا تھا اور دیوار پر یہاں ایک تصویر تھی جس میں مصور نے ایک پہاڑی منظر پیش کیا تھا جس کے پہلو میں ایک خاموش جھیل بہہ رہی تھی فاصلے کی وجہ سے وہ تصویر میں ایک نقطہ کی طرح نظر آتی۔ ایک تصویر کے ساتھ اس ریستوران میں ایک ہی کھڑکی تھی جس کے گرد سرخ رنگ کی جھالر اور سرخ رنگ کا پردہ سرکا ہوا تھا۔ جب کبھی لندن کے آسمان پر سورج چمکتا تو باہر کی روشنی بھی یہاں آجاتی۔ اس ریستوران میں ایک بوڑھا بلا بھی تھا جو یہاں ایک گوشے میں اکثر سوتا رہتا' یہاں عموماً" ادب و آرٹ کی دلدادہ شانوں پر زلفیں بکھیرے ہوئے نوجوان لڑکیاں آکر بیٹھا کرتیں' ادیب و فنکار اس ریستوران میں عموماً" لڑکیوں کی تلاش میں بھنوروں کی طرح منڈلاتے رہتے' یہاں تقریباً" ہر آدمی ایک دوسرے کو جانتا تھا لیکن ہر ایک سے تعلق رکھنے کا روادار نہ تھا' جب ان لوگوں کی آپس میں نظریں ٹکراتیں تو ایک دوسرے کو نظرانداز کرکے دوسری طرف دیکھنے لگتے لیکن اگر کوئی جوان لڑکی ان میں سے کسی کی

طرف دیکھ لیتی تو ان کے پتھر جیسے سپاٹ چہروں پر ایک طرح کی ملائمیت پیدا ہو جاتی اور لڑکی کی اس توجہ پر وہ مسکرا دیتے' یہاں کا ہر آنے والا پہلے بلے کو تلاش کرتا جب وہ سوتا ہوا مل جاتا تو اپنے ہاتھ سے تھپتھپا کر اسے جگا دیتے' بلا جاگ ضرور جاتا لیکن مخاطب کو مچی مچی آنکھوں سے دیکھ کر پھر سو جاتا جانور کی اس سردمہری کا ان پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ حسین لڑکیوں کی مشترکہ طلب نے یہاں کچھ لوگوں میں ایک قسم کا معاشرتی اتحاد بھی پیدا کردیا تھا اور ریستوران میں جب کوئی لڑکی نہ ہوتی تو آپس میں بات چیت کر کے وہ اپنا وقت گزارتے اور اگر مصروفیت کے دوران ریستوران میں لڑکی داخل ہوتی تو ان کی گفتگو یک لخت بند ہو جاتی ہر آدمی اس لڑکی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا۔ عبید اس ریستوران کے ایک گوشے میں اپنا قیمتی سنہری لائٹر سگریٹ کا پیکٹ کوئی جدید ناول اور شام کا اخبار لے کر سنبھل کر بیٹھ جاتا۔

یہ ریستوران جس نسل کا مرکز تھا اس کا تقریباً" وہی لباس تھا جو عبید نے پہن رکھا تھا کبھی کسی کے پاس مشرق کی کوئی چیز ہوتی تو اس کے جاننے والے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اس کے گلے کا رومال' چمڑے کا تھیلا لڑکیوں کے زیورات جن کا تعلق پرانے مشرق سے تھا ان میں بڑی دلچسپی لیتے اور ان مشرقی سوغات کا مالک بڑے فخر سے ان کا اور ان کی قیمت کا ذکر کرکے جاننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا اس طلب کو دیکھ کر عبید میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر مشرق کی طرف پلٹ کر دیکھے لیکن مشرق کی روح کی طرف نہیں بلکہ اس کلاسیکی ظاہر کی طرف جو مغرب کی نئی نسل کی توجہ کا مرکز ہے اب اس کے گلے کا رومال' ہاتھوں کی انگوٹھیاں' مراکو کے چمڑے کے پرس پر بھی کبھی کوئی تبصرہ کردیتا۔ خوشامد تو اس کے کردار کا اب ایک مستقل حصہ بن گئی تھی لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے مشرقی آداب کو پھر سے اس نے اپنے رویئے میں زندہ کیا۔ اخبار کے تبادلے یا لائٹر کی وجہ سے کسی انگریز سے ذرا سا تعلق پیدا ہو جاتا تو جب وہ دوسرے دن ریستوران میں داخل ہوتا تو دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی نشست سے اٹھتا خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتا کم آمیز انگریز کے لئے یہ احترام آمیز تپاک بڑا مسحور کن ہوتا اور اس کی خاطر وہ اس کے قریب آ کر تھوڑی سی بات چیت کرلیتا۔

انگریزوں کے معاملے میں خوش اخلاقی اور فراخ دلی وہ ضرورت سے زیادہ صرف کرتا

لیکن اس کے کافی ہاؤس کے دوستوں میں صرف چند بیکار قسم کے ادیب شاعر' غیر ملکی یورپین اوپیر لڑکیاں اور مقامی یہودی ہوتے جو خالی وقت خوش گپیوں میں اس کے ساتھ گزار لیتے اور وہ ان سب Isolate لوگوں کو غنیمت سمجھ کر ان سے اپنے تعلق کو مضبوط کرنے کے لئے انہیں گھر پر دعوت کے لئے بلاتا ان کے لئے مرغوبات پکاتا۔ ویسے اس ریستوران میں کسی کالے کے ساتھ کوئی گوری لڑکی کبھی کبھی ہی نظر آتی اس وقت یہاں کے پکی عمر والوں کے چہروں پر ایک ناگوار قسم کا تناؤ پیدا ہو جاتا اور اس دو رنگے جوڑے کو نظرانداز کر کے خود کو مطمئن کر لیا کرتے۔

ویسے عبید کا اکثر وقت یہاں سگریٹیں پھونکنے' اخبار پڑھنے اور نوجوان لڑکیوں کے نظارے میں گزرتا' جب یہ نظارے اس کے لئے بے کیف بن جاتے تو وہ شدید ضرورت محسوس کرتا کہ کوئی اس سے ذرا دیر کے لئے بات کرے۔

اس علاقے میں کچھ انڈوپاکستانی ریستوران بھی تھے اور دیسی لوگ ہی وہاں کام کرتے۔ جب کبھی وہ اپنے کام سے فارغ ہو جاتے تو مل کر تھوڑا سا وقت اس ریستوران میں آکر بھی گزارتے۔ عبید جب اپنے ان ہم رنگ اور ہم وطن لوگوں کو دیکھتا تو اس کے چہرے پر عجیب قسم کی ناگوار کیفیت طاری ہو جاتی وہ یہاں پر کالے آدمیوں کی بھیڑ دیکھنا گوارہ نہ کرتا لیکن اس ناگواریت کے سہنے کے علاوہ وہ یہاں کیا کر سکتا تھا اس کو اپنے لوگوں کی موجودگی سے جو ناگواریت سہنا پڑتی اسے دور کرنے کے لئے وہ وہی کرتا جو گورے اس کے ساتھ کرتے کہ نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھ کر اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے۔ یہ سارا اہتمام جو اس نے اپنی زندگی میں کر رکھا تھا ان دنوں اس کا مقصد صرف عورت سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کی شدید خواہش تھی۔ اور ان عورتوں میں صرف اوپیر لڑکیاں تھیں جن سے اسے کچھ امید تھی کیونکہ مقامی انگریز لڑکیاں کچھ اپنی روایتی کم آمیزی اور دوسرے ماحول میں کالوں کے خلاف جو رویہ ابھر چکا تھا' رنگدار لوگوں پر توجہ بہت کم کرتیں۔ اس لئے اس سارے تعلق کو جو احترام آمیز تپاک اور مغلافی کی دعوت کے بعد عبید کو یہاں حاصل ہوا تھا اس وقت بیکار ہو کر رہ جاتا جب اس کے پاس کوئی گوری لڑکی بیٹھ جاتی۔ سارے شکاری اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتے اور بعض تو اس لڑکی سے گفتگو سننے کے لئے اس کے قریب آکر بیٹھ جاتے اور ناگواریت

سے ان سارے گورے شکاریوں کے چہرے سرخ ہو کر کرخت بن جاتے۔ ویسے عورت سے لطف اندوز ہونے کی خواہش اس معاشرے میں ساری عشرتوں پر غالب تھی لیکن اس خواہش نے جہاں لوگوں کو حریص' حاسد اور متلون بنایا وہاں دوسری طرف ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں بھی خطرناک قسم کی خودغرضی کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ عورت' عشق کے وہ سارے تصورات جس میں وفاداری' خلوص' قربانی جیسے عناصر شامل ہیں اب سب مل جل کر پرانے زمانے کی یادگار بن کر رہ گئے تھے اور جنسی تعلق بھی ایک قسم کا کاروباری تعلق بن کر رہ گیا تھا جس کے ٹوٹنے اور قائم رہنے میں صرف لذت کو اہم مقام حاصل تھا۔ یہی لذت ایک دوسرے کو جوڑے رکھتی اور اسی لذت کی سردمہری یا کسی زیادہ دلکش پارٹنر کی کشش اس تعلق کو ختم کر دیتی۔ لیکن اس شہوانی لذت کی فراوانی نے ان کے سکون قلب و ذہن کو بھی برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس ذہنی سکون کے فقدان کی موجودگی میں Psychiatrists کی ایک فوج تیار ہو گئی تھی جو ان زخمی مریضوں کی مرہم پٹی کر کے انہیں پھر معاشرے میں مقابلے کے لئے بھیج دیتے۔

اپنے قریب گوری لڑکی کو دیکھ کر عبید دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ان گوروں کے دلوں کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم تھا کہ اسی حسد کی وجہ سے کئی کالوں کو سربازار زدوکوب کیا گیا کیونکہ وہ اپنی گوری گرل فرینڈ کے ساتھ لندن کے خوشگوار موسم کا لطف لے رہے تھے لیکن اس وقت اس لڑکی کی موجودگی میں عبید نے ان سارے حادثوں کو نظرانداز کر دیا کیونکہ تشدد اور اس ناگواریت کی وجہ سے اگر وہ اپنی اس طلب سے دست بردار ہوتا تو پھر جینے کے لئے اس کے پاس کیا تھا؟ آخر وہ کس ارمان اور خواہش کے سہارے جیتا' آخر کوئی خواہش تو اس کے خون کو گرم رکھے کیونکہ پوری زندگی وہ تحریکوں پر جینے کا عادی رہا تھا اور حرکت اس کی زندگی تھی۔ اب اسے اس کی پرواہ نہ تھی کہ اس حرکت کی سمت کیا ہے؟

ویسے مارکس ازم اس کی زندگی میں ایک کند چھری کی طرح ہو کر رہ گیا تھا لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی ادب و آرٹ کی دلدادہ اوپیر لڑکی اس کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ پھر اس کے مزاج اور مذاق کو پہچان کر وہ اپنے پرانے مارکسی جذبات اور خیالات سے کام لیتا اور بڑی ہوشیاری سے لڑکی کے جذبات اور خیالات سے ہم آہنگی پیدا کر کے اسے اپنے

سجے سجائے فلیٹ میں لے آتا۔ کہیں فلیٹ کی تنہائی' جدید یورپی موسیقی کا ریکارڈ اور یہ صحت مند خوبصورت لڑکی اس کی پوری اداکاری کو ختم کرکے رکھ دیتی اور بڑے بے ڈھنگے پن سے اپنی محبت کا اظہار کرکے اس لڑکی کو قریب لانے کی کوشش کرتا۔ لڑکی جس کو ابھی صرف اس کی شخصیت کے اس حصے سے دلچسپی ہوتی تھی جس کو بڑے اہتمام سے اس کے سامنے پیش کیا لیکن وہ حصہ لڑکی کے اندر اتنا طاقتور کب ہوا تھا جو اسے عبید سے جنسی تعلق پر آمادہ کردے اس لئے اس کے بار بار لپٹنے چمٹنے سے بیزار ہوکر اس لڑکی میں فوراً" اجنبیت کا دورہ پڑتا اور اپنا کوٹ پہن کر بغیر کچھ کہے اس کے کمرے سے باہر نکل جاتی اور اسے پھر مایوسی کے شدید دورے پڑنے لگتے۔

ساری محرومیوں اور ناکامیوں کے بعد پھر اسی ریستوران میں آتا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاکر اپنے جذبات کے تصادم کو کم کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کشوں کے بعد جیسے جیسے اس کا جذباتی تصادم کم ہوتا تو امید کی نئی کرن پھر اس کے اندر پھوٹنے لگتی اور وہ پھر کسی لڑکی کا انتظار کرتا رہتا۔ لڑکی کے انتظار میں دنوں نہیں ہفتوں گزر جاتے' لوگوں کے ہجوم میں کوئی بھی چاہت بھری نظروں سے اس کی طرف نہ دیکھتی' بعض مرتبہ مسلسل خاموشی اور انتظار اس کا گلا دبانے لگتی' اس وقت وہ شدید ضرورت محسوس کرتا کہ کوئی مل جائے اور اس سے تھوڑی سی بات چیت کرلے۔ آخر یہ تنہائی جب اسے زیادہ تنگ کرتی تو ریستوران سے اٹھ کر وہ Heath کے گرد گھنے جنگل میں چکر لگانے چلا جاتا' اس عالم میں گھنے پیڑوں کی ہلتی ہوئی ٹہنیاں بڑی دلفریب معلوم ہوتیں جیسے اس سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں۔

ایک دن ایسا ہی ہوا کہ ریستوران کی زندگی سے تنگ آکر جب وہ Heath کی طرف بھاگا اور جب دل نے وہاں بھی انسانوں کے لئے مچلنا شروع کیا تو وہ پھر اس مختصر سے ریستوران میں آیا وہاں اسے اپنا ایک پاکستانی دوست نظر آیا۔ عبید کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ چھاگئی اپنی سیٹ پر اس نے تھوڑی سی جگہ بھی کردی' عبید کو اس تعلق کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا۔

"کہو کیسے مزاج ہیں۔" اس محبت کو پاکر اس مرتبہ عبید نے مزاج پرسی میں پہل کی۔

"بس زندہ ہیں"۔

"ہاں اس کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے؟"۔

"آج کل کہاں رہ رہے ہو"۔

"بس اسی علاقے میں سمجھو"۔

"تو اب بہت اونچے آدمی ہو گئے ہو"۔

"بھئی اونچے کیا مجھے یہ علاقہ اور لوگ بہت پسند ہیں۔" عبید کے لہجے میں ذرا سی خوشی بھی شامل ہو گئی۔

"تو اب خوش ہو"۔

"جی ہاں شکر ہے"۔

"ہائی بھئی یہ تو ہمیں معلوم ہے۔" اس کے دوست نے ذرا ہنس کر جواب دیا۔ ویٹرس آرڈر لینے کے لئے ان کے قریب آئی تو اس کے دوست نے عبید کے لئے ایک کافی کا آرڈر دیا' ایک آدمی کو مخاطب پا کر عبید کا دل امنڈ آیا تھا وہ آج جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا تھا اس لئی اس نے لوگوں سے اپنے تعلقات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا کہ کئی اونچے طبقے کی انگریز لڑکیاں سالوں اس کے پیچھے پڑی رہیں کہ میں شادی کر لوں' ان کے گھر والوں کے دعوت نامے آتے لیکن مجھے فرصت کہاں جو سب کے یہاں جاؤں' البتہ جب کوئی لڑکی مجبور کرتی تو اس کے ساتھ ان کے قصباتی محل میں چند دن گزارنے چلا جاتا ہوں' انگریز قوم خصوصاً اوپیر کے طبقے کی مدح سرائی میں مارکس ازم بالکل بھول گیا۔ اس کے دوست نے لندن میں رنگ کے امتیاز کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بڑے درشت لہجے میں جواب دیا کہ وہ مہذب انگریز مڈل کلاس نہیں بلکہ اس قوم کا مزدور طبقہ ہے اس کے بعد وہ انگریز مزدوروں کو دیر تک صلواتیں سناتا رہتا۔ لیکن اعصابی تشنج اس پر اس وقت طاری ہوتا جب اس کا دوست اپنی تہذیب اور اپنے ملک کی کسی چیز کا احترام اور حسرت کے ملے جلے جذبات میں ذکر کرتا تو وہ سارے مسلمان معاشرے کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیتا' ایک ایک خرابی کو کرید کرید کر تلاش کر کے اس سے پوچھتا بتاؤ یہ کس اعتبار سے انسان ہیں اس کے بعد وہ مولویوں پر اتر آتا تو اس کے چہرے پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور کہتا کہ یہ مسلمان سردار لوگوں کی ایک بھیڑ ہے جسے مولویوں نے روح کی صفائی کے کام میں لگا کر دنیا میں بیکار کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے دوست نے بیچ میں اسے

ٹوک دیا جو عبید کو ذرا ناگوار گزرا تو اس نے اس کی طرف دیکھ کر ذرا سوچا اور پھر کہا۔

"اگر پیٹ بھرا ہے تو روح ٹھیک رہتی ہے"۔

"تو یورپ اور امریکہ میں جو ضرورت سے زیادہ لوگوں کو روٹی مل رہی ہے کیا ان کی روح ضرورت سے زیادہ ٹھیک ہے؟" سوال کرکے اس کا دوست اب ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہ سرمایہ دار ہیں؟" عبید نے جواب دیا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے انہیں تو ضرورت سے زیادہ روٹی مل رہی ہے"۔

"یہ لوٹ کھسوٹ کر روٹی حاصل کرتے ہیں؟"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے تم نے یہ کہا تھا کہ روٹی پیٹ بھر کے ملے تو سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں"۔

"تو' تمہارا خیال ہے کہ آج کی دنیا میں سارا وقت اور قوت روح کی صفائی میں صرف کردیا جائے۔ دیکھتے نہیں آج جو قومیں اس مذہب کے چکر میں پڑیں وہ دنیا میں کتنی پیچھے رہ گئیں یہ آئرش' اطالوی اور اسپین والے آج دنیا میں ان کی کیا حیثیت ہے؟"۔

"دو چیزوں کو گڈمڈ نہ کرو' اسلام میں روح کی صفائی کا تصور ان قوموں کے تصور سے علیحدہ ہے؟"۔

"اچھا تو اب تم مجھے اسلام سمجھانے آئے ہو اپنی زندگی کا بہترین حصہ میں نے اس کے حصول میں صرف کیا تو تم سمجھتے ہو کہ میں اسلام کو نہیں سمجھا؟"۔

"تو تم اسلام کو کیا سمجھتے ہو؟"۔

"عربوں کے تجارتی طبقے کا ایک آلہ کار ایک ہاتھ میں ان کے تلوار تھی دوسرے ہاتھ میں یہ روحانی رسی کا پھندہ جسے مفتوح قوموں کے گلے میں ڈال کر اپنی طاقتور شہنشاہیت کو قائم کرنا چاہتے تھے"۔

"لیکن یہ اسلام پر اصولی اعتراض نہ ہوا بلکہ یہ اعتراض عربوں پر ہوا۔" اس کے دوست نے سوال کرکے اس کے چہرے کو پھر ایک بار غور سے دیکھا' جیسے وہ سمجھنے کی دوبارہ کوشش کر رہا ہو۔ "یہ اسلام ان کا ہی تخلیق کردہ تھا اور ان کے ہی مفاد کی حفاظت کرتا تھا۔" عبید نے پھر سگریٹ کا لمبا کش لگا کر جواب دیا' اب اس کی آنکھوں کی چمک

میں ایک بیزار کن سی کیفیت گھلتی جا رہی تھی۔

"اسلام پر کوئی واضح اعتراض کرو' اس کا کوئی اصول لے لو اس کے بعد بتاؤ کہ وہ کون سے طبقے' نسل یا قوم کی حفاظت کرتا ہے"۔

"چھوڑو یار۔ آج کے سائنسی دور میں تم مذہب کے چکر میں آدمی کو پھنسانا چاہتے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔" عبید نے بات کا رخ بدلنا چاہا کیونکہ اسلام پر گفتگو کرنے سے وہ خود پر ایک بار محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں چھوڑیں کیوں جب بات شروع کی ہے تو اسے کہیں تو پہنچاؤں' تم نے اپنی بات کو پھر وزن دار کرنے کے لئے سائنس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن میں پھر پہلا سا سوال کروں گا کیا سائنس نے اسلام کی بتائی ہوئی کسی صداقت کو ابھی تک غلط ثابت کیا ہے اور پھر سائنس سے تمہاری مراد کیا ہے' سائنسی نظریاتی یا سائنسی حقیقت؟"۔

بھئی ہر دور کا ایک مزاج ہوتا ہے ماضی کا انسان بہت سی باتوں میں کمزور تھا اور بے بس تھا اس لئے مذہب میں ایک طرح کا فرار حاصل کرلیتا حالانکہ یہ فراریت اس کے مسائل کو حل نہ کرتی۔" عبید نے ذرا سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

"عبید۔ تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ تم اصولی اعتراض کبھی نہیں کرتے۔ انسان کی تاریخ پر تمہاری ایک رائے ہے کیونکہ اس تاریخ کو تم نے ایک مخصوص نقطہ نظر سے دیکھا اور اس رائے کو تم ایک دلیل کی حیثیت ہی سے پیش کر رہے ہو' مجھے تمہاری اس رائے سے اتفاق نہیں۔ مسائل کی کبھی کمی نہ ہوگی اگر مسائل کا اعداد و شمار لے کر بیٹھے ہو تو تم سمجھتے ہو کہ آج انسان کے پاس سلجھانے کے لئے مسائل نہیں؟ انسانی تاریخ میں انسان اتنا دیوالیہ کبھی نہ تھا جتنا آج.... زندگی گزارنے کے لئے آدمی کو ایک تصور کی ضرورت رہتی ہے جو اس کی زندگی میں کچھ مقصد پیدا کرے اور انسانی زندگی میں مذہب و فلسفوں کا کام یہی ہے کہ آدمی کے بنیادی سوال کہ میں یہاں کیوں ہوں کا جواب فراہم کرے اور مختلف انسانی تہذیبوں کے پاس اس کے جوابات بھی ہیں جو اس کے تہذیب کے ماننے والے اپنے معاملات میں برتتے بھی ہیں سائنس کا نہ یہ کام ہے اور نہ غالباً" اس کا دعویٰ کہ آپ کے لئے طرز زندگی اور مقصد حیات متعین کرے۔ البتہ کچھ فلسفے سائنٹفک ہونے کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ

نہیں ہے کہ فلسفوں کی بنیاد سائنسی حقائق کی ہے"۔

"لیکن ان فلسفوں کی بنیاد سائنسی حقائق پر تو ہے۔" عبید نے جواب دیا۔

"جی نہیں ان کی تعبیر"۔

"تو بتایئے اسلام کے حق میں سائنٹفک دلیل؟"۔

"میں پھر عرض کروں گا کہ آج تک سائنس نے جو کچھ انکشاف کیا ہے اس نے اسلام کے کون سے آفاقی اصول کو غلط ثابت کیا۔ اور پھر جن سائنٹفک نظریات میں آپ الجھے ہوئے ہیں وہ سائنسی نظریات ان لوگوں کے بتائے ہوئے ہیں جو دین و مذہب کے مخالف ہیں لیکن بہت سے سائنس دان دین و مذہب پر بھی یقین رکھتے ہیں اور ان کے یہ عقائد ان کے سائنسی نظریات کو بھی متاثر کرتے ہیں اس جانبداری کی واضح مثال آپ سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کے سائنسی نظریات سے بھی لگا سکتے ہیں۔ روس اور اشتراکی ممالک میں سائنس سے جو کچھ کیا جاتا ہے اسکی تعبیر ہمیشہ مارکسی نقطہ نظر سے ہوتی ہے اور سرمایہ دار ممالک میں سائنس پر جو کچھ کام ہوتا ہے وہ یہاں کے جو نظریات ہیں اس کا اثر سائنسی کاموں پر پڑتا ہے۔ اسلام کے حق میں کیسی سائنسی دلیل آپ نے طلب فرمائی ہے لیکن اسلام تو زندگی کا دین ہے اس کے بہت سے اصول ہیں اس کے ہر اصول سائنسی نقطہ نظر سے واضح نہیں کئے گئے اس کی بتائی ہوئی بہت سی صداقتوں نے سائنسی کاموں میں البتہ بڑی مدد کی ہے لیکن میں اس نقطہ نظر سے اسلام کو نہیں دیکھتا بلکہ میں اپنے پہلے فقرے کو پھر دہراتا ہوں کوئی سائنسی انکشاف ایسا بتا دیجئے جو اسلام کی بتائی ہوئی صداقت کو غلط ثابت کرے"۔

"تو تمہارے خیال میں اسلامی تاریخ میں دوسری قوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی؟" عبید نے پھر سوال کیا۔

"اسلامی تاریخ نہیں مسلمانوں کی تاریخ کہئے۔ ہاں مسلمانوں کی تاریخ میں بے انصافیاں بھی ہیں' بدعنوانیاں بھی ہیں لیکن یہ تو دنیا کی ہر قوم کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حالیہ کمیونسٹوں کی تاریخ بھی دیکھ لیجئے۔ روس نے چیکوسلواکیہ کے ساتھ کیا کیا روس اور چین کا جھگڑا۔ اور پھر محبت کا درس دینے والی مغربی عیسائی قوموں نے دوسری قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ میرے خیال سے تمہارا تاریخی مفروضہ ہے' عرب اور اسلام کو لازم و

ملزوم نہ سمجھو۔ عربوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی مسلمان ہوئیں ان کے اجتماعی اور انفرادی رویئے پر جہاں جہاں اسلام کا اثر پڑا اس اثر کے متعلق بتاؤ کہ اس کا تعلق کسی طبقے، نسل یا قوم سے تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا نقطہ نظر اور ہے پھر یہ بھی دیکھو کہ اسلام نے ان کے اجتماعی اور انفرادی کردار میں ایسا کوئی عنصر پیدا کیا جو کسی اعتبار سے غیر صحت مند ہو اور ان کا کردار فطری طور پر پروان نہ چڑھا"۔

"تو پھر تم سمجھتے ہو کہ آج کے زمانے میں اسلام کو تو پھر زندگی میں ایک قوت کی طرح واپس لے آؤ گے؟"۔

"قوت کے مختلف تصور ہیں۔ مختلف حالات ہیں اس کی مختلف حیثیتیں ہیں اور اس کا سارا انحصار اس کے ماننے والوں پر ہے۔ اگر آج کے زمانے میں چینی جاگ کر دنیا کی ایک طاقتور قوم بن سکتے ہیں، اور تمہارے اسی آج کے زمانے میں جنوبی افریقہ اپنی ساری بے انصافیوں کے ساتھ جی سکتا ہے جس کے لئے آج کا زمانہ بالکل تیار نہیں۔ اسی انداز پر روڈیشیا میں دوسری ریاست کا وجود جب یہ تمہارا سائنسی زمانہ محض طاقت کے بل بوتے پر قائم ہے وہ قائم کیوں نہیں ہوسکتا۔ آخر مسلمان بھی انسان ہیں ان کے پاس تاریخی شعور بھی ہے وہ زندگی میں اسلامی انداز پر مختلف تجربے کیوں نہیں کرسکتے۔ اور مسٹر عبید مسلمانوں کے متعلق ایک بات اور بتاؤں وہ پسماندہ ضرور ہیں ان میں بہت سی خرابیاں بھی ہیں۔ لیکن ایک بڑی انسانی خوبی اس پس ماندہ ملت میں یہ ہے کہ اس پسماندگی میں وہ ایک نظریاتی ملت ہے اس نظریئے سے وہ خود ہی مستفید نہیں ہونا چاہتی بلکہ دوسری قوموں کو بھی اس میں شریک کرنے کی خواہش مند ہے"۔

ان دونوں کو اس مختصر سے ریستوران میں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی یہ دونوں اردو میں بیٹھے یہ بحث کر رہے تھے اور وہ لوگ جو ان دونوں کے قریب بیٹھے تھے ان کو ان کی آواز بڑی اجنبی اور ذرا ناگوار سی گزر رہی تھی اور بعض کے چہرے پر تو ناگوار تاثر تک ابھر آیا تھا، لیکن وہ خاموش تھے انگریزی آداب نے ان میں اتنی سکت تو ضرور پیدا کردی تھی کہ وہ اسے برداشت کرسکیں۔ عبید نے ان لوگوں کے چہروں کو پڑھ لیا تھا اور پھر اس تبادلہ خیال سے اس کا جی بھی خوب بھر گیا تھا اور اس وقت ان دونوں جذبوں کی موجودگی میں وہ کبھی کبھی گھٹن سی محسوس کرنے لگتا۔ جب وہ خاموش ہوگئے تو ویٹرس پھر

ان کے پاس آئی اور پوچھا۔

"کچھ چاہئے؟"۔

"ہاں دو کافی۔" عبید نے مسکرا کر آرڈر دیا۔

"پاکستان جانے کا کب تک ارادہ ہے؟" اس کے دوست نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا جس سے عبید گھبرایا کہ بحث پھر نہ چل پڑے تو اس نے بڑا مختصر مگر چبھتا ہوا فقرہ سا کسا۔

"بھئی جہاں رہ گئے وہی وطن ہے اور پھر مسلمانوں کا تو ساری دنیا وطن ہے"۔

"اچھا تو اسلام کو یہاں بھی استعمال کرلیا۔" اس کے دوست نے جواب دیا اور اسے دیکھ کر ہنستا رہا۔

"تو کیا مجھے مسلمان نہیں سمجھتے؟"۔

"اس کا فیصلہ تو تم خود ہی کرو۔ تمہیں تو اسلام کا علم ہے۔" اس کا دوست اس مرتبہ جواب دے کر اس کی کتاب کو دیکھنے لگا۔

ویٹرس کافی لے آئی' عبید نے اس کا شکریہ ادا کیا وہ مسکرائی تو عبید نے اس کے سوئٹر کے رنگ کی تعریف کی اس سے وہ بہت خوش ہوئی اور بڑے دلربا انداز سے اسے دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ موسم پھر تبدیل ہوگیا' سورج کی روشنی پھر چاروں طرف پھیلنے لگی وہ دونوں خاموش بیٹھے اس روشنی کو دیکھتے رہے کھڑکی میں سے باہر کی دنیا صاف نظر آرہی تھی۔ کاریں' سرخ بسیں دکانوں کی کھڑکیوں کے سامنے نوجوان لڑکیاں جگہ جگہ جدید ترین فیشن میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں فٹ پاتھ پر دونوں طرف بینچیں بھی پڑی ہوئی تھیں جب دھوپ نکل آتی تو بعض اپنے کافی اور چائے کے پیالے لے کر ان بینچوں پر جاکر بیٹھ کر دھوپ اور لوگوں کے مشاہدے کا مزا لینے لگے' اس کے دوست نے کافی ختم بھی کرلی' عبید نے اس کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا کہ دین و مذہب کے خیالات تو اتنے بھرے ہیں لیکن ذوق جمال نہیں چیزیں کھانے پینے اور برتنے کا ذوق ہی نہیں۔ لندن میں رہ کر انہیں ابھی کافی پینا بھی نہیں آیا۔ اس احساس نے اس کے مجروح دل کو جو بحث و مباحثے میں ذرا مجروح ہوگیا تھا پھر سہارا دیا اور وہ پھر اپنے علم کی نہیں بلکہ ذوق کی بلندی پر فخر کرکے خود کو اپنے دوست سے زیادہ مہذب سمجھنے لگا۔ اس رائے سے جب وہ ذرا بشاش ہوگیا تو ہاتھ

میں کافی کا پیالہ لے کر کھڑکی سے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا' کافی پینے کے لئے جیسے ہی اس نے کافی کا کپ منہ سے لگایا تو باہر اسے ایک جاننے والی اوپیر لڑکی نظر آئی' عبید نے ہاتھ ہلا کر اس سے ہیلو کیا اس نے مسکرا کر اس کا جواب دیا تو وہ جلدی سے اپنے ٹیبل سے اٹھا اور کہا۔

"معذرت چاہتا ہوں ذرا میری ایک دوست باہر انتظار کر رہی ہے اور پھر پیسے دینے کے لئے محض دکھاوے کے لئے پتلون کی جیب میں پرس تلاش کرنے لگا اسے پتلون کی جیب میں کچھ نہ ملا تو پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے دوست نے کہا کوئی بات نہیں آپ جائیں میں بل ادا کردوں گا"۔

"ارے بھئی نہیں ایسی بھی کیا بات پیسے میرے پاس ہیں۔" عبید نے رسمی طور پر اور اصرار کیا تو اس کے دوست نے پھر کہا۔ "ارے بھئی وہ غریب انتظار کر رہی ہوگی"۔

"بہت بہت شکریہ۔" ہنستے ہوئے عبید نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور ریستوران سے باہر نکل کر اس طرف تیز قدم بڑھانے لگا جس طرف لڑکی گئی تھی لیکن جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا' اس پر ایک چوٹ سی پڑی لیکن اب کہاں جائے۔ ریستوران تو اب جا نہیں سکتا تھا کیونکہ دوست سے تو کچھ اور کہہ کر آیا تھا۔

(لندن۔ ۱۹۷۴ء)

سنبھلنے سے پہلے سنبھلنے کے بعد

برطانیہ کی سیاست بالکل موسم کی طرح ہوگئی تھی۔ بعض سیاسی رہنماؤں نے تو اپنا مستقبل اسی نسلی اور تہذیبی قضیہ کو زندہ رکھنے میں محفوظ سمجھ لیا تھا۔ کچھ سیاسی نعرے فضا میں بالکل صاف تھے۔ "برطانیہ کو سفید رکھو" رنگدار تارک وطن کو ان کے ملکوں میں واپس بھیجو۔ لیکن اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرا پیچیدہ ماہرین سیاست نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ کبھی وہ قوم کو کالے بچوں کی شرح پیدائش کی ترقی سے خوفزدہ کرتے کبھی ان کالوں کی اجنبی تہذیب اور رہن سہن کی طرف اشارہ کرتے۔ رہا پریس تو وہ کالوں سے متعلق کوئی بھی خبر ہو اسے نمایاں کرکے شائع کرتا خصوصاً" اگر کسی کالے سے کوئی اخلاقی جرم ہو جاتا تو وہ اخبارات کے صفحہ اول پر آتا۔ یہ سارے خیالات اور نعرے اس منظم معاشرے کو متاثر کر رہے تھے اور انگریز جو روایتی اعتبار سے بڑے روادار آزادی کے دل دادہ اور دوسرے مذاہب میں مداخلت سے بچنے کے عادی تھے ان رجحانات سے متاثر ہو رہے تھے۔ خصوصاً" چھوٹے موٹے دکاندار اور مزدور' کلرک۔ معاشرتی فضا میں ایک قسم کا تناؤ پیدا ہوگیا تھا اور اس کا اظہار خرید و فروخت' میں چھوٹے موٹے اداروں اور دوسرے پبلک اداروں میں کالوں کے ساتھ سردمہری اور کہیں بدتمیزی کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ کاروباری خوش اخلاقی برطانوی معاشرے کا ایک اہم عنصر ہے

لیکن کالوں کے ساتھ اب اس میں بھی کفایت شعاری سے کام لیا جاتا۔ الغرض اس نئی سیاسی تعلیم نے شدید طور پر کالوں سے اجنبیت کے احساس کو مقامی لوگوں میں پھر زندہ کردیا تھا۔ رنگدار لوگ جو مزدور طبقے سے متعلق تھے کبھی کبھی اس رویئے سے تنگ آکر احتجاج کے طور پر زور آزمائی کے لئے تیار ہو جاتے' لیکن رنگدار پڑھے لکھے شترمرغ کی طرح (جو طوفان کی موجودگی میں اپنی گردن چھپا لیتا ہے) چشم پوشی کرتے۔ حالانکہ معاشرے میں جو طوفان تھا اس کا احساس ان کے رویوں میں ضرور پیوست ہوگیا تھا اور جس دولت و عشرت کے لئے وہ اس ملک میں آئے تھے اس کے حصول کی جدوجہد میں بھی خاصی تیزی پیدا ہوگئی تھی۔ ہتک اور موت کا خوف سائے کی طرح ضرور ان کے ساتھ رہتا کیونکہ اب چند فاشی گروہوں نے کالوں پر حملے بھی تو شروع کردیئے تھے' احتیاط اور خوف نے ان کے چہروں کی ساری شادمانی مٹا کر رکھ دی تھی۔ اس کا اندازہ بازاروں اور دفتروں میں ان کے اداس چہروں سے ہوتا جو دفتری طبقے کے لباس میں سجے ہوئے نظر آتے۔ رنگ کے احساس نے ان کے طبقاتی احساس کو اور قوی کردیا تھا کیونکہ جس قسم کی تعلیم نے ان کا کردار تخلیق کیا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خود کو ذرا اونچا سمجھیں لیکن اس رنگ کی وحدت نے ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کردیا تھا جو ہمارے پڑھے لکھوں کو منظور نہ تھا۔ اس لئے سماجی مرتبے کے احساس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ خود اپنے انسانی حقوق کے لئے نہیں بلکہ اپنے سماجی مرتبے کے لئے ان دفتری سوٹوں اور پوش پرچوں کا سہارا لیں۔

اس لئے اپنے گھروں سے جب وہ بازاروں میں نکلتے تو سوٹ اور ہاتھ میں کوئی پوش روزنامہ ضرور ہوتا لیکن اس سارے اہتمام اور احتیاط کے باوجود وہ رات میں گھر سے نہ نکلتے کیونکہ رات کی تاریکی میں ان کی تلاش میں اسکن ہیڈ رہتے۔

عبید کو اس بے انصافی کا صرف احساس ہی نہ تھا بلکہ اپنی دفتری زندگی میں اس احساس کو وہ بڑا تکلیف دہ پاتا۔ اب جب دفتر میں صبح آتا تو چوکیدار اس کے لئے دروازہ نہ کھولتا' کھانے کے وقفہ میں ذرا چند منٹ پہلے دفتر سے نکل جاتا (جو عموماً" سب ہی کرتے) تو اسے نوٹ کرلیا جاتا۔ دوسرے دن باس اس سے جواب طلب کرتا۔ کام کا بار بھی بڑھتا گیا اس مصروفیت کو ابتداء میں تو اس نے مفید تصور کیا کہ اس طرح تنہائی کا

احساس اور خالی بیٹھنے سے جو ہاتھ پیر ٹوٹنے لگتے ہیں اس سے تو بچ گیا۔ لیکن اس احساس میں جب یہ خیال شامل ہوتا کہ دوسرے کا کام بھی اس کی ٹیبل پر رکھ دیا گیا تو اس بے انصافی سے اس میں شدید قسم کا غصہ پیدا ہوتا جو اسے بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا وہ کانپنے لگتا اور اس کے اندر ہی اندر بغاوت کے شعلے لپکتے رہتے۔

روم میں بوڑھے کلرکوں کی چھینٹے بازی جو کالوں سے متعلق ہوتی جب شروع ہوتی تو اب اس میں دوسرے کلرک بھی شامل ہونے لگتے اور رنگدار لوگوں سے متعلق ہر آدمی ایک نئی خبر سنا کر دوسروں کو تعجب اور توجہ سے دیکھتا اور توقع رکھتا کہ اس نئی کوڑی لانے پر اسے کچھ داد ملے۔ کوئی ذرا جوش میں آجاتا تو چلا کر کہتا۔

"یہ کالے لوگ بیوی بچوں کے جھوٹے فارم بھر کر ٹیکس بچاتے ہیں اور قومی اداروں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم ٹیکس دیتے دیتے مرے جا رہے ہیں۔" اس شہ پر دوسرا تیار ہوتا اور کہتا۔

"سردی کے زمانے میں کوئی رنگدار اگر بیکار ہو جائے تو پیرافین (مٹی کا تیل) کے پیسے تک نیشنل اسٹیٹ سے لے لیتا ہے"۔

جب تیسرے کی باری آئی تو اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھتے ہوئے وہ سب کو مخاطب کرتا۔

"کالے برابر چوری سے اس ملک میں داخل ہو رہے ہیں خصوصاً "پاکی" (پاکستانی)

عبید ان ساری باتوں کی شکایت پہلے ہی کر کے دیکھ چکا تھا سوائے رسمی معذرت کے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

اس دفتر میں ایک پوش بوڑھا مہاجر تھا جو یہاں خاموشی اور اپنے کام سے کام رکھتا۔ اور اگر کوئی چاہتا تو صرف اس کے قہقہوں میں شامل ہو جاتا یہ بھاری بدن کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس خاموشی میں اپنا اکثر وقت ماضی کو یاد کرنے میں گزارتا۔ سالوں کے مشاہدے اور احتیاط کی وجہ سے اس نے عبید کی طرف ذرا دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ کیونکہ ان دنوں جو کچھ اس کے ساتھ سلوک ہو رہا تھا اس نے ذرا اس کے دل کو نرم کر دیا تھا۔ اس لئے جب وہ میس روم میں تنہا رہ جاتا تو وہ اسے طرح طرح کی نصیحتیں کرتا اور اس کی تمام نصیحتوں میں ایک نصیحت بڑی اہم تھی جس کا وہ بار بار ذکر کرتا وہ کہتا۔ ہندوستانی بندر تھے

ایک نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی' دوسرے نے اپنا منہ سی لیا تھا اور تیسری نے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس لئے یہ تینوں بندر نہ کچھ دیکھنا چاہتے نہ سننا چاہتے اور نہ کچھ کہنا چاہتے تھے اور جو کچھ ان کے پاس کام تھا بس وہی کرتے رہتے۔

اس لئے اگر تم اس ملک میں رہنا چاہتے ہو تو ایسے ہی بنو عبید نے صرف اس کی ایک تجویز پسند کی کہ اپنے منہ کو سی لے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا وہ قائل نہ تھا۔ کانوں کو یوں کھلا رکھنا چاہتا کہ جو کچھ اس کے اردگرد ہو رہا ہے اگر وہ اسے دیکھ نہ سکے تو آوازوں کے ذریعے اپنے اندر جذب ضرور کرلے۔ کیونکہ وہ دیکھنے اور سننے سے باز نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ اس کے بغیر اس کی گھٹن اور بڑھ جاتی' زندگی کے لئے اس کے پاس ابھی تک کوئی واضح عقیدہ نہ تھا جو آندھیوں اور طوفانوں میں اسے جڑ سے اکھڑنے نہ دے۔ اس لئے اپنے اس خالی انسانی وجود میں عقیدے کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ آوازوں اور آنکھوں کے نظاروں سے اپنے اندر جینے کی آگ جلائے رکھتا۔ اور پھر اس سماعت اور بصات کے تجربہ نے ایک بڑا کام اس کے حق میں ضرور کیا کہ اس کی عقل اور موقعہ پرستی کے جذبے کو پال پوس کر اس کے اندر جوان ضرور کردیا۔ جس نے اسے حال کو خوشگوار بنانے اور مستقبل کی تشویش میں ضرور مبتلا کردیا تھا۔ لیکن عقیدے کی عدم موجودگی سے جو خلا اور ذہنی خلفشار اس کے اندر پیدا ہوگیا تھا اس کی تکلیف کو وہ مختلف نام دے کر اور کبھی اپنے ارمانوں کو پورا کرنے کی جدوجہد میں خود کو مبتلا کرکے اس دکھ سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا اور کبھی خود سے کہتا میں جیل کاٹ رہا ہوں۔ کبھی کہتا ساری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے اور بعض مرتبہ یہ احساس اس کے ذہنی جوابوں سے غیر مطمئن ہوکر اس کے اندر سے محو نہ ہوتے تو شعوری طور پر وہ اسے جھڑک کر شام کے رنگین لمحات کو یاد کرکے اپنے دل کو بہلانے لگتا۔ کسی دن عقیدے کی عدم موجودگی کے احساس کی موجودگی میں وہ خود کو بڑا نہتا اور غیر محفوظ سمجھ کر سوچتا کہ وہ کالا کیوں پیدا ہوا۔ یہ سوال ایک گہری لکیر کی طرح اس کے اندر بجلی کی طرح اتر جاتا اور وہ تڑپ کر رہ جاتا۔ دفتر کے کام اور ان ناکام آرزوؤں کے طوفان نے پوری زور آزمائی کے بعد اسے سست اور کاہل بنا کے رکھ دیا تھا۔ سوائے دکھ سہنے کے احساس اور سوچنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسری حرکت نہ تھی اور یہ کام اور جذبات کی سردمہری اس کے جسم اور روح پر کہر کی طرح چھا کر رہ گئی

تھی، اس کاہلی کے زمانے میں اب خاموشی اسے زیادہ نہ ستاتی۔ گھنٹوں وہ مسلسل خاموش رہتا صرف لوگوں اور چیزوں کو دیکھتا، ان کی آوازیں بہت کم سنتا، خاموش بیٹھ کر اب وہ صرف لوگوں کے چہرے پڑھا کرتا۔ بعض چہرے اسے پسند بھی آجاتے لیکن کاہلی اور ناامیدی اسے پہل نہ کرنے دیتی اور اس وقت تھوڑی سی کاہلی کچھ کم آمیزی جو مسلسل تجربوں کے بعد اس کے اندر ناامیدی کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ اس کی انائیت جسے لندن کی کم آمیزی نے اور دوآتشہ کردیا تھا اس وقت اس کے آگے آجاتی، جو چڑیا اسے پسند آتی اس کی سردمہری کو دیکھ کر کسی دوسری طرف متوجہ ہو جاتی یا پھر سے اڑ جاتی۔ اسے اس وقت اس کا بھی دکھ نہ ہوتا اور ریستوران میں جب کوئی دوسری خوبصورت لڑکی آجاتی تو پہلی کو بھول کر وہ اس کو دیکھنے لگتا۔

یورپ میں خوشگوار موسم اور سورج کی روشنی لوگوں کو معاشرتی طور پر بڑا فیاض بنا دیتی ہے، جب لندن میں سورج چمکتا تو لوگ بڑے خوش و خرم نظر آتے۔ دفتر میں بھی اس وقت کچھ لوگ اسے سلام کرلیتے اور یہی صورت ریستوران میں بھی رہتی۔ مسکراہٹوں اور سلاموں کے تبادلے ہوتے رہتے اور کچھ پلے بوائے قسم کے نوجوان جو اس ریستوران کے مستقل بیٹھنے والے تھے اور جن کی گردنیں غرور تمکنت اور کم آمیزی سے ہروقت اکڑی رہتیں اس وقت خوشگوار موسم انہیں بھی معاشرتی آدمی بنا دیتا ان میں سے کوئی عبید سے بھی ہیلو کہتا تو وہ بڑے تپاک سے جواب دیتا وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا تو عبید اسے سگریٹ پیش کرتا تو وہ شکرایہ ادا کئے بغیر مگر مسکراتے ہوئے عبید سے پوچھتا۔

"آج بہت گرمی ہے تمہارا ملک اسی طرح گرم ہوتا ہے؟"۔

"ہاں. آج ذرا لطف آرہا ہے۔" عبید اسے جواب دیتا۔

عبید نے اب کافی کی پیشکش ترک کردی تھی کیونکہ اس کی کافی پی کر کوئی گورا اسے خود دوسری بار نہ پلاتا۔

اس ریستوران میں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو علیک سلیک اور مزاج پرسی میں اس کے ساتھ رواداری برتتے۔ کچھ ریستوران کے غیرملکی ویٹر چند سماج سے کٹے ہوئے انگریز نوجوان اور ایک اطالوی آدھا آرٹسٹ جس نے ۶ سال ہوئے ایک ڈرامہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اور اس کا ایک ایکٹ ختم کرنے کے بعد وہ سکون اور بہترین گھر کے انتظار میں کچھ

کرنے کے بجائے اپنا بہترین وقت لڑکیوں کے شکار میں گزارتا۔ آنکھیں اس کی بڑی اور چمک دار تھیں چھاتی پر تھوڑے سے بال اور درازقد' تنگ پتلون چمڑے کا سیاہ کوٹ چوڑی پیٹی' لمبے بوٹ' مسکراتا ہوا چہرہ اور جب کبھی کسی موضوع پر بحث شروع ہو جائے تو نہایت انقلابی قسم کا رویہ اختیار کرتا۔ لیکن عورت کے معاملے میں نہایت حاسد اور حریص لڑکیوں کے لئے اس کی شخصیت بڑی دلکش تھی جتنا وقت وہ اس کی صحبت میں گزارتیں وہ خود ہنستا اور انہیں ہنساتا رہتا۔ لیکن ریستوران کا بل انہیں یا اس کے کسی دوست کو ادا کرنا پڑتا۔ عمر اس کی ۴۵ سال تھی زندگی کا بہترین حصہ سیاحی اور لڑکیوں سے عشق میں گزرا جس سے اس کی شخصیت کا جذباتی اور ذہنی حصہ چکناچور ہو کر رہ گیا۔ اپنی تباہی کے اسباب اسے معلوم تھے عورت کی طلب نے اسے دنیا میں کسی کام کا نہ رکھا۔ جب اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ گئی تو اپنا آخری وقت بھی وہ عورت کی پناہ مین گزارنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اپنی عادتوں اور اندر کی طاقتوں سے مجبور ہو کر اب وہ کسی اور راستے پر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے کردار میں جو تھوڑی بہت انسانیت' خلوص اور بچوں کی سی معصومیت تھی اب ان ساری صفات کو وہ اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا اور جتنی دیر وہ ریستوران میں بیٹھتا زور زور سے باتیں کرنے اور ہنسانے کے سوا کچھ اور نہ کرتا اس کو پہچاننے میں عبید کو زیادہ دیر نہ لگی لیکن جو کچھ وہ تھا اس نے اسے قبول کرلیا روز نہیں کبھی کبھی اس کا بل ادا کرکے اس سے اپنے تعلق کو قائم رکھ کر ریستوران میں جو وقت گزارتا اسے خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا۔ عبید کے یہاں اس کا کیا مصرف ہے اسے بھی اس کا احساس تھا اس لئے کبھی کبھی وہ بل ادا کرنے کو خود اس سے کہتا جسے عبید منع نہ کرتا۔ لیکن کبھی اس کے ساتھ کوئی لڑکی ہوتی تو پھر عبید کو دور سے ہی سلام کرکے الگ بیٹھ جاتا۔ پڑھنے پڑھانے کی اسے عادت نہ تھی۔ کیونکہ کتابوں کا مطالعہ ایک صبر آزما شغل ہے۔ لیکن اندرونی دکھ جب اسے زیادہ وحشت زدہ کرتا تو وہ پھر نفسیات پر کتابیں پڑھتا کبھی یوگا پر اور کبھی نجوم پر ویسے وہ خدا کا قائل تھا لیکن اس احساس کا عمل دخل اس کی روزمرہ زندگی میں بالکل نہ تھا۔ خدا کا احساس صرف اس وقت اس کا سہارا بنتا جب دنیا میں کوئی سہارہ اس کے پاس نہ ہوتا۔

ریستوران کے ان Isolated لوگوں میں ایک انگریز جو اس کے ذرا اور قریب تھا

یہ انگریز دوسری جنگ کے بعد جاپان میں پیدا ہوا وہاں وہ صرف ان جاپانیوں کو جان سکا جو اس کے گھر میں ملازم تھے۔ آسٹریلیا میں اس کی تربیت ہوئی اور انگلستان آکر وہ اپنے خاندان کے تحکم، تنظیم اور روایات سے باغی ہوگیا۔

ماں سے اسے بڑی شکایت تھی لیکن وہ ابھی تک اس کے پہننے کے کپڑے منتخب کرتی زیادہ وقت اس کا سفر میں صرف ہوتا، البرتو کا وہ خاص دوست تھا اور دوستی میں قدر مشترک عورتیں تھیں لیکن یہ انگریز ہوتے ہوئے انگریز لڑکیوں کو پسند نہ کرتا تھا، صرف یورپین اوپیر لڑکیاں ہی اسے بھاتی تھیں۔ مشرقی لوگوں سے ملتے ہوئے سخت اجنبیت محسوس کرتا لیکن جس مشرقی سے اس کی علیک سلیک ہوتی اسے برقرار رکھتا۔ ضرورت پر مسکرا بھی دیتا لیکن اس کی ہر حرکت پر نظر رکھتا۔ تعلق کی یہی صورت عبید کے ساتھ بھی تھی وہ عبید سے جب ملتا تو بڑی شگفتہ مزاجی سے لیکن جو فاصلہ شعوری طور پر اس نے اپنے اور عبید کے درمیان قائم کر رکھا تھا اسے کم نہ ہونے دیتا۔ اسے برداشت کرنے کے معاملے میں عبید کو ذرا سوچنا پڑا کہ اس کا مصرف اس کی زندگی میں کیا ہے کیونکہ زندہ رہنے کا اس کے پاس کوئی مقصد نہ تھا اور زندہ رہتے رہتے جو وقت اس کے پاس بچ رہا تھا اسے وہ سورج کی روشنی اور عورت کے لبوں کے لمس میں ختم کردینا چاہتا تھا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد عبید نے اس کا مصرف بھی دریافت کرلیا۔ اور وہ تھا اس کا انگریز ہونا تاکہ اپنے رنگدار لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے اس کی دوستی کام آئے۔ اس ریستوران میں بیٹھ کر کوئی لڑکی تو نہ ملی لیکن ایسے افراد ضرور مل گئے جو سفید فام ہونے کے ساتھ بامصرف تھے۔ اس وقت اس نے اسی کو غنیمت جانا، لیکن اس دوستی کو قائم رکھنے کے لئے جو خوشامد اور مصلحت برت کر اسے دکھ پہنچتا وہ اپنے کسی دیسی بھائی کی توہین کرکے دل کو تسکین دے لیا کرتا۔

لیکن یہ سہارے تو سب عارضی تھے ملک میں جیسے جیسے نسلی امتیاز کا احساس قوی ہو رہا تھا اسی قوت سے دفتر میں اس کی ہتک سے اس کا دکھ بڑھ رہا تھا۔ اس دکھ نے بھی اب اسے کوئی راستہ نہ دکھایا۔ آخر اس دفتر کی ملازمت کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ اس شہر میں دوسری جگہ اس سے مختلف کب تھی اور دوسرے دفتر میں اتنی تنخواہ اور ایسی آسانیاں اسے کہاں مل سکتی تھیں۔ یہ دکھ جب اسے ذرا وحشت زدہ کرتا تو وہ اپنے جاننے والوں

سے اس کا تذکرہ کرتا وہ اسے کچھ یہودی فرموں کا پتہ دیتے کیونکہ یہودی ان دنوں کالوں پر بڑے مہربان تھے۔ پہلی کاروباری وجہ اور دوسری سیاسی کہ مستقبل میں ان رنگدار لوگوں کو کہیں یہودی مفاد کے خلاف نہ استعمال کیا جائے' اس لئے وہ انہیں ملازمت اور عزت دونوں بڑی فیاضی سے دیتے لیکن تنخواہ میں نقدی کی جو کمی ہوتی اسے وہ اپنی مسکراہٹ اور بے تکلفانہ تعلق سے پورا کردیتے کسی کسی کو تو اپنی کار میں بٹھا کر اس کے گھر تک چھوڑ آتے۔ بعض دوراندیش کاروباری لوگ اس مسکراہٹ اور ذرا سے مساویانہ سلوک کو بھی سرمائے کی طرح استعمال کرتے۔ اسے کچھ رنگدار جاننے والوں نے یہ بھی بتایا کہ کبھی کبھی کام کے ختم ہونے کے بعد صرف ذرا پانچ منٹ اور کہہ کر اپنا کوئی دوسرا کام کرالیتے ہیں اور اس طرح اپنے مساویانہ سلوک اور مسکراہٹ کا بھی وہ منافع حاصل کرلیتے ہیں۔ ایک کالے آدمی کو اس معاشرے میں پیسے تو کافی مل جاتے لیکن عزت اور دوستی نہیں۔ اس لئے اس عزت اور دوستی کی خاطر وہ پانچ منٹ نہیں بلکہ دفتر میں دس منٹ بیٹھ کر اس کا کام ختم کرتا اور جب کام ختم کرکے دفتر کے باہر نکلتا تو اپنے یہودی مالک کو گالیاں دے کر اور دوستوں کو اس کی لوٹ کھسوٹ کا ذکر کرکے اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتا۔

عبید کے ذہن میں یہ سب کچھ تھا اور اس دفتر کی ملازمت کے بعد دوسرا راستہ صرف کسی یہودی کی فرم' فیکٹری یا سرکاری آفس۔ اس کے علاوہ سماج کے دوسرے اداروں کے دروازے حکومت کی کوشش کے باوجود اس کی رنگ کی وجہ سے اس کے لئے بند تھے تصور میں وہ ان سارے مقامات سے گزر جاتا تو پھر اسے خیال آتا کہ دکھ دفتر کے باہر بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نوعیت مختلف ہے اور پھر یہ تو اس کے ذہن کا ردعمل تھا۔ اس کا جسم یہودی کے لئے جانور کی طرح کام کرنے کے قابل کب تھا۔ اسے تو اس دفتر کی سالوں چند فائلوں کی الٹ پلٹ نے سست اور کاہل بنا دیا تھا اور اب تو اس کے جسم کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ جب وہ کبھی کوئی بھاری چیز اٹھا لیتا تو گھنٹوں تھکان محسوس کرتا۔ کبھی اگر پیدل چل لیتا تو ٹانگیں الگ دکھنے لگتیں۔ اور پھر کسی یہودی فرم میں کام کرنے کے بعد وہ ریستوران میں گھنٹوں بیٹھنے کے کب قابل رہتا جہاں وہ حسین لڑکیوں کے نظارے کرسکتا اس کے بعد گھر پر آکر ٹیلی ویژن دیکھ سکتا اور صبح اسے صرف الارم ہی جگاتا۔

دفتر کے علاوہ دوسرے سارے راستے اس کے سامنے بھول بھلیاں بن گئے تھے۔ آخر انصاف کے لئے وہ کہاں جائے۔ اپنے مفاد اور ارمانوں کی موجودگی میں صرف اپنے لئے اسے انصاف یاد آتا کہ وہ اسے کہاں حاصل کرے لیکن یہ سوال بھی اس کے لئے ریگستان سے کم نہ تھا۔ اس لئے پھر دل کے گھٹنے کے ساتھ اس پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے' اسی بدحواسی اور درد کی موجودگی میں وہ اپنی پوری زندگی کا (وہ زندگی جو اس وقت وہ گزار رہا تھا) جائزہ لینے لگا۔

صبح اٹھنا جلدی سے بستر کو ٹھیک کرنا (بستر کو ٹھیک رکھنا انگلستان میں ایک قسم کی تہذیب کا اظہار ہے) اس سے فارغ ہو کر چولہے پر کافی کے لئے پانی گرم کرنے کے لئے کیتلی رکھ کر وہ بیت الخلاء میں چلا جاتا وہاں سے آتے ہی جلدی جلدی شیو کرتا۔ اس کے بعد جلدی سے منہ پر پانی کے چھپکے مار کر جلدی سے دفتر کا لباس پہنتا اس وقت ایک ایک منٹ پر اس کی نظر ہوتی۔ کپڑوں سے فارغ ہوتے ہی وہ ریڈیو کھول دیتا جہاں پوپ موسیقی کا ورد ہوتا لیکن اس موسیقی کے دوران کبھی کبھی وقت کا بھی اعلان کردیا جاتا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا' اس کا سانس پھولنے لگتا کیونکہ ٹرینوں کا وقت بھی مقرر تھا۔ چند منٹ کی تاخیر کا مطلب ٹیوب اسٹیشن پر دوسری ٹرین کے لئے پانچ منٹ اور انتظار کرنا۔ منہ میں چند لقمے ڈال کر وہ جلدی جلدی کافی بنا کر اسے پیتا اور اکثر کچھ چھوڑ کر تیزی سے ٹیوب اسٹیشن کی طرف جاتا۔ اس ٹرین کو پکڑنے کی کوشش کرتا جو اسے دفتر میں پانچ منٹ پہلے پہنچا دے۔ دیر سے پہنچنے کا مطلب ایک طوفان سے مقابلہ۔ سب سے پہلے چوکیدار کی نظریں اس کے بعد دوسرے بوڑھے کلرک جو کام میں اتنی دیانتداری نہ برتتے جتنی وقت پر آنے میں۔ کسی دن دیر سے آتے ہوئے دیکھ کر ناگواریت میں سب کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ ایک کالا آدمی یہاں رہے بھی اور اس طرح حرام خوری سے تنخواہ بھی حاصل کرے۔

صبح سویرے کے دو گھنٹے اور ادھ موا کر کے رکھ دیتے اس کے بعد دفتر کی زندگی۔

ساڑھے پانچ بجے وہاں سے وہ اس طرح نکلتا جیسے کوئی قیدی لمبی سزا کے بعد جیل سے نکلے۔ اس کے بعد پھر اس کی شام اور رات کی زندگی شروع ہوتی وہاں اسے عورت کے لئے انگاروں پر لوٹنا پڑتا۔ یہ اس کی زندگی کا Triangle تھا۔

ان مصائب کو برداشت کرکے جو تنخواہ اسے ملتی وہ ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اپنے جاننے والوں پر بھی تھوڑے سے رعب کا سبب بن جاتی لیکن اب اس رعب کے تواتر نے بھی اس کے اندر لطف کو ختم کرکے رکھ دیا تھا۔ جب اس کے سامنے سوچنے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو یہ دفتر بادل کی طرح اس کے ذہن پر چھا جاتا' دفتر میں بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کی اکثریت تھی جن میں کئی کی آپریشن کے بعد مرمت ہوچکی تھی۔ کسی کے گردے کا آپریشن' کسی کی آنتوں کا اور کوئی ذہنی اسپتال میں کچھ دن آرام کرکے لوٹا تھا وہ اکثر اپنی تنخواہوں' ہولیڈے کے منصوبوں جس کے تذکرے جاڑوں میں شروع ہوتے اور جاڑوں کا یہ سارا زمانہ آئندہ کے ہولیڈے کے پروگرام بنانے اور گزشتہ ہولیڈے کی تصویریں دیکھنے دکھانے میں گزار دیتے۔

عبید کی زندگی میں سالوں سے کوئی نئی چیز داخل نہیں ہوئی تھی لیکن جب اسے اپنے آفیسر یاد آتے جو اکثر چھٹیوں اور غیر ملکی دوروں پر رہتے۔ بعض امریکہ کا' کوئی دنیا کا چکر لگاتا۔ کوئی روس' چین اور ہندوستان میں اپنی تجارت کا جائزہ لینے جاتا تو اس کے لئے یہ دفتر کی یکساں غیر دلچسپ زندگی (جو اس وقت اسے پابندی محسوس ہوتی) مزید کوفت کا باعث بن جاتی۔

ان بیزاریوں کو سہتے ہوئے جب اسے کوئی دوسرا راستہ نہ ملا تو پھر اس نے دفتر سے ناغہ شروع کردیا۔ اس طرح اپنی یکساں زندگی میں ایک قسم کی تبدیلی لانا چاہی اس لئے جس دن وہ دفتر سے ناغہ کرتا بارہ بجے دن تک وہ بستر سے نہ اٹھتا اسی پر پڑے پڑے کروٹیں بدلتا رہتا۔ اس وقت وہ اپنا بستر چھوڑتا جب گرم گرم کافی اور پوپ موسیقی کی خواہش اس پر گرفت مضبوط کرلیتی۔ وہ بستر سے اٹھتا تو اس کا بستر بگڑ جاتا لیکن اس وقت وہ اس کی پروا نہ کرتا۔ اس وقت قاعدے قوانین کے خلاف سخت بغاوت اور رد عمل اس کے اندر سانپ کی طرح پھنکار مارتا۔ اپنی کافی بناکر وہ اسی بے ترتیب بستر پر بیٹھ کر اپنی گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتا۔ اس کے بعد بقیہ وقت وہ پوپ میوزک اور وسوسوں میں گزارتا کہ جب وہ دفتر جائے گا تو اس کی غیر حاضری پر ایک طوفان اٹھے گا۔ اس غیر حاضری کی اس سے وجہ پوچھی جائے گی' لوگوں کے رویئے میں انتقام ابھرے گا' طرح طرح سے وہ دکھ پہنچانے کی کوشش کریں گے اور پھر اس کی جان عذاب میں پڑ جائے گی۔

جب ملازمت کے چھوٹ جانے کا خطرہ اس کے ذہن میں آتا تو اس کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا۔ وہ بدحواس ہو کر خود کو ان وسوسوں کے سپرد کردیتا جو اس کے اندر درد کی لہریں بن کر چلتے پھرتے اور دکھ پہنچاتے پھر وہ اسی مختصر سے ریستوران میں چلا آتا' یہاں وہی لڑکیوں کا انتظار' ریستوران کی وہی پرانی صورتیں۔ ان کی گفتگو کے وہی فرسودہ موضوعات جن پر وہ روز ایک سے ہی خیالات کا اظہار کرتے اور نفسیات' ادبیات اور سیاسیات کی بھاری بھرکم اصطلاحوں کا بے جا استعمال کرتے یہ آوازیں برابر اس کے کانوں سے ٹکراتی رہتیں۔ لیکن دفتر سے ناغہ کا خوف برابر اس کے اندر اژدہے کی طرح بیٹھا رہتا اور اسے کسی چیز میں دلچسپی نہ لینے دیتا۔

بس وسوسے تھے جو اس کے اندر لہراتے رہتے وہ تصور کرتا کہ ناغہ کے بعد وہ آفس پہنچا' لوگوں نے اس کی موجودگی کا نوٹس نہ لیا' اپنی باتوں میں مصروف ہیں لیکن ان کے چہروں پر جو تاثر ہے اس میں اس کے ناغہ کا احساس سب پر غالب ہے جس نے انہیں اس رویئے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد پھر ان کی دہکتی ہوئی آنکھوں سے واسطہ پڑا اس کے بعد فائلوں کا ڈھیر اس کا آس انچارج جو ذرا انصاف پسندانہ رویہ رکھتا تھا۔ اس کے تصور میں اس وقت جو کچھ گزر رہا تھا دفتر کی زندگی میں بارہا وہ ایسے تجربوں سے گزر چکا تھا اور ان تجربات کی جس جس جزو سے اسے دکھ پہنچا تھا اس وقت وہ پوری تفصیل سے اس کے ذہن میں گزر رہے تھے جب اسے اپنا آفس انچارج یاد آیا تو پھر اسے اس کے رویئے میں تبدیلی کا احساس ہوا جو ملک میں رنگدار لوگوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کا اثر تھا لیکن اس اندرونی تبدیلی کے باوجود اس کے آفیسر نے مسکراہٹ اور صبح کے سلام کو بڑے اہتمام سے قائم رکھا۔ اس تبدیلی سے پہلے اور اس تبدیلی کے بعد عبید سے جتنی مرتبہ ملاقات ہوئی وہ مسکراہٹ کے پھول ضرور برساتا۔ لیکن اب اسے وہ کوئی اہمیت نہ دیتا وہ سوچ میں پڑ جاتا کہ ان سے تعلق قائم رکھنے میں اب کون سی تیکنیک وضع کروں؟

لندن میں (ایک دن میں کبھی کبھی) بدلنے والے موسموں میں رہتے ہوئے اسے یہ ضرور آگیا تھا کہ وہ اپنے اس انچارج کی ساری تبدیلیوں کو سمجھ سکے لیکن اس جانکاری کو وہ ہمیشہ اپنے چہرے کے تاثر' خیالات اور رویئے سے کبھی ظاہر نہ ہونے دیتا۔ اور پھر اس کا آفس انچارج ایک معمولی دفتری آدمی تھا' اس کی ذہانت اور چالاکی وہی تھی جو اسے

اپنے ماحول اور تعلیم سے ملی تھی جس میں اس کے ذاتی تجربوں نے کوئی ندرت پیدا نہ کی لیکن عبید اپنی منافقت اور ذہانت کی وجہ سے ذرا خلاق Creative ہوگیا تھا۔

حالات اور معمولات کے اعتبار سے ہمیشہ تیکنیک کے تجربے کرتا رہتا۔ کبھی کبھی اپنی اس اکتاہٹ کی موجودگی میں بنیادی تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس کرتا۔۔۔ لیکن ب اس غیردلچسپ زندگی میں پیوند لگا کر وہ اسے دراز کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ وہ اس دفتر کی محفوظ زندگی کا کیا کرے؟ سوائے کھانے پینے کے علاوہ اسے یہاں کیا ملتا ہے۔

اور وہ اسی زندگی کو صلیب کی طرح اٹھا کر ایک دن بوڑھا ہو جائے گا۔ پھر اسے اپنے مدرسے کے دینیات کے طلباء یاد آئے جن کی زندگی کو نظرانداز کرکے اس نے بالکل مختلف زندگی گزارنے کی سوچی تھی لیکن ان دنوں وہ جس معاشرے میں کھڑا تھا یہ اس قسم کے کالے آدمی کے لئے انتہا تھی اس کے اردگرد کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ البتہ تعلیم کی طرف جاتا تو پروفیسری سے آگے نہ بڑھتا' لیکن اس کے لئے اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے۔

دوسرے دن اس نے پھر ناغہ کرلیا' سونے سے بھی جب اس کی بوریت کم نہ ہوئی تو Heath کے بازار میں گھومتا رہا۔ وہاں اسی اپنی کمپنی کا ایک ڈائریکٹر مل گیا اس نے اسے مسکرا کر سلام تو ضرور کیا لیکن خوف سے اس کے دل کا برا حال ہوگیا' ذہن نے اس وقت اس کی مدد کی اسے ایک ترکیب یاد آئی وہ فوراً" پبلک ٹیلی فون پر گیا اور آفس کی ادھیڑ عمر سیکریٹری کو فون کیا جو اس پر ذرا مہربان تھی اس مرتبہ وہ اپنی طبیعت کی ناسازی کا تذکرہ تو نہ کرسکا کیونکہ اس معذرت کو وہ کئی بار استعمال کرچکا تھا۔ ڈائل گھماتے ہوئے اس کا ذہن بالکل صاف ہوچکا تھا اس لئے جب اسے جواب ملا تو اس نے نہایت محبت اور چاہت کے بناوٹی لہجے میں اس مرتبہ مکان تلاش کرنے کا عذر پیش کیا۔ محترمہ نے بھی چاہت سے جواب دیا کہ اس فون سے پہلے اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ غیرحاضر ہے۔ اس کے بعد مکان کا پوچھا اس نے دو چار فقرے اس کے متعلق بھی کہے تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں تم اپنی تلاش جاری رکھو یہاں تمہارے معاملے کو میں سنبھال لوں گی عبید نے اسی محبت اور چاہت کے لب ولہجے میں محترمہ کا شکریہ ادا کیا۔

جب وہ پھر سڑک پر آیا تو اسے چند لمبے بالوں والے ہپی لڑکے اور لڑکیاں نظر آئے جو عربی لباس پہنے ایک بند دکان کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے خوب ہنس رہے تھے عبید

نے اس وقت ان کی آزادی اور بے فکری کو بڑی حسرت سے دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ کیسے آزاد لوگ ہیں جو صرف اس وقت کام کرتے ہیں جب انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ خود ایسی زندگی اس ملک میں نہیں گزار سکتا کیونکہ وہ کالا ہے اس کے بعد پھر اسے اپنا گاؤں اور اس کی آزادی یاد آئی تو اس نے اسے بھی بڑی حسرت سے یاد کیا۔

ان ساری مجبوریوں کے ساتھ عورت کی پیاس بھی تو اس کے ساتھ تھی آخر اسے بجھائے بغیر وہ خود کو کس طرح زندہ محسوس کر سکتا تھا اس وقت وہ پریشانیوں اور ذہنی اذیتوں کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا۔

۷۰ء کے الیکشن جیسے جیسے قریب آرہے تھے رنگدار لوگوں پر اسکن ہیڈ کے حملے بھی اسی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے اس لئے اس خوف کی وجہ سے اس نے اپنا زیادہ وقت اپنے فلیٹ میں گزار کر ٹیلی ویژن کے سپرد کر دیا۔ لیکن یہ ٹیلی ویژن کی فلمیں اس کی تنہائی کی آگ کو اس کے اندر اور بھڑکا دیتی تو بڑا محتاط ہو کر وہ اپنے فلیٹ سے باہر نکل کر اس راستے پر چلنا شروع کر دیتا جہاں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہو لیکن کبھی کبھی اسے وہاں بھی چند اونچی پتلون بوٹ پہنے ہوئے لڑکے نظر آتے تو اس پر خوف طاری ہو جاتا اور چوکنا ہو کر وہ جلدی جلدی اپنا راستہ طے کرتا۔ اسی ریستوران میں آکر بیٹھ جاتا جہاں وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی زندگی کے کئی سال تباہ کر چکا تھا۔

ایک شام وہ اپنے اس معمول سے بھی تنگ آگیا تو وہ ایک دوسرے ریستوران میں چلا گیا جو اغلام بازوں Homo sexuals کے لئے مشہور تھا۔ یہ ریستوران ایک بڑے مشہور انگریز شاعر کے گھر کے قریب تھا۔ اس کے سامنے اکثر کبوتر بیٹھے اونگھا کرتے جب وہ اندر پہنچا تو سامنے اسے ایک قد آدم چینی مصور کی تصویر نظر آئی اور اس کے قریب چند ادھیڑ عمر کے لوگ بیٹھے شطرنج کے کھیل میں مصروف تھے۔ دوسری طرف جو آرام دہ سیٹیں تھیں ان پر دو چار خریدار بیٹھے ہوئے بات چیت میں مصروف تھے کوئی خاموش بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک عورت بیٹھی خاکے بنا رہی تھی۔ ریستوران کے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد وہ ان کھیلنے والوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ شطرنج کے کھلاڑی اپنے آس پاس کی دنیا سے بے خبر تھے اس وقت ان کی نظریں اوپر اٹھتیں جب دروازہ کھول کر کوئی خریدار اندر داخل ہوتا اسے دیکھتے ہی وہ پھر نظریں اپنے کھیل پر جما دیتے۔

ریستوران کے باہر چاروں طرف بازار تھا جب لوگ آپس کی گفتگو سے تنگ آجاتے تو لمبی خاموشی اختیار کرکے باہر کے راہ گیروں کو دیکھتے رہتے۔ لمبے بال اور میلے کپڑے پہنے ہوئے جو نوجوان بیٹھا ایک لڑکی سے زور زور سے بات چیت کر رہا تھا اس وقت وہ بھی خاموش ہوکر باہر کے لوگوں کے بجائے اپنی موٹی موٹی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھاکر پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ اس نئے ماحول کا عبید پر ذرا خوشگوار اثر پڑا۔ وہ پھر دلچسپی سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا خصوصاً" شطرنج کے کھیل پر کبھی کسی بازی کے بگڑنے اور پٹنے پر جو ایک زور کا قہقہہ پڑتا تو اس پر مسرور اشتعال سے اسے بھی ذرا دلچسپی ہو جاتی وہ سارے ماحول سے بے تعلق ہوکر اس کھیل کو دیکھتا رہتا۔ تھوڑی دیر بعد جیسے ہی ایک آدمی وہاں سے جو اٹھ کر گیا۔ عبید اس کی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا اور کھیل کو غور اور دلچسپی سے دیکھتا رہا اس کھیل کے تھوڑے سے مشاہدے سے اسے واقعی مزا آگیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اسے سمجھ کر اس میں شریک ہو۔

ان لوگوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے اس نے اپنا پرانا نسخہ استعمال کیا' پہلے تو جیتنے والے کو داد دینے والوں میں شریک ہوا۔ جس پر ابتدا میں لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن اب وہ ڈھیٹ ہوچکا تھا اس لئے اس روایتی کم آمیزی کو نظرانداز کرکے اس نے اس پر زیادہ توجہ صرف کی کہ اس جیتنے والے نے مسکراکر اس کی طرف دیکھا تو عبید نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر نہ صرف اسے بلکہ جتنے اس کے قریب سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے سب کو مسکراکر سگریٹ پیش کیا۔

سب نے نہیں بلکہ کچھ نے اس کے سگریٹ قبول کئے اس نے اسے ہی غنیمت جانا اور اس سے اسے تسلی ہوئی۔

جب رات ہونے لگی تو لوگ آہستہ آہستہ اس کھیل کے گرد سے سرکنے لگے تھوڑی دیر میں اس سیٹ پر وہ اور اس کے مقابل ایک ادھیڑ عمر کا یہودی تاجر رہ گیا جس نے اس کا سگریٹ سب سے پہلے قبول کیا تھا۔

''آؤ! ایک ہاتھ تمہارے ساتھ بھی ہو جائے'' یہودی تاجر نے ذرا تنہائی محسوس کرتے ہوئے عبید کو مخاطب کیا۔

''میں اس کھیل میں ماہر نہیں ہوں۔'' عبید نے جواب دیا۔ لیکن سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہاں کون ماہر ہے۔" تاجر جواب دے کر بورڈ پر گوٹیں پھیلانے لگا۔

کھیل شروع ہوا مشاہدے سے عبید نے جتنا حاصل کیا تھا اس کے سہارے اس کھیل کو وہ کھیلتا رہا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس سے چوک ہو جاتی تو اس کا حریف اسے سنبھال دیتا اور کھیل توازن سے آگے بڑھتا رہا۔ اس کھیل نے خود عبید کے اندر ایک قسم کی تحریک پیدا کردی تھی جس سے اس کے جذبات میں لہروں کا سا ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ جب وہ ہارنے لگتا اس کا حریف اسے پھر سنبھالا دیتا تو اب اسے اس سہارے سے بڑی وحشت ہوتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے بدن کو پیٹ لے کیونکہ اس قسم کے سہاروں سے خود اس کی نفی ہوتی اور کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ اپاہج ہوگیا ہو۔ لیکن ٹھوکر کھاکر یا سہارے سے وہ خود جیتنے لگتا تو خوشگوار قسم کی کیفیت ان میں پیدا ہوتی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ تھوڑی سی ٹھوکروں اور سہاروں کے بعد وہ سنبھل کر کھیلنے لگا تو اس کے یہودی حریف نے اسے محسوس کیا اب اس میں جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اسے گرائے۔ آخر تھوڑی دیر کا سکھایا ہوا اس کا اپنا شاگرد اس سے کیسے بازی لے جائے' گوٹیں واقعی اب بڑے نازک مرحلے پر آگئی تھیں۔ دونوں سنجیدہ پڑگئے تھے۔ اب ان کے چہروں پر دوستانہ کیفیت طاری نہ تھی دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب کھیل ختم ہوا تو عبید ہار چکا تھا اور جیت نے یہودی کے چہرے کو پھر نارمل کردیا تھا اور عبید کی تھوڑی سی دیر کی مشق کی تعریف کرتا رہا۔

عبید پر اس تحسین کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے دل و دماغ میں تو اس شکست کا ایک گہرا گھاؤ پڑ چکا تھا۔ یہودی تاجر اس کی پیٹھ تھپتھپا کر چلا گیا اور وہ وہیں اداس بیٹھا رہا۔

(لندن۔ ۱۹۷۴ء)

کچھ دل کے سہارے

ریستوران میں اب صرف چند لوگ رہ گئے تھے ان کے آس پاس جو کچھ تھا اس کو دیکھتے اور برتتے ہوئے وہ بے حس سے ہوگئے تھے۔ خاموشی تو پہلے ہی سے ان کے ساتھ سائے کی طرح تھی باہر کی دنیا کا ادنیٰ سا حادثہ بھی ان کی خاموشی میں صرف ایک طرح کا ارتعاش پیدا کرتا۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر اسی خاموشی میں واپس چلے جاتے۔ عبید بھی اس وقت ان خاموش لوگوں میں شامل تھا اور اداس بھی۔ اپنے دل کی اداسی سے اب وہ بڑا ڈرنے لگا تھا۔ جب اس اداسی کے پیدا کردہ خوف کا دباؤ اس کے اندر بڑھا تو پھر اس نے اپنے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی تو سامنے ایک نوجوان عورت بیٹھی ہوئی اسکیچ بنا رہی تھی وہ اسے بار بار دیکھتی جب وہ اس سے نظریں ملانے کی کوشش کرتا تو وہ اپنی نظریں پھیر کر اپنے اسکیچ میں مصروف ہو جاتی اس نے محسوس کرلیا کہ وہ خود اس کی توجہ کا مرکز ہے لیکن اس قیاس کی تصدیق کے لئے اس نے شہادت کی ضرورت محسوس کی کیونکہ لباس اور طور طریق سے وہ جوان عورت انگریز معلوم ہو رہی تھی اور انگریز عورتوں کی بے اعتنائی اور روایتی تمکنت کا پہلے ہی اسے تجربہ تھا کہ کوئی جوان اور قبول صورت انگریز عورت بھری مجلس میں ایک کالے آدمی میں دلچسپی نہیں لیتی لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے پھر نظریں اٹھا کر عبید کو دیکھا تو اس بار وہ مسکرا دی، یہ مسکراہٹ

عبید کے لئے ایک طرح کی تصدیق تھی۔ اس کی مسکراہٹ کا اس نے بھی مسکراہٹ سے جواب دیا اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہ اس کے پاس آگیا اور قریب بیٹھنے کی اجازت چاہی۔

"ضرور ضرور۔" نوجوان عورت نے اپنا چمڑے کا تھیلا اسی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

عبید اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سراپے پر ایک بار پھر نظر ڈالی۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اسے سگریٹ پیش کی عورت نے مسکراہٹ سے وہ بھی قبول کرلی تو پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کے جسم کا اپنے ذہن میں جائزہ لیا جس سے اس میں ایک قسم کا جنسی اشتعال پیدا ہوا۔ اس سے اداسی کا پیدا کردہ دکھ اس کے اندر کسی قدر کم ہوگیا وہ دونوں ابھی تک خاموش بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ عبید نے پھر اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس مرتبہ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں اور عمر کی پڑی ہوئی پختہ لکیروں کو غور سے دیکھا جسے اس نوجوان عورت نے میک اپ سے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ چہرے کے جائزے سے اسے ذرا مایوسی ہوئی لیکن آخر وہ ایک عورت تھی نوجوان نہ سہی جوان تو تھی یہی ۳۰ کے لپیٹے میں۔

"کس تصویر پر کام کر رہی ہو؟" آخر عبید نے سکوت کو توڑا اس نے اسکیچ اس کے سامنے کردیا۔

"اچھا تو میں اتنا اہم ہوں؟"۔

"ہاں۔" اس نے تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ حامی بھری۔

"تو کیا میں اس ڈرائنگ کو غور سے دیکھ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے کیا بنا دیا؟"۔

"نہیں میں نے آپ کو کچھ نہیں بنایا بلکہ جو کچھ میں نے پایا اسے نقش کرنے کی کوشش کی"۔

"بہرحال وہ بھی دلچسپ چیز ہوگی"۔

"معلوم نہیں۔" اس مرتبہ عورت نے جواب دے کر اسکیچ اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس عورت نے ساری توجہ اس کے چہرے کے تاثرات پر صرف کی تھی۔ انہیں نمایاں کرنے کے لئے اس نے ذرا گہری پنسل کا استعمال کیا تھا۔ اسکیچ میں ان کیفیتوں نے اس کے خدوخال کو بڑا ماند کردیا تھا صرف اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مایوسی کے

ساتھ تھوڑی سی چمک اس نے ضرور دکھائی تھی آرٹ کو سمجھنے کی فنکارانہ اور تنقیدی صلاحیت عبید کے اندر بالکل نہ تھی۔ البتہ اس تصویر نے بڑا بھیانک تصور اس کے اندر ابھارا اور وہ سنجیدہ پڑ کر دیر تک اس اسکیچ کو دیکھتا رہا اور مایوسی کے دورے اس کے اندر شعلوں کی طرح لپکنے لگے۔

"تم اس اسکیچ میں آنکھوں پر توجہ نہیں کر رہے۔" عورت نے پھر سکوت توڑا۔

"ہاں خاکہ بہت خوب ہے"۔

"نہیں تمہارے چہرے پر اس وقت جو تاثر ہے اس سے وہ داد نہیں مل رہی جو تمہارے الفاظ میں ہے"۔

"نہیں یہ بات نہیں میں ذرا تھکا ہوا ہوں۔ شطرنج میں دو گھنٹے مصروف رہا"۔

"ہاں میں اس مصروفیت کو بھی دیکھ رہی تھی"۔

اس مرتبہ عبید نے اسے کوئی جواب نہ دیا صرف اس کا بنایا ہوا خاکہ دیکھتا رہا۔ باہر شام کا اندھیرا بڑھتا جارہا تھا' ابر نے اپنے رنگ سے اسے اور سہانا کردیا تھا۔ آس پاس کے کہرآلود پرانے زمانے کے مکانوں میں بجلی کے بلب روشن ہوچکے تھے۔ ریستوران کا مالک بھی اٹھا اس نے بتی جلا کر نئے خریداروں کے لئے پرانے کپڑے سے ٹیبلیں صاف کیں۔ مینو اٹھا اٹھا کر ٹیبلوں پر سجایا اور ایش ٹروں میں سے دن بھر کی سگریٹوں اور سگار کی راکھ اور چائے کی پتی کے تھیلے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال کر انہیں صاف کیا پھر انہیں بھی ٹیبلوں پر رکھ کر اور ان دونوں کے پاس آکر پوچھا۔

"کچھ اور چاہئے' یہ ذرا بازار کا وقت ہے"۔

"ہاں ضرور۔" عبید توہین کے احساس سے گھبرا کر دکاندار کو جواب دے کر' نوجوان عورت سے مخاطب ہوا۔

"آپ کافی یا کوئی ٹھنڈی چیز؟"۔

"مجھے دودھ کا ایک گلاس۔" عورت نے جواب دیا۔

"کچھ کھانے کے لئے بھی"۔

"ابھی نہیں"۔

ایک کافی ایک دودھ کے گلاس کا آرڈر لے کر دکاندار کے چہرے پر ہلکا سا ناگوار تاثر

ابھرا کیونکہ ان دونوں کو یہاں بیٹھے ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا۔

"آپ اس ملک میں کب سے ہیں؟" عورت عبید سے پھر مخاطب ہوئی۔

"یہی ۶ سال"۔

"کہاں سے آئے؟"۔

"پاکستان سے۔" غیرشعوری طور پر یہ جواب اس کے ذہن میں ابھرا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ آج برطانیہ میں پاکستانی ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کچھ سوچ کر پھر دوسرا جواب دیا۔

"نیروبی سے"۔

"تمہارا نام"۔

"عبید"۔

تمہارا نام"۔

"جینی"۔

"لندن میں رہتی ہو؟"۔

"ہاں فی الحال"۔

"میرا مطلب ہے انگلینڈ تمہارا وطن ہے؟"۔

"ہاں میں پیدا یہاں ہوئی ہوں لیکن دنیا میں میرا کوئی وطن نہیں۔ جہاں دن گزر جائیں وہ میرا وطن بن جاتا ہے"۔

"یوں کہو تم بین الاقوامی ہو"۔

"معلوم نہیں میں کیا ہوں۔" جینی نے جواب دے کر اپنے میلے چمڑے کے تھیلے سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر پہلے عبید کو پیش کی اس کے بعد پھر اپنے ہونٹوں سے' عبید کا لائٹر پہلے سے تیار تھا۔ اس نے پہلے اس کا سگریٹ جلایا اس کے بعد اپنا پھر مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی"۔

"مجھے بھی خوشی ہوئی۔" جینی نے مسکراہٹ سے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا موضوع کیا ہے؟" سگریٹ کے دو چار لمبے کش لے کر عبید جینی سے پھر

مخاطب ہوا کیونکہ یہاں عورت سے اگر تھوڑا سا بھی تعلق پیدا ہو جائے تو پھر مرد کو ہمیشہ خود کو دلچسپ بنائے رکھنا چاہئے ورنہ خاموشی عورت کو پھر مرد سے بددل کردیتی ہے عبید کو اس کا تجربہ بھی تھا اور اس وقت احساس بھی۔

"مجھے لوگوں کے چہرے اور تاثرات سے دلچسپی ہے۔" جینی نے پھر معنی خیز نظروں سے عبید کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بڑا مشکل اور بڑا دلچسپ۔" عبید نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

"ہاں مشکل کا تو مجھے احساس نہیں البتہ دلچسپی کا ضرور ہے"۔

اس جواب کے بعد عبید نے پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں یہاں عورت کے ساتھ انتہا درجہ کی تشنگی بھی تھی۔ ان نظروں کو عبید نے اس وقت آنچ کی طرح محسوس کیا اور مسکرا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جینی نے اپنے ہاتھ کو اور ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تو عبید نے اس کے جواب میں اسے زور سے دبا دیا۔ جینی عبید کے اور قریب ہوگئی۔ اس قرب سے عبید کے اندر مسرت فوارے کی طرح پھوٹ پڑی وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ بلکہ بچوں کی طرح۔ پھر اس نے جینی کے وجود کی تعریف کی تو جینی کا کیف اور نشہ اور گہرا ہوگیا۔ اس وقت اس کی قربت میں وہ اپنی ساری محرومیاں بھول چکا تھا۔ اس قربت کی پیدا کردہ کیفیت جینی پر بھی طاری تھی جو اسے اس قربت میں محو کردینا چاہتی تھی اور اب وہ بات کرنے سے زیادہ محسوس کرنا چاہتا تھا۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ اب رات کے مسافر بھی ریستوران میں آنا شروع ہوگئے تھے۔ گزرتے ہوئے وقت کا عبید کو ذرا احساس ہوا تو وہ پھر جینی سے مخاطب ہوا۔

"جینی! کیا خیال ہے Heath کا ایک چکر لگایا جائے تاکہ تازہ ہوا ملے"۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" جینی نے رضامندی کا اظہار کرکے اپنا ڈرائنگ پیڈ ٹھیک کیا اور بیگ گلے میں ڈال کر کھڑی ہوگئی۔ کاؤنٹر پر آکر عبید نے بل ادا کیا تو جینی نے بھی اپنے تھیلے سے پرس نکال کر اپنا حصہ ادا کرنا چاہا تو اس نے اس کا ہاتھ روک دیا۔ اس کاؤنٹر پر دو شلنگ ٹپ کے لئے چھوڑ کر وہ دونوں ریستوران سے نکل آئے۔

رات اندھیری تھی لیکن آسمان ستاروں سے سجا ہوا تھا۔ اور Heath کے گھنے پیڑ

اس اندھیرے میں ذرا گہرے دھبوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پورے ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہوا بھی سرد تھی۔ کبھی کبھی سڑک سے کوئی کار فراٹے بھرتی ہوئی گزر جاتی۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی اس وقت وہ خود بھی اس ماحول کی خاموشی کا حصہ بن چکے تھے۔ اس سرد رات میں ایک دوسرے کے قریب آ کر وہ صرف ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔

"آج ہوا بڑی سرد ہے۔" جینی نے اپنے کندھے پر کارڈیگن سرکاتے ہوئے باہر کی دنیا کا احساس کیا۔

"ہاں۔" عبید نے کہا۔ جینی اس طرح کی قربت کی برسوں سے پیاسی تھی اس نے عبید پر اپنی گرفت مضبوط کرنی چاہی تھوڑے فاصلے پر Pub (شراب خانہ) شراب خانہ تھا جینی کی اس پر نظر پڑی۔

"کیا تمہیں ڈرنک سے دلچسپی ہے؟"۔

"ضرور"۔

جب وہ پب میں آئے تو لوگوں کی ان دونوں پر نظر پڑی جو ادھیڑ عمر کے تھے وہ خاموش بیٹھے انہیں دیکھتے رہے نوجوان نے ان دونوں کا ایک جائزہ لے کر ان کی طرف سے نظریں پھیرلیں البتہ شراب بیچنے والی سنہرے بالوں والی لڑکی عبید سے ضرور کاروباری خوش اخلاقی سے پیش آئی۔

"کیا۔" عبید جینی سے مخاطب ہوا۔

"میرے لئے Vodka and Lime"۔

عبید نے اپنے لئے Bitter کا آرڈر دیا۔

دونوں اپنے اپنے گلاس لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ وہاں چند ادھیڑ عمر کے مقامی ضرور بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے سامنے نگر پر ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ بعض تنہا لوگ بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے اور نوجوان لڑکیوں سے خوش گپیوں اور قہقہوں میں مصروف تھے۔ فرش پر دبیز سرخ قالین تھا دیواروں پر انگلش دیہاتی زندگی کی تصویریں اور کاؤنٹر پر بڑے پیتل اور تانبے کے برتن قرینے سے رکھے ہوئے تھے اور سگریٹوں کا دھواں تمباکو اور شراب کی خوشبو فضا میں رچی بسی تھی' دوسرے کونے میں ایک تنہا نوجوان بیٹھا بیئر کے

گلاس کو سر جھکائے دیکھ رہا تھا وہ بڑا اداس نظر آرہا تھا۔ اس کے سانس لینے کی آواز یہ دونوں فاصلے سے سن سکتے تھے لیکن سوائے عبید کے یہاں اس کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ ہر شخص اپنے حال میں مگن تھا کبھی کبھی انہی بیزار اور خاموش نگاہوں سے وہ عبید کو بھی دیکھتا عبید نے اس کی نگاہوں کے تعاقب کو محسوس کیا تو اس میں ذرا تشویش محسوس کی اور چند ہی لمحے بعد اس احساس نے اس کے اندر خوف کی صورت اختیار کرلی لیکن اس خوف پر قابو پانے کے لئے اس نے انتہائی کوشش کی اور اس خوف سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ بڑی چاہت سے جینی کو دیکھتا رہا۔

"شراب میں رنگی ہوئی تمہاری آنکھیں بڑی خوبصورت ہوگئی ہیں"۔

"تم مجھے واقعی پسند کرتے ہو؟" جینی نے اس کے جواب میں پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ عبید نے شعوری طور پر اپنی آنکھوں کو اور کھول دیا اور جواب دینے کے بجائے بڑی چاہت اور تمنا سے اسے دیکھتا رہا۔ دونوں پھر خاموش ہوگئے۔ عبید نے پھر شرابی نوجوان کو دیکھا جو اب انہیں گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک ناگوار احساس تھا۔ عبید کا دل پھر خوف سے بھر گیا۔ پھر اس نے رات کی تنہائی کا احساس کیا اور اس وقت اسے شہر کی سیاسی فضا بھی یاد آئی جس میں رنگ کے امتیاز کا احساس کافی ابھر آیا تھا اور شہر میں کالوں پر آئے دن کی خبریں روز اخبارات میں آتی رہتی تھیں۔ اس سارے تجزیے سے اس کی حالت بری ہوگئی اور اس نے یہاں سے جانے کا ارادہ کرلیا۔

"اگر وقت ہو تو میرے گھر چلو۔" اس ارادے کے تاثر سے اپنے رویئے کو آزاد کرکے عبید نے پھر چاہت بھری نظروں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

جینی نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر عبید نے اس کی آنکھوں کو پڑھا وہاں اعتراف موجود تھا۔ خاموشی سے وہ پھر اس پب سے باہر آگئے۔ گھر پر بھی سارا وقت محسوسات میں گزرا جینی نے پھر گھر جانے کی خواہش ظاہر کی وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھی اٹھ کر اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھا اپنے بال سنوارے۔ دونوں فلیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آگئے اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آخری ٹرین جاچکی ہے۔ اس نے ایک ٹیکسی کی ایک پونڈ کا نوٹ کرائے کے لئے اس کے تھیلے میں ڈالا اور پوچھا۔

"دوبارہ ملاقات ہوگی؟"۔

"اگر آپ چاہیں گے؟"۔

عبید نے جلدی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اس پر اپنا فون نمبر لکھا۔ دوسرے دن اسٹیشن پر شام کو ملنے کا وقت مقرر کیا ٹیکسی روانہ ہوئی دونوں نے چاہت سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر رات کا سلام کیا جب کار اس کی نظروں سے غائب ہوگئی تو وہ پھر اپنے فلیٹ میں آگیا اور بستر کو دیکھتے ہی وہ اس پر دراز ہوگیا۔ جینی اب پھر اس کے تصور میں آئی اس نے اس کے متعلق پھر سوچنا شروع کیا۔ اس کی قربت کا لطف اس پر ابھی تک نشے کی طرح طاری تھا۔

لیکن اس کا تجربہ کار ہوشیار ذہن اس لذت کی گرفت میں نہ تھا وہ اس وقت اس کے وجود کا ایک ایسا حصہ بن گیا تھا جو چوٹ کھا کر الگ جا پڑا ہو۔ لیکن اس کیف کی موجودگی میں اس نے اپنے ذہن کی چنداں پرواہ نہ کی اور شعوری طور پر جینی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس رویئے سے اس کی لذت دو آتشہ ہوگئی۔ اس وقت اس کے ذہن میں پوری ملاقات اپنی ساری جزیات کے ساتھ موجود تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لذت سے سیر ہوگیا تو اس کا ذہن پھر اس کے اندر بیدا رہوا۔ اب یہ بات اسے اچھی نہ لگی کہ ایک عورت اتنی جلدی اس کے سامنے سپر ڈال دے اور اس کے فلیٹ میں آجائے۔ ذہن میں اس خیال کے آتے ہی اس کی وقعت اس کے اندر کم ہوگئی۔ پھر اسے اس کی مونچھیں اور عمر یاد آئی تو وہ اس کے دل سے اترنے لگی۔ لیکن پھر اس کی یاد نے چودہ طبق اس کے اندر روشن کردیئے اب جینی کی ایک ایک حرکت اس کے تصور میں ابھر کر اسے بے چین کرتی رہی۔ اس تصوراتی کیف کی موجودگی میں وہ پھر اپنے ذہن کی تنقید اور مشورے بھول گیا۔ پھر جینی کی اس کی شخصیت سے متاثر مسکراتی ہوئی آنکھیں چمکیں تو خود پر اعتماد اس کے اندر سورج کی طرح ابھرا اور اس نے سوچا کہ آخر اس کے اندر کچھ تو ہے کہ عورت ذرا اس کے قریب تو آئی۔ اب نیند سے اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ اور وہ سو گیا۔

دوسرے دن اسٹیشن پر جینی سے پھر ملاقات ہوئی تو لباس تو اس کا وہی تھا مشرقی ڈیزائن والی رضائی کے کپڑے کا لمبا عربی خفطان ہاتھوں میں چوڑیاں گلے میں مشرقی گلوبند' کانوں میں مشرقی لمبے بندے' پیروں میں چپل' لبوں پر ہلکی گلابی تحریر اور زلفیں ناگنوں کی

طرح کندھوں پر پڑی ہوئیں۔

اس دن وہ اسے ویسٹ اینڈ کے ایک پاکستانی ریستوران میں لے گیا وہاں انہوں نے کھانے کے بعد زیادہ وقت صرف نہیں کیا۔ جیسے ہی جینی کی سگریٹ ختم ہوئی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ریستوران کے باہر آکر رات میں آس پاس کے ماحول پر نظر ڈالی۔ رات تاریک ہوتی جارہی تھی لیکن لندن طرح طرح کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ریستوران' سینما' کلب' تھیٹر لوگوں سے بھرے ہوئے تھے اور بہت سے نوجوان سڑکوں پر آوارہ گھوم رہے تھے اس وقت اسے ویسٹ اینڈ کی تنگ گلیوں میں گھومنے کی خواہش پیدا ہوئی اس کے لئے اس نے جینی سے پوچھا اس آوارگی میں اسے اس وقت کوئی اعتراض نہ تھا وہ اپنے دائیں طرف دنیا کی مشہور و سحرزدہ دنیا سوہو کی طرف مڑ گئے۔

اس مختصر سی دنیا میں چھوٹی چھوٹی تنگ اور تاریک گلیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اکثروبیشتر آپ کو یہاں غیر ملکی ریستوران ملیں گے۔ ان گلیوں میں آوارگی کرتے ہوئے وہ اس ماحول سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

آخر سوہو کی ایک تنگ گلی کے نکڑ پر ایک نیم تاریک ریستوران میں جاکر بیٹھ گئے جہاں روشنی کے لئے ٹیبلوں پر موم بتیاں روشن تھیں دیواروں پر سرخ اور سیاہ رنگ کے رسالوں اور اخباروں سے کاٹے ہوئے پیڑوں کی تصویریں' جگہ جگہ ننگی عورتوں کی تصویریں سینما کے پوسٹر اور ایک کونے میں ایک اطالوی موسیقار گٹار پر بیٹھا محبت اور دنیا کی بے ثباتی' اس پر آدمی کی تنہائی کا بڑے درد بھرے انداز میں گیت الاپ رہا تھا۔ وہ دونوں اس ریستوران میں ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ یہ ریستوران بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا جو اپنی وضع قطع سے خود کو ادب و آرٹ کا دلدادہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان ویٹرس اس کے پاس آئی اور آرڈر طلب کرنے سے پہلے اس سے کہا کافی کی قیمت یہاں ڈھائی شلنگ ہے۔ عبید نے اس کی اطلاع کو نظرانداز کرتے ہوئے انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کے لہجے میں کہا' مینو لاؤ۔

ویٹرس نے دوسری ٹیبل سے مینو اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

"بتاؤ جان من تمہیں کیا چاہئے۔" عبید نے مینو جینی کو دیتے ہوئے پوچھا۔

"چیز کیک۔" جینی نے مسکراتے ہوئے مینو عبید کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے بھی وہی پسند ہے جو تمہیں۔" عبید نے مسکراتے ہوئے مینو کو الگ رکھ دیا۔

ویٹرس چلی گئی تو پھر انہوں نے فضا میں گونجتی ہوئی اطالوی موسیقی پر توجہ دی موسیقار بار بار یہی فقرا ادا کرتا جارہا تھا۔ "دنیا اور محبت کو ثبات نہیں میں اپنی تنہائی کیسے دور کروں"۔

اس شعر کو سن کر عبید نے جینی کے اور قریب ہوتے ہوئے ذرا سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "مجھے تم سے محبت ہے"۔

"ہاں مجھے اس کا یقین ہے مجھے تمہاری آواز بتا رہی ہے۔" جینی نے جواب دیا۔

وہ اس جواب سے بڑا سرشار ہوگیا۔ اس وقت یہ جملہ اس کے جذبے کی سچی ترجمانی تھی اس میں اس نے ابھی منافقت کا کھوٹ شامل نہیں کیا تھا۔ پہلی مرتبہ سچائی کے احساس کے اظہار سے اس نے ایک خاص قسم کا سرور حاصل کیا اس کے بعد زناکاری کے جذبے نے اس پر منوں مٹی ڈال دی۔

اس رات بھی اس سے جدا ہوکر اس کی شادمانی میں گزری اور جب وہ دفتر پہنچا تو سارا دن اس کا ذہن جینی کے تصور سے معطر رہا۔

جینی نے اس کی زندگی میں قدرے ترتیب پیدا کردی اور وہ خود بھی اس تازہ عشق سے جیسا کچھ تجربہ اسے ملا تھا اسے وہ مختلف انداز اور رنگوں میں اپنی تخلیقات میں ظاہر کرتی رہی۔ جب وہ عبید سے ملتی تو اس کی عجیب کیفیت ہوتی۔ عبید اس کی زندگی میں پہلا کالا آدمی تھا وہ سوچتی یہ لوگ اپنے انسانی رویوں میں کتنے نرم اور عشق میں کتنے سخت ہوتے ہیں۔ جینی کا قد ذرا درمیانہ تھا زلفیں ہمیشہ اس کے شانوں پر بادلوں کی طرح منڈلایا کرتیں، جسم بڑا تندرست تھا۔ گھرانا اچھا خاصہ تھا۔ اس کے سارے بہن بھائی کسی نہ کسی ملازمت یا پیشے سے وابستہ تھے ان کے خاندان میں صرف یہی لڑکی تھی جو آزادی کی سب سے زیادہ طلبگار اور دلدادہ تھی ویسے اس گھرانے میں عیسائیت اور قومی روایات کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ آزادی کی طلب اور بغاوت کے باوجود ان دونوں اثرات کو وہ اپنے کردار سے جدا نہ کرسکی اور بعض مرتبہ جب اسے روزمرہ کی زندگی میں چوٹیں کھانا پڑتیں تو عیسائیت نہیں بلکہ اپنی قومی خصوصیات خصوصاً" انگلش غرور اور اپنی طبقاتی حیثیت میں پنہاں ہو جاتی لیکن طبیعت کے اعتبار سے وہ بڑی ملنسار اور لبرل تھی۔ اس

نے اپنی جوانی کے اٹھتے ہوئے دن ادب و آرٹ، شعروشاعری کے سپرد کردیئے۔ آزادی کی خاطر سارے یورپ میں تتلی کی طرح چکر لگائے، جس پر دل آیا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ جوانی کے دنوں میں وہ واقعی تتلی ہی بنی رہی۔ طرح طرح کے مردوں سے ملتی رہی۔ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی کے زمانے میں مختلف خیالوں نے اسے تجربے پر اکسایا اور آزادی اس میں سب سے اہم تھی۔ یہ آزادی اس کی زندگی میں کئی حیثیتوں سے ساتھ آئیں اس نے سب کو برتا اور سب سے جسمانی مزا لیا۔ کیونکہ ان دنوں یہی حس اس کے پورے وجود پر غالب تھی۔ لیکن مرد سے رشتہ پیدا کرنے کی آرزو اور کوشش نے اسے بڑا دکھ پہنچایا۔ سارے مرد جو محبت کا نام لے کر اس کے پاس آئے تھے ملگجے کسیلے دھوئیں کی طرح اس کے اندر غائب ہوگئے۔ کبھی تنہائی میں وہ اپنے ان عاشقوں کو یاد بھی کرنا چاہتی تو ان کی صورتیں تک اس کے تصور میں صاف صاف نظر نہ آتیں۔ آخر سوائے جسم کے لمس کے انہوں نے اس کے پاس چھوڑا ہی کیا تھا۔ ان جوانی کے دنوں میں تو جسم کا اتصال ہی اس کے لئے حاصل زندگی تھا۔ لیکن عبید کے تھوڑے دنوں کی قربت نے اس کے اندر ایک شدید اپنائیت کے جذبے کو ایک بیج کی طرح ڈال دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب یہ بیج اس کے اندر ایک ننھا پودا بنا اور جب تنہائی میں یہ پودا اس کے اندر لہراتا تو اسے جینے میں بڑا مزا آنے لگتا۔ اور اسی سے ملتا جلتا پودا عبید کے اندر پروان چڑھ رہا تھا جس میں (ابتدا میں) اس کے ارادوں اور منصوبوں کو کوئی دخل نہ تھا۔

عورت سے تعلق میں جو لطف اسے آرہا تھا اس سے وہ بے حد مسرور ہوتا رہا یہ احساس ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا کہ اب ایک عورت کا اس کو بھی قرب حاصل ہے۔ اس احساس نے اس میں بڑا جذباتی تحفظ پیدا کردیا تھا۔ سب سے زیادہ اثر اس کی دفتری زندگی پر ہوا۔ لیکن سوائے اس کے دل کے دفتر کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اس کے دل کی تبدیلی نے اب اس ماحول میں بھی اسے زندہ رہنا سکھا دیا جب کبھی اسے دفتر میں تنہائی مل جاتی تو ہلکی ہلکی سیٹیاں (جس سے اس کے جذبات میں ارتعاش پیدا ہوتا رہے) بجاکر اپنی محبت کے متعلق سوچنے لگتا جو کچھ گزر چکا ہے اس کی یاد سے پھر اپنی تنہائی کو سجاتا اور مستقبل کے منصوبے بناکر اپنی محبت کے سفر کو ذرا طویل کرنا چاہتا اور

اپنے ذہن کے سوالوں (جن کے اس کے پاس اس وقت جواب موجود نہ تھے) پر خاموش رہتا اور محبت کے ان ابتدائی دنوں میں جنسی تعلق سے زیادہ دل کا سہارا اسے سکون پہنچاتا۔

ریستورانوں کے گرد پروانے کی طرح چکر لگانے کا دور اب تقریباً" ختم ہوچکا تھا کیونکہ جینی جسے اس کے دفتر سے چھٹی کا وقت معلوم تھا اس کے دفتر کے قریب جو ٹیوب اسٹیشن تھا اسے لینے جاتی اور اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر (جس سے عبید ذرا پشیمانی محسوس کرتا اپنی تربیت کی وجہ سے) اس کے فلیٹ پر آتی اس کا بستر ٹھیک کرتی جسے وہ صبح ہی صبح توڑ مروڑ کر چھوڑتا۔ بے ترتیب چیزوں کو ان کے مقامات پر رکھتی۔ میلی قمیض تولئے جسے وہ الماری کی دراز میں ٹھونس کر رکھتا انہیں وہاں سے نکال کر لونڈریٹ (Launderette) کے بیگ میں ڈالتی۔ اس کے بعد اس کا کمرہ صاف کرتی۔ جو قمیض سوکھ جاتی اس پر استری کرتی' اگر کبھی اس کے موزے پھٹے ہوئے پاتی تو اسے اسی وقت سینے بیٹھ جاتی تھوڑے سے دنوں میں اس نے پاکستانی کھانے پکانے بھی سیکھ لئے خصوصاً" قورمہ اور بریانی وہ خوب پکاتی۔ لیکن روٹیاں پکانے میں ابھی مہارت حاصل نہ کرسکی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنا انگلش کھانا بھی تیار کرتی اور اسے ساتھ لے کر کھانا کھاتی۔ جینی کی اس مصروفیت میں جہاں اس کا منصوبہ شامل تھا وہاں اس کے دل کی چاہت بھی تھی' اور وہ گرہستی کا پورا لطف اٹھا رہی تھی اور سوچتی اب یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ اور کبھی وہ اپنی کوششوں کے دوسرے رخ پر نظرڈالتی اور سوچتی کہ اس کی یہ کوششیں اس کی زندگی میں بھی ترتیب پیدا کردیں گی جس سے متاثر ہوکر وہ خود گرہستی کا عادی بن جائے گا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ایک تنہا رہنے والے مرد کو اس طرح کا آرام پہنچا کر وہ اسے اپنا بنا سکتی تھی۔ رہی جنسی کشش اسے برقرار رکھنے کے لئے اپنی صحت اور بناؤ سنگھار کا خیال رکھتی اور ہروقت اس کی آسودگی کے لئے تیار رہتی۔ اس کے علاوہ ایک ہاری ہوئی عورت کے پاس مرد کو جیتنے کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے اور وہ مرد بھی ایک اجنبی جس کی تہذیب اور تربیت اس سے بالکل مختلف ہے اس تہذیبی اختلاف کے احساس نے اس کی انڈراسٹینڈنگ کی خواہش کو اور تیز کردیا تھا جیسے جیسے وہ اسے اور اس کے طور طریق کو سمجھتی جاتی خود کو اس کے مطابق ڈھالتی جاتی کیونکہ وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی

تھی۔ اس کے علاوہ اس کی چند سہیلیوں نے اسے کچھ اور مشورہ دیا کہ وہ خود بھی کہیں ملازمت کرکے اپنی ذات میں ایک طرح کی کشش اور پیدا کرے کیونکہ ان دنوں یورپ میں نوجوان لوگوں میں شادی سے بچنے کے رجحان کی وجہ سے عورتیں مردوں کو مضبوطی سے تھامنے کے مختلف تجربے کرتی رہتی ہیں۔

جینی نے ملازمت میں اپنے ذوق کا بھی خیال رکھا اور ایک فوٹوگراف کمپنی میں کام کرنے لگی۔ مستقل ملازمت تھی۔ ہر ہفتے اسے ایک معقول رقم ملتی اور ہر ہفتے وہ کبھی عبید کے لئے موزے خرید لیتی اور کبھی گرہستی کی کوئی چیز۔ اب گرہستی کی زندگی اسے بڑی عزیز تھی کبھی چپکے سے اس کی الماری میں کوئی تحفہ رکھ دیتی۔ اس اہتمام کا عبید پر وہی اثر ہوا جو اسے مقصود تھا۔اب وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی جس سے عبید کبھی کبھی گھٹن سی محسوس کرتا اس لمحہ پھر اسے آزادی اور ریستورانوں کی آوارگی بڑی دلفریب نظر آتی۔

لیکن جینی نے پروگراموں کا جو جال اس کے گرد بچھا دیا تھا اس میں تو تل رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ اس کے کچھ دوستوں نے اسے بازار میں جینی کے ساتھ دیکھا بھی تو جینی کی عمر اور مونچھوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کا تمسخر ابھرا اور ان میں سے بعض بے تکلف دوستوں نے اس سے کہہ بھی دیا کہ اس سے زیادہ خوبصورت اور جوان تو وہ خود لگتا ہے لندن میں اس پرانی کار سے کون متاثر ہوگا۔ یہ فقرے اس کے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتے اور جب کبھی موسم اچھا ہوتا' جینی ذرا تفریح کے لئے اس سے کہتی تو پہلے تو وہ اسے ٹالنے کی کوشش کرتا لیکن اس پر بھی وہ اصرار کرتی تو پھر شہر میں نسلی امتیاز کا احساس دلا کر خطرے کی گھنٹی بجا دیتا اور کہتا کہ میرے رنگ کی وجہ سے تمہاری قوم کے آدمی تمہیں میرے ساتھ دیکھنا گوارا نہیں کرسکتے بازار میں ساتھ چل کر کیوں میری جان خطرے میں ڈالتی ہو۔

جینی پر اس اندیشے کا اثر ہوتا کیونکہ اسے بھی تو یہ معلوم تھا کہ ان دنوں رنگدار لوگ قوم کا موضوع بنے ہوئے ہیں اور آئے دن ان پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اس صورتحال کو دیکھ کر وہ خود کو بڑا مجبور پاتی اور اپنا سارا وقت اسکے ساتھ اسی فلیٹ میں گزارتی اس وقت کو مختلف طریقے سے دلچسپ بنانے کی کوشش کرتی جب وہ گھر پر ہوتے

تو زیادہ وقت ان کا ٹیلی ویژن دیکھنے پر صرف ہوتا اور کبھی اس ٹیلی ویژن کی یکسانیت سے وہ تنگ آجاتے تو پھر جینی عبید کا دل بہلانے کے لئے تاش لے کر بیٹھ جاتی یا کبھی مختلف طریقوں سے اپنے بالوں کا اسٹائل بنا کر ماڈل کی طرح اس کے سامنے کھڑی ہو کر پوچھتی بالوں کے اس اسٹائل کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ لیکن کبھی کبھی تو اسے لے کر باہر نکلنا ہی پڑتا کیونکہ اس طرح روز گھر میں پڑے رہنے سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔ باہر کی زندگی میں انہی سبکیوں اور ناگواریوں سے اس کا وسطہ پڑتا جس کا تذکرہ وہ جینی سے کرتا رہتا اس لئے جینی بھی اس احساس سے چوکنی سی ہو گئی اور جب ادھیڑ عمر کے گورے اسے ایک کالے آدمی کے ساتھ دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں شعلے سے لپکتے۔ جینی ان آنکھوں کا تعاقب کرتی اور انہیں مزید چڑانے کے لئے عبید کی بانہیں خود اپنے ہاتھ میں لے کر اٹھلاتی ہوئی چلتی تو یہ ادھیڑ عمر کے گورے لوگ اپنے چہرے دوسری طرف پھیر لیتے۔ لیکن انہیں دیکھنے والوں میں نوجوان لڑکیاں بھی ہوتیں۔ انگریز نوجوان لڑکیوں کی تو نظر ان پر سے پھسل کر گزر جاتی البتہ اوپیر لڑکیوں پر اس کا دوسرا اثر ہوتا۔ اور اس کا احساس عبید کو اس وقت ہوا جب ایک اوپیر لڑکی اسے جینی کے ساتھ دیکھ کر مسکرائی اور بڑی چاہت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت عبید کو جو خوشی ہوئی اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ یہ حقیقت تو ایسی ہی تھی جیسے عہد عتیقی کے آدمی کے سامنے ہیرے پڑے چمک رہے ہوں اور ان کی قدر و قیمت وہ نہ جان سکے اس وقت عورت کو شکار کرنے کا ایک اور راز اس کے تخیل نے دریافت کیا اور دل میں اپنی ذہانت اور باخبری کی خود ہی داد دینے لگا۔

(لندن۔ ۱۹۷۴)

خواب پھولوں اور کھلونوں کی طرح

دفتر سے فارغ ہو کر وہ اس مختصر سے ریستوران کی طرف چلا جہاں اس نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ گزارا تھا۔ اس ریستوران کا نام "بہشت گم شدہ" تھا یہاں سہ پہر کی محفل ختم ہو چکی تھی لیکن حکومت کے ڈول پر رہنے والے ایکٹر' ادیب' شاعر اور اوپیر لڑکیاں اور کچھ لگاتار کام سے تنگ آئے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھے ہوئے یا خریداروں کے چھوڑے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے یا کبھی کبھی آپس میں باتیں کر لیتے اور کچھ کھڑکی سے باہر کی دنیا کو دیکھ رہے تھے فٹ پاتھ پر گزرتے ہوئے راہ گیروں میں کوئی حسین لڑکی نظر آجاتی تو ان کے چہروں پر ایک چمک سی ابھرتی اور اس کے نظروں سے دور ہوتے ہی ان کے چہرے پھر اندر کی تنہائی سے ست ہو کر رہ جاتے۔

مطلع صاف تھا اور سورج کی روشنی بھی چاروں طرف روپہلی چادر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ آج اس ریستوران کے ذرا خالی رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ اس دن موسم کے خوشگوار ہونے کی وجہ سے ریستوران کی زندگی سے کنارہ کر کے قریبی جنگل میں چلے گئے تھے اور بہت سے سڑکوں پر جو سرکاری بینچیں پڑی ہوئی تھیں وہاں بیٹھ کر اس سورج سے چمکتی ہوئی زندگی کا نظارہ کر رہے تھے۔

ویسے اس ریستوران میں سہ پہر کا وقت لڑکیوں کے آنے کا وقت تھا۔ ان دنوں امریکہ سے تنگ آئے ہوئے امریکی نوجوان اور لڑکے اور لڑکیاں یہاں آکر اس مختصر سے ریستوران کی فضا سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے۔ ان سکون پرست مگر کاہل لوگوں میں اکثریت نشیلی دواؤں اور رومانیت آمیز روحانیت کے چکر میں گرفتار نیز ذہنی انتشار کی شکار لڑکیوں کی تھی۔

یہ ریستوران لڑکیوں کی شکارگاہ بھی کہلاتا تھا جو لوگ شکار کی تلاش میں یہاں آتے' جب یہاں کوئی لڑکی نہ ہوتی تو باہمی انسانی تعلقات بات چیت اور مسکراہٹوں سے زندہ رہتے لیکن جب ریستوران کا دروازہ کھلتا تو سب اپنے اپنے مشاغل سے سبکدوش ہوکر دروازے کی طرف چاہت سے دیکھنے لگتے اگر نیا خریدار نوجوان لڑکی کے بجائے کوئی اور ہوتا تو ان کے چہرے پر پھر اداسی اور ناگواریت چھا جاتی اور وہ اس آنے والے کو نظرانداز کرکے پھر اپنے اپنے مشغلوں میں مصروف ہو جاتے' یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں تقریباً" سب ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن جب اس ریستوران میں لڑکیاں داخل ہوتیں تو ان کے سارے انسانی تعلقات کائی کی طرح پھٹ جاتے اور سب ایک دوسرے سے بے تعلق ہوکر ان لڑکیوں کو اپنے چہروں پر ملائیت اور مسکراہٹ پھیلا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔

لندن کیا سارے یورپ میں نوجوان لڑکیوں سے عاشقی کرنے کے لئے آدمی کا دلچسپ ہونا ضروری ہے اس لئے یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں نے اپنے اندر بڑے ریاض کے بعد کسی نہ کسی دلچسپی کو پال پوس کر جوان کرلیا تھا۔

کوئی لڑکی کا دل بہلانے کے لئے دلچسپ قصے شروع کرتا۔

"کوئی ماچس کی تیلیوں سے انہیں خوب ہنسانے کی کوشش کرتا اور کوئی کسی لڑکی کی تصویر بنا کر اپنے کمال کے جال میں اسے پھانسنے کی کوشش کرتا۔ اور اس عمل کے دوران ایک دوسرے کو بالکل نظرانداز کردیتے۔

کوئی لڑکی ذرا تیز طرار ہوتی تو وہ تتلی کی طرح ادھر ادھر سے گزرتی ہوئی ایک تنہا سیٹ پر جاکر بیٹھ جاتی اور کنکھیوں سے جاننے کی کوشش کرتی کہ کون کون اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ آخر ان میں جو ذرا بے تکلف ہوتا تو اپنے لائٹر سے اس کا سگریٹ جلاکر تحفے

کے طور پر اسے ہلکی سی مسکراہٹ بھی پیش کرتا۔

جب یہ ریستوران اسے پسند آجاتا تو دوسرے دن وہ پھر یہاں آتی پہلے جاننے والے کو رسمی سلام کرتی پھر تنہا سیٹ پر جاکر بیٹھ جاتی اس مرتبہ کوئی دوسرا اپنے کرتب دکھانے اس کے پاس آجاتا۔ اور عرصے کی ہیرا پھیری کے بعد ان میں سے وہ کسی ایک کو پسند کرلیتی لیکن وہ تعلق بھی چند دنوں اور ہفتوں کے بعد ختم ہو جاتا اور پھر وہی چکر شروع ہو جاتا جو یہاں ایک عرصے سے جاری ہے اور اس طرح ایک نوجوان لڑکی اپنے آزادی کو فضول خرچی میں صرف کرکے اپنی شخصیت کو زخمی کرتی رہتی اور مرد سے پہلے وہ اس تجربے کے ہاتھوں ذہنی اور جذباتی بحران میں مبتلا ہو جاتی اور اپنی ذہنی اور جذباتی حرمت کے لئے کبھی خاموش غور و فکر کرتی اور کبھی ماہر نفسیات کے پاس جاتی۔ اور یہ ریستوران اس حالت میں بھی ان کی زندگی کی بڑی ضرورت رہتا وہ اسے ہزار بار ناپسند کرکے ہزار بار یہاں آتی یہی صورت ہمارے ناول کے ہیرو عبید کی بھی تھی۔

حسب معمول جب وہ ریستوران میں داخل ہوا تو دروازے کے کھلتے ہی بہت سی نظریں اس کی طرف بھی اٹھیں۔ ان میں چند جاننے والے بھی تھے۔ ان میں سے دو ایک نے تو اسے دیکھتے ہی منہ بھی پھیر لیا تھا' لیکن اپنی مشرقی رواداری سے مجبور ہو کر لیکن کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے ایک آدھ سے ہیلو بھی کہا۔ لیکن اس وقت اس کا جواب بھی اسے بڑے بے تعلق لہجے میں ملا۔ یہ رویہ اس ریستوران میں رواج کی حیثیت رکھتا تھا اور عبید اس سے واقف تھا اس لئے وہ بھی اپنی مخصوص نشست پر آکر بیٹھ گیا' جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اپنے سنہری لائٹر سے جلا کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر ریستوران کا جائزہ لیا اور لائٹر کو سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور دفتر کی لائبریری سے یوگا کی جو کتاب وہ لایا تھا اسے لائٹر کے قریب رکھ دیا کیونکہ ان دنوں کافی لڑکیوں نے اس سے یوگا مشرق کی تہذیبوں کے متعلق بہت سے سوالات کئے تھے اس کے قریب ایک اور سیٹ تھی اس پر بڑی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ نیلے رنگ کی زین کی تنگ پتلون جس میں سرخ کپڑے کے پیوند جگہ جگہ لگے ہوئے تھے اور اس کی خوبصورت آنکھوں کے گرد کاجل کا ایک گہرا دائرہ تھا' گلے میں ہندو جوگیوں کی مالا' ہاتھوں میں عربی زیور اور بدن پر

مراکش کا مخصوص زنانہ کرتا۔ اسے تنہا دیکھ کر عبید کو ذرا تعجب ہوا کہ اتنی حسین اور دلکش لڑکی اتنے شکاریوں کی موجودگی میں تنہا کیوں' آخران لوگوں نے اسے قابل التفات کیوں نہ سمجھا؟

یہ سوال ابھی تک اس کے شعور میں تحلیل بھی نہ ہوا تھا کہ لڑکی نے اپنی کتاب بند کرتے ہوئے اس کی ٹیبل پر رکھی ہوئی کتاب پر کنکھیوں سے ایک نظرڈالی عبید اس دلچسپی کو کیسے نظرانداز کرسکتا تھا پھراس کا جی بھی تو باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔

"کون سی کتاب زیر مطالعہ ہے؟" عبید مسکراتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"پیاسوں کا دیس۔" لڑکی جیسے اس مسکراہٹ کا انتظار ہی کر رہی تھی دوستانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ یہ کتاب مشرقی صوفیانہ شاعری کا مجموعہ تھی۔

"بڑی باذوق نظر آتی ہو؟" عبید نے اس کی مشرق پسندی سے تنگ آکر مگر مسکراتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس فقرے سے ایک ہلکی سی شرم جو نسوانیت سے ہی مخصوص ہوتی ہے اس کے چہرے پر چھا گئی' جیسے اس میں ہی سے کسی چیز کی تعریف کردی گئی ہو۔

"اور یہ تم کون سی کتاب پڑھ رہے ہو؟" لڑکی نے یوگا کی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی اس کے اور قریب آکر بیٹھ گئی اور اس کی ٹیبل سے کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"مجھے مشرق سے بڑی دلچسپی ہے' مشرق دانش اور روحانیت کا دیس ہے' سارے بڑے بڑے مذہب وہیں سے دنیا میں پھیلے ہیں"۔

"تم کہاں سے آئی ہو؟"۔

"امریکہ سے"۔

"امریکہ کیوں چھوڑ دیا؟"۔

"اب امریکہ رہنے کی جگہ نہیں"۔

"تواب لندن میں رہنے کا ارادہ ہے؟"۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" لڑکی اس قسم کی مزید گفتگو کو قطع کرکے اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔

"تم نے جلال الدین رومی کو پڑھا ہے؟" لڑکی نے جلال الدین رومی کا تلفظ کچھ اس طرح ادا کیا کہ عبید اسے اچھی طرح نہ سمجھ سکا تو اس نے لڑکی کی طرف مسکراتے ہوئے سوالیہ انداز میں دیکھا۔ لڑکی نے پھر جلال الدین کو ذرا الجھا کر مگر لفظ رومی کو واضح انداز میں ادا کیا۔

"ہاں ضرور میں نے اسے پڑھا ہے۔" عبید نے جواب دے کر اسے سگریٹ پیش کیا۔ اس نے سگریٹ لے کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر کہا۔

"میں نے کل ہی اس کے کلام کا "انگریزی ترجمہ" خریدا ہے۔ رومی مجھے بہت پسند ہے"۔

"تمہیں رومی اجنبی معلوم نہیں ہوتا؟"۔

"نہیں صرف اس کا اظہار بیان ذرا اجنبی ہے۔ لیکن جن احساسات اور خیالات کا اس نے اظہار کیا ہے۔ وہ عام انسانوں کی میراث ہیں"۔

عبید کو اس کے خیالات سن کر پھر الجھن ہوئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اتنے شکاریوں کی موجودگی میں وہ کیوں تنہا ہے لیکن وہ لڑکی اتنی صحت مند اور خوبصورت تھی کہ عبید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے دست درازی شروع کردی تو لڑکی نے اپنے جسم پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ذرا مسکرا کر کہا۔

"ان معاملات سے ذرا اوپر اٹھنے کی کوشش کرو"۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"۔

"تم بتاؤ؟"۔

"یہی بیس سے اوپر"۔

"نہیں پورے ۱۸ برس کی ہوں"۔

"۱۸ برس کی عمر میں تمہارا یہ عالم۔ روح کے پیچھے اس عمر میں کیوں پڑ گئیں یہ تو بڑھاپے کا مشغلہ ہے"۔

"تم بڑے کمزور آدمی ہو یورپ میں آکر تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا"۔

"آج اتوار کتنا بورنگ ہے۔ لندن میں یہ کتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔" عبید نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

"ہاں انگلش اتوار اپنی بوریت کے لئے بڑا مشہور ہے۔" اس کے بعد اس نے عبید کے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"۔

"ٹھیک پانچ بجے ہیں"۔

"اوہ میں لیٹ ہو گئی۔ اچھا تمہاری دلچسپ گفتگو کا شکریہ' پھر ملاقات ہوگی"۔

"لڑکی اٹھ کر چلی گئی۔ عبید نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا اور نہ اس کے آخری فقرہ پر کوئی توجہ دی کیونکہ اب اسے اس کا کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ "پھر ملیں گے" ایک طرح کا رسمی اظہار ہے۔ لیکن اس کے جاتے ہی یہ اتوار کی بوریت اس پر پھر سوار ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ آج ہائڈ پارک سے ویت نام کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ اس خیال نے اس کے اندر پھر ایک قسم کا اشتعال پیدا کر دیا اور وہاں جانے کی اس میں پھر آمادگی پیدا ہو گئی۔ کیفے سے نکل کر وہ سڑک پر آیا تھوڑی دیر بعد بس بھی آگئی اس میں جلدی سے بیٹھ کر ہائڈ پارک پہنچ گیا۔

موسم خوشگوار ہونے کی وجہ سے یہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جگہ جگہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے مقرر جوشیلے انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ کوئی مقرر لوگوں کو مذہب کی طرف بلا رہا تھا۔ اور اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا اور دوسرا مقرر مذہب سے لوگوں کو بدظن کر رہا تھا۔ اکثریت یہاں کالے مقرروں کی تھی جو رنگ کے امتیازات کے خلاف دھواں دھار مگر غیر شائستہ زبان میں تقریریں کر رہے تھے۔ ان سب مقرروں کے گرد لوگوں کی بھیڑ تھی' کسی بھیڑ کے قہقہوں کی آواز اٹھتی اور کسی بھیڑ سے تکرار کی آواز۔ عبید جب کالے لوگوں کی بھیڑ کے قریب پہنچا تو وہاں اسے پاکستانی پرچم لہراتا ہوا نظر آیا اور اسٹول پر کھڑا ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔

اس کی تقریر کا موضوع پاکستانیوں پر "اسکن ہیڈ" کے حملے تھا۔ وہ بار بار بڑے جوشیلے انداز میں ان فقروں کو دہرا رہا تھا۔

"ہم اس ملک میں رومیوں کی طرح نہیں آئے بلکہ محنت مزدوری کرنے آئے ہیں۔ اس ملک پر ہم کوئی بوجھ نہیں بلکہ ملک کی پیداوار بڑھانے میں ایک اہم حصہ ادا کر رہے

ہیں۔ اس ملک میں ہم کسی جرم میں شریک نہیں ہوتے"۔

اس کی تقریر کے اس آخری جملے کو سنتے ہی بھیڑ میں سے ایک ادھیر عمر کے مقامی آدمی نے کہا۔

"نہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ کتنے پاکستانی اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اور آپ لوگوں نے اسے ایک کاروبار بنا لیا ہے۔ کیا یہ جرم نہیں؟"۔

اس ادھیڑ عمر کے آدمی کی اس اعتراض سے بھیڑ میں قدرے برہمی پیدا ہو گئی چند پاکستانی نوجوان اس اعتراض پر بگڑے لیکن مقرر ان سب کو سختی سے خاموش رہنے کی تلقین کرنے کے بعد اس ادھیڑ عمر آدمی سے مخاطب ہوا۔

"ہم ان لوگوں کو جو اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتے ہیں۔ مجرم سمجھتے ہیں اور ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ لیکن کیا برطانیہ میں رہنے والے پاکستانی یہاں اجتماعی طور پر اس جرم میں شریک ہوتے ہیں؟ اور پھر ان بے آبرو اور مجرم پاکستانیوں کے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی شامل ہیں۔ آخر یہ کیا انصاف ہے؟ ان چند مجرموں کی خاطر محض اس بنا پر ہمیں موردالزام ٹھہرایا جائے کہ ہم ان سے رنگ، وطن اور تہذیبی تعلق رکھتے ہیں۔ ہم حکومت برطانیہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان بے غیرت مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ اور اس کے بعد ہم ہندوپاک کی دونوں حکومتوں سے بڑی دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کا خاتمہ کریں جو یہ غیر قانونی کاروبار کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس جرم کی وجہ سے یورپ میں ان دونوں حکومتوں اور ان کی تہذیبوں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور ان دونوں حکومتوں کا پروپیگنڈہ جو وہ اپنی پرانی تہذیبوں کے متعلق یورپ میں کرتے رہتے ہیں اس جرم کی موجودگی میں بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔ مجرموں کو سزا دینے کا کام حکومتوں کا ہے۔ آخر نفرت کا رخ ہم پاکستانیوں کی طرف کیوں؟ آخر ہمیں کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ ہمیں کہیں دیکھا جاتا ہے ہمیں مار پیٹ کر جو کچھ ہماری جیبوں میں ہوتا ہے اسے چھین لیا جاتا ہے"۔

عبید خاموشی سے اس تقریر کو سن رہا تھا، مقرر کے خیالات اور جوش نے اس میں ایک عجیب قسم کا اعتماد اور ہمت پیدا کر دی تھی جو عموماً" انگلستان کی عام زندگی میں انڈوپاکستانیوں کے رویوں میں نظر نہیں آتی اس وقت واقعی وہ اس تقریر میں کھو گیا تھا۔

اس وقت اسے سالوں کو ہتک اور بے انصافیاں یاد آرہی تھیں۔ اس یاد نے اس وقت اس کے خون میں تھوڑی سی حدت بھی پیدا کردی تھی۔ بعض مرتبہ تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے یہ اس کی اپنی آواز ہو۔" تھوڑی دیر بعد جلسے میں پھر گڑبڑ پیدا ہوئی۔ وہاں پھر ایک مقامی بوڑھا آدمی کھڑا ہو کر بڑے درشت لہجے میں بولا۔

"تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ ہمیں تمہارے اجنبی خیالات' اجنبی لباس اور اجنبی طرز معاشرت گوارہ نہیں جب تم یہاں نہیں ہوگے تو یہ مسائل بھی یہاں پیدا نہ ہوں گے"۔

بوڑھے آدمی کے ان اعتراضات کو سن کر چند پاکستانی اس کے قریب آگئے اور اس بوڑھے سے بحث کرنے لگے۔ عبید ان لوگوں کے اور قریب آگیا۔ لیکن ان لوگوں کی بحثوں سے وہ کوئی نیا خیال حاصل نہ کرسکا۔ اس سے اسے بوریت ہوئی جیسے ہی وہ اس بھیڑ سے نکلنے کے لئے مڑا تو پیچھے سے اویس نے اس کا کاندھا پکڑ کر اسے سلام کیا۔

"ارے بھئی کیسے ہو۔" عبید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بس اللہ کا شکر ہے اور تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" اویس نے جواب دیا۔

"مزاج کیسے ہیں؟" عبید نے یہ سوال پھر کیا کیونکہ اس وقت کی تنہائی اور اتوار کی بوریت اس پر ابھی تک طاری تھی اس لئے اس نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟"۔

"وہی جو پہلے کر رہا تھا"۔

"لیکن اب حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی سوچنا چاہیئے۔" اویس نے اپنی بات ختم کرکے اس کی طرف دیکھا۔

"سوچنا ہی نہیں کچھ کرنا چاہیئے۔ اب اپنی حفاظت ہمیں خود کرنا پڑے گی۔" اس مرتبہ عبید جواب دے کر ذرا تن سا گیا۔

"نہیں اس ملک میں ہمیں رائے عامہ ہموار کرنا چاہیئے ساری قوم ہمارے خلاف نہیں اس ملک میں بے شمار روشن خیال لوگ موجود ہیں جو اسکن ہیڈ کے ان حملوں کے خلاف ہیں۔ اویس نے بات ختم کرکے اسے دوسری طرف لے جانا چاہا لیکن عبید وہیں رک گیا اور ذرا جوشیلے انداز میں اسے جواب دیا۔ یہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا پرانا نسخہ

ہے۔ اس کام کے لئے ہمیں ایک صدی چاہیئے اور اس وقت کب ہمارا صفایا ہوچکا ہوگا"۔

"لیکن جو دوسرا راستہ آپ کے ذہن میں ہے وہ ہمارا یہاں کے عوام کی ہمدردیوں سے محروم کرکے بہت جلدی صفایا کردے گا۔ اور اس طرح ہم ان لوگوں کی ہمدردیوں سے بھی محروم ہو جائیں گی۔ جو اس جرم کے خلاف ہیں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اگر اس ملک میں ہمیں رہنا ہے تو اپنے طرز زندگی سے ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہمارے پاس جو تہذیب ہے وہ صلاح و آشتی کی پیامبر ہیں اور اجنبی ہوتے ہوئے بھی دیانت داری سے اس ملک اور قوم کی خدمت کرسکتے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ یورپ کی نئی نسل اس صلاح و آشتی کی پیاسی ہے اور اس میں پھر مشرق کا احترام بھی پیدا ہوچکا ہے"۔

"اس روحانیت کے چکر کو یورپ میں مت پھیلاؤ۔ تمہاری طرح یہ بھی کاہل اور بیکار بن کر آخرت کی بہتر زندگی کا انتظار کرنے لگیں گے۔ اصل میں یہ تمہاری صلاح و آشتی گانجے کے نشے سے کم نہیں۔" عبید پھر اس مذہبی احساس کو گفتگو میں پاکر ایک دم بھڑک کے آپے سے باہر ہوگیا۔

"کیا کافی کا موڈ ہے؟ تم نے تو ایک دلچسپ بحث چھیڑ دی۔" اویس نے اس کے اشتعال کو اپنی مسکراہٹ سے بجھا کر اسے قریب کے ایک ریستوران میں کافی پر مدعو کیا۔ اسلام کی پیدا کردہ ناگواریت ابھی تک عبید کے اندر تھی لیکن اتوار کی قوی بوریت اور تنہائی بھی تو اس کے ساتھ تھی آخر اویس کو چھوڑ کر وہ اپنا وقت کہاں گزارتا؟ جاتا تو انہی بے جان چیزوں سے اس کا واسطہ پڑتا جن سے وہ پہلے ہی بیزار تھا۔ جواب دینے کے بجائے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ریستوران کی طرف چل دیا۔ ریستوران ہائڈ پارک سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ بھاری آمدورفت کی وجہ سے سڑک سے گزرنا بڑا مشکل تھا اس لئے زمین دوز راستے سے گزر کر وہ اس طرف آئے جہاں ریستوران تھا جہاں اکثر ہائڈ پارک کے ہنگاموں سے فارغ ہوکر انڈوپاکستانی وہاں جاکر گھنٹوں بیٹھا کرتے اور جو قوت ہائڈ پارک کے ہنگاموں سے بچ رہتی وہ یہاں سستی چائے کے پیالوں پر گھنٹوں بحثوں میں ضائع کرکے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ یہ ریستوران خودکار تھا اور یہاں کے بیٹھنے والوں میں سب ہی طرح کے لوگ تھے لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی کہ وہ کم

آمدنی والے لوگ تھے۔ اس ناکافی آمدنی کے ساتھ انقلابی خیالات' سماج سے شکوے شکایت' ادب' سیاست' بڑھاپا اسی قسم کی دوسری اور صفات بھی ان لوگوں میں نمایاں تھیں۔ اس ریستوران کا ہال بہت بڑا تھا جہاں لوہے کی ٹیبلیں ان کے گرد آرام دہ کرسیاں' ٹیبلوں پر اکثر چھوڑی ہوئی جھوٹی کھانے کی پلیٹیں' خالی پیک' ماچس کی تیلیاں' سگریٹوں کی راکھ سے اٹے ہوئے ایشٹرے اور گندہ فرش اس پر سگریٹوں کے ٹکرے' کاغذ کے پرزے۔ خالی پیکٹ۔ لیکن ماحول کی ان ساری ناگوار چیزوں کو نظرانداز کرکے ہر ایک اپنے اپنے مشغلے میں مصروف رہتا۔ کبھی کبھی ایک کالا لڑکا بھی ٹرالی لئے ان جھوٹی پلیٹوں کو اٹھاتے ہوئے نظر آجاتا۔ ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لئے یہاں کاؤنٹر کے قریب جانا پڑا۔ جہاں خریداروں کی اکثر قطار لگتی رہتی اور اس قطار کی جگہ کو مخصوص کرنے کے لئے لوہے کی دو سلاخیں لگادی گئی تھیں کسی چیز کو خریدنے سے پہلے خریدار کو ٹرے اٹھانا پڑتی اس کے بعد جس چیز کی اسے ضرورت ہوتی وہ کاؤنٹر پر سجی ہوئی پلیٹوں میں سے کوئی پلیٹ اٹھا کر اپنے ٹرے میں رکھ لیتا۔ اس کے بعد کافی اور چائے کی باری آتی جہاں ایک ویسٹ انڈین عورت کھڑی خریداروں کے لئے چائے اور کافی بنا رہی تھی۔

اویس عبید کو ٹیبل پر بٹھا کر اس قطار میں کھڑا ہوگیا اور قطار میں جب اس کی باری آئی تو اپنے ٹرے میں دو کیک کے ٹکرے اور دو کافی لے کر پیسے ادا کرنے آگے بڑھا اس کے بعد وہاں سے چمچے لے کر ٹیبل پر آگیا۔

"ارے یار اتنا کچھ کیوں لے آئے۔" عبید نے کیک کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ذرا تکلف کیا۔

"کوئی بات نہیں بڑے دنوں کے بعد ملے ہو۔" اویس نے مسکرا کر جواب دیا اور اس کے بعد ٹرے رکھنے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"یہاں کافی سے اچھی چائے ملتی ہے۔" عبید نے کافی کی چسکی لگا کر اویس کو مخاطب کیا۔

"ہاں انگریز چائے بنانا جانتا ہے اور اگر تمہیں وہ پسند ہے تو وہ بھی آجائے گی"۔

"نہیں بس یہ کافی کافی ہے"۔

اس کافی کی تکرار پر دونوں زور سے ہنسے خاموشی سے ماحول کا جائزہ لے کر اپنی اپنی

کافی پیتے رہے اور عبید جب کانٹے سے کیک کا ٹکڑا کاٹ کر اپنے منہ میں رکھتا تو اس کی تعریف ضرور کرتا اس وقت ریستوران میں کافی لوگ تھے آپس کی سرگوشیاں قہقہے تیز طرار بحث و مباحثوں کی آواز سب کچھ مل جل کر ایک ایسے سر بن جاتی جو ٹوٹی ہوئی ستار کے جھنجھنانے سے نکل رہی ہو' کافی اور کیک جب ختم ہوگئے تو اویس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر عبید کو سگریٹ پیش کیا تو وہ مسکرایا اور ذرا طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اچھا مولانا آپ یہ گناہ بھی کرتے ہیں"۔

"چھوڑیئے اس مذاق کو۔ تو پھر کیا خیال ہے۔ اپنے لوگوں کے لئے کچھ کیا جائے"۔

"ضرور کچھ کیا جائے لیکن میرا راستہ تمہارے راستے سے الگ ہے۔" سگریٹ کا کش لگا کر عبید ذرا پھر سنجیدہ پڑ گیا۔

"آخر اسلام سے تم اتنے ناراض کیوں ہو؟" اس سوال کے بعد اویس کے چہرے پر شدید قسم کی ملائمیت ابھر آئی۔

"میں نے اس کی لائی ہوئی تباہی اپنے گھر میں دیکھی۔ میرے باپ کو اس نے اپاہج اور کاہل بنا کر قناعت کا عادی بنایا اور میری ماں کو ہر حالت میں شاکر۔ اگر یہی اسلام پھر مسلمانوں کا رہنما بنا تو ان کا بھی یہی حال ہوگا"۔

"ہر چیز کی توڑ پھوڑ درست نہیں۔ صرف ان چیزوں کو توڑا جائے جس سے انسانی زندگی کو نقصان پہنچے آخر قرآن کی اس تعلیم سے کیسے انکار کرسکتے ہو جو فرد اور اجتماع کو پہلے خود اپنی مدد پر اکساتا ہے غالباً" یہ تعلیمات اب بھی تمہارے ذہن میں موجود ہوں کہ خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اس کی کوشش نہ کرے۔ تمہارے والد ذہنی اپاہج اور کاہل ہیں ان کو ان حالات پر پہنچانے میں کن عوامل اور تعلیمات کا ہاتھ ہے اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن افراد کو چھوڑیئے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر بتاؤ کہ وہ کس پر بوجھ بنے کیا وہ کاہل تھے جنہوں نے ایک متحرک تہذیب کو جنم دیا۔ آخر اسلامی تعلیمات آدمی کو ذہنی اپاہج اور کاہل بنا دیتی ہے تو ان قوموں پر یہ اثرات کیوں نہ ہوتے جنہوں نے ایک تہذیب کو اپنے خون اور خلوص سے سینچا جو انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے نکلی تھی۔ اس تاریخ میں انسان کو جس شدت سے اپنی عظمت' صلاحیت کا

احساس ہوا۔ اس کے اثرات آج تک ہمارے زمانے پر نظر آرہے ہیں"۔

"وہ حالات اور تھے اور اس زمانے کا انسان الگ تھا۔ لیکن اب وہ پرانے زمانے کا تجربہ ہے۔ آج کے سائنسی اور صنعتی دور میں جبکہ انسانی معاشرہ۔ انسانی نفسیات۔ حالات اتنے پیچیدہ ہوچکے ہیں کہ اب یہ پرانے زمانے کا اسلام آج کے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں کرسکتا"۔

"تم نعرے بازی اور ریمارک کے عادی ہوچکے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تاثرات اور نعروں کے علاوہ تمہارے پاس کوئی اصولی تنقید نہیں میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا اور اب پھر عرض کر رہا ہوں کہ اسلام کا کوئی ایک قانون لو۔ اور ماضی اور حال دونوں زمانوں کا تجزیہ کرکے مجھے بتاؤ کہ اسلام کے پاس اب ان کا کوئی حل ہے یا نہیں"۔

اس سوال سے اس وقت عبید میں جو الجھن پیدا ہوئی اس سے اس میں ردعمل کے طور پر جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی اور اس وقت اس جھنجھلاہٹ کے دباؤ کو اس نے اپنے اعصاب پر بھی محسوس کیا جس سے اس میں قدرے اضطراب پیدا ہوا جس نے پھر اس کے ایک تاثر کو سوال کی شکل دے دی اور اس نے ذرا کرخت لہجے میں کہا۔

"اسلام خدا کے فرمان کے نام پر انسان کے سوچنے کے راستے مسدود کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا حکم ہی حقیقت اولیٰ ہے اور وہی سند ہے اور انسان اس اتھارٹی کو قبول کرکے آزاد نہیں رہ سکتا"۔

"نہیں اسلام پر یہ بھی تمہارا سطحی اعتراض ہے۔ وہ انسان کو تفکر سے نہیں روکتا اور قرآن کی اس آیت **(یتفکرون فی خلق السموات والارض)** میں بار بار انسان کو فکر کی دعوت دی گئی اور انہی تعلیمات کا فیض تھا کہ کلاسیکی زمانے کے مسلمانوں نے سائنس کو یونانی اوہام سے نکال کر خالص تجرباتی کیا۔ خیر یہ تو تاریخ کی بات ہے اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو اور ہے آخر تفکر کس لئے؟ تفکر برائے تفکر یا تفکر کے ذریعے ہمیں کوئی چیز دریافت کرنا چاہئے۔ تاکہ اس چیز کو دریافت کرکے اسے ہم اپنی زندگی میں برت سکیں۔ جس سے انسانی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے مگر قرآن کے دیئے ہوئے فرمان خداوندی کے ذریعے ہم اپنی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرلیں تو آخر ہم کیوں نہ خود کو خدا کے سپرد کردیں۔ مجھے یقین ہے کہ خود تم نے اپنی ذاتی اور علمی زندگی میں اسلام کو برت کر

اس ہم آہنگی کا سرور حاصل نہیں کیا جو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مقصود ہے۔ علوم و فنون اور مقصد زندگی کے معاملے میں مختلف تہذیبوں اور قوموں کا رویہ مختلف رہا ہے' ہر تہذیب فکر برائے فکر کے پیچھے نہیں پڑتی چینیوں کو ہی دیکھ لو۔ مابعد الطبیعاتی مسائل کے معاملے میں وہ خاموش ہیں"۔

"خیر چھوڑو اس فلسفے بازی کو۔ آج کے معاشی مسائل کا اسلام کے پاس کیا حل ہے؟ اور تم کیمونزم کی اتنی مخالفت کیوں کرتے ہو۔ امریکہ اور اس کے طرز زندگی کے متعلق کچھ کیوں نہیں کہتے؟"۔

عبید اس مرتبہ ذرا سنجیدہ ہوگیا اور اس سوال نے اس میں بحث سے ذرا دلچسپی بھی پیدا کردی۔

"اسلام ' سرمایہ داری' کیمونزم' فاشزم' لینن ازم' اسٹالن ازم' یا کسی اور ازم میں نہیں پڑتا۔ انسانی زندگی کو اس نے کچھ قدریں دیں ہیں۔ اس کے ماننے والے ان اقدار کے لئے اپنے زمانے کے مطابق کوئی معاشی' سیاسی یا معاشرتی ہیئت وضع کریں بشرطیکہ وہ اسلام کی کسی بنیادی قدر کی نفی نہ کریں۔ انسان نے تاریخ میں مختلف تجربے کئے ہیں۔ اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق مختلف ہیئتوں کو تخلیق کیا ہے تاکہ زندگی کا کاروبار چلتا رہے۔ اسلام جہاں کہیں دنیا میں ایک حکمران قوم بنے گا اس کے ماننے والے اپنی ضروریات کے مطابق اس تخلیقی عمل میں مصروف رہیں گے رہا کیمونزم لیکن معلوم نہیں کس کیمونزم کی طرف تمہارا اشارہ ہے کیونکہ ان کے بھی ۲۷ فرقے ہیں لیکن ان ساری اشتراکیت میں خدا کا انکار ہی نہیں بلکہ ہر اس تہذیب کو اکھاڑ پھینکنے کا معاندانہ عنصر شامل ہے جو لوگوں کو خدا کی طرف لے جائے۔ کیمونزم صرف ایک سیاسی دہریت نہیں بلکہ ایک نظریاتی دہریت ہے اور اشتراکیت جہاں غالب آتی ہے وہ قومی ملکیت کے ساتھ تین چیزیں ضرور کرتی ہے۔ آمریت جسے ان کی اصطلاح میں پرولتاری آمریت کا نام دیا جاتا ہے جس کا نگراں ایک طبقہ ہوتا ہے۔ فوج اور معاش۔ اس کے بعد منظم طور پر مذہب کے خلاف جارحیت۔

"نہیں یہ بکواس ہے یہ سب سرمایہ داروں کا پروپیگنڈہ ہے۔ سارے اشتراکی ممالک میں مذہبی آزادی ہے۔" عبید جواب دے کر کافی مشتعل ہوگیا۔

"جی نہیں اس آزادی کی حیثیت سیاحوں کی دلجوئی کے اہتمام سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور وہ بھی بڑی محدود۔ یہ آزادی اس طرح کی نہیں جو کمیونسٹوں کو غیراشتراکی ممالک میں حاصل ہے یا حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسی ہی آزادی وہ اشتراکی ممالک میں اپنے عوام کو دینا نہیں چاہتے"۔

"لیکن آپ قومی ملکیت کے خلاف کیوں ہیں؟ شاید اس لئے کہ قومی ملکیت کی موجودگی میں ہی سرمایہ دار اور اس کا پروردہ ملا پروان چڑھ سکتا ہے۔ سرمایہ دار لوٹتا ہے' مولوی صبر کی تلقین کرکے آخرت کی بہتر زندگی کا لالچ دے کر ظلم سہنے کا عادی بناتا ہے"۔

"پھر فقرے بازی پر اتر آئے۔ فقرے بازی سے دلیلوں کا کام مت لو۔ یہاں کوئی جلسہ نہیں ہو رہا۔ اسلام کی پوری تعلیم ہر قسم کے ظلم سے ٹکر لینے کی تلقین کرتی ہے اور اسی عمل پر انسانی کردار کو اس نے تقسیم بھی کیا ہے۔ پہلے وہ ظلم کو ہاتھ سے روکنے کی تلقین کرتا ہے اور اگر کسی میں اتنی ہمت نہ ہو تو اس کے لئے زبان استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے اگر وہ بھی نہ کرسکے تو ایمان کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس ظلم کو دل میں برا سمجھے۔ امربالمعروف ونہی عن المنکر کا پورا فلسفہ انسانی تاریخ میں ایک انقلابی نظریہ ہے جس نے بڑے بڑے جہازوں کے تختے الٹ کر رکھ دیئے اور اسلام کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو برائی کو روکنے اور نیکی کو پھیلانے کا حکم دیا ہے۔ جسے بددیانت مخالفوں نے تشدد اور جبر کا نام دے کر اسے بدنام کیا ہے"۔

"اچھا امریکہ کے متعلق کہ آپ لوگوں نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے کیا وہاں سب ایماندار لوگ رہتے ہیں؟"۔

عبید اب پھر اپنے آپے سے باہر ہونے لگا اویس کو اس پر ذرا ہنسی آگئی اور اس نے مسکراتے ہوئے پھر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہم امریکہ کے خلاف کچھ کہہ کر اپنا وقت کیوں ضائع کریں اس کی تہذیب کی چولیں پہلے سے ڈھیلی ہو چکی ہیں دنیا کا کون سا حصہ اس تہذیب کی طرف احترام سے دیکھتا ہے سوائے ملک کے حکمراں طبقے کے اور پھر امریکیت کمیونزم کی طرح انسانوں کی نجات دہندہ نہیں۔ آج اس کے طرز زندگی کی دنیا میں کیا وقعت ہے۔ اس کی مخالفت کرنا تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی مرے ہوئے مردے پر لٹھ مارنا اور پھر یہ کام خود اس کی روشن ضمیر نئ

نسل کر رہی ہے"۔

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟"۔

"ناانصافیوں کے ساتھ مرعوبیت کے خلاف جنگ قومی ملکیت آزاد مقابلہ۔ صنعتی اور ٹیکنالوجی انقلاب، مشینیں اور لالچ کو پھر انسان پر غالب کئے دے رہی ہے"۔

"دونوں کی کافی کبھی کی ختم ہوچکی تھی۔ اویس کو اپنی تقریر کے جوش میں اس کا بھی خیال نہ رہا جب وہ خاموش ہوگیا تو خالی پیالوں پر بھی اس کی نظر پڑی اس نے پھر عبید سے کافی کے لئے پوچھا لیکن اس لمبی تقریر کے بعد اب اویس کی صحبت میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اویس نے جب دوبارہ کافی کے لئے پوچھا تو اس مرتبہ اس نے انکار کردیا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ دوسری کافی کے بعد اس کو ایک اور لمبی تقریر سننا پڑے گی۔

شام کا اندھیرا ہوچلا تھا۔ ریستوران کی رونق بھی بڑھتی جارہی تھی وہ لوگ جو یہاں گھنٹوں سے بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے کافی جاچکے تھے اور ان کی جگہ نئے خریداروں نے لے لی تھی۔ ٹیبلوں پر ابھی تک جھوٹے برتن پڑے ہوئے تھے اور خریدار ان جھوٹے برتنوں کو ایک طرف کرکے اپنے کھانے میں مصروف ہوگئے تھے۔

عبید اور اویس خاموش بیٹھے اب لوگوں کے مطالعے میں مصروف تھے کیونکہ خاموش بیٹھ کر لوگوں کا مطالعہ کرنا لندن والوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ ان دونوں کے قریب ہی ایک دوسری ٹیبل تھی جس پر داڑھی والا ایک دیسی نوجوان بیٹھا ہوا ان دونوں کی گفتگو کو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ لیکن جب ان دونوں کی خاموشی ذرا طویل ہونے لگی تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور ان کے قریب کھڑا ہوکر ان کے پاس بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ اویس نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ عبید نے بھی اپنی اداس اور بیزار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا تو پھر عبید کو بھی مسکرانا پڑا۔

"معاف کیجئے میں نے آپ حضرات کے تخلئے میں مداخلت تو نہیں کی؟"۔

ان دونوں کو اس شستہ اور نستعلیق لب و لہجہ سے قدرے دلچسپی ہوئی کہ لندن میں بھی یہ لب و لہجہ اور اردو زبان زندہ ہے۔

"ارے صاحب! مداخلت تو محبت کے مترادف ہے۔ لندن میں ایسی بے تکلفی کہاں ملتی ہے۔ میرا نام اویس احمد اور میرے دوست کا نام ڈاکٹر عبید"۔

"مجھے سید احمد کبیر کہتے ہیں۔" مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر احترام کی خاطر کرسی سے اٹھ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ یہاں پڑھا رہے ہیں۔" مسکراہٹ اور مصافحہ کے تبادلے کے بعد احمد کبیر پھر عبید سے مخاطب ہوا۔

"جی ہاں میں یہاں بھاڑ جھونک رہا ہوں"۔

عبید کے اس جواب پر دونوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"ڈاکٹر عبید صاحب! اس کی تو آپ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔" احمد کبیر نے دوبارہ ڈاکٹر کی تکرار سے اس کے اندر کسی چیز کو جگانا چاہا عبید تو اس جذبے اور احترام کا برسوں سے پیاسا تھا اس لفظ کی تکرار سے اسے بڑی خوشگواری محسوس ہوئی اور فوراً" پیشہ ورانہ رعونت اس کے اندر ابھر آئی جو اس قسم کے تمغات سے مسلح لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس تکرار سے احمد کبیر کا یہی مقصود تھا۔ اپنی کرسی کھسکا کر وہ عبید کے اور قریب آگیا اور اس کی آنکھوں میں اس کی شخصیت کا جائزہ لینے لگا کہ جو کچھ اس کے اندر موجود ہے اس کی اصل حالت سے وہ آگاہ ہوسکے۔ احمد کبیر نے اس وقت زیادہ سوالات عبید سے کئے اور شعوری طور پر اویس کو نظرانداز کردیا۔ اویس اس بے توجہی سے ذرا اداس ہوگیا۔ احمد کبیر نے کنکھیوں سے اسے دیکھا کہ اس کی شعوری نظراندازی نے اویس کے ساتھ کیا سلوک کیا جب اویس کا چہرہ اداسی سے ذرا اور گہرا ہوگیا تو احمد کبیر نے ذرا چبھتے ہوئے انداز میں اس سے پھر سوال کیا۔

"ہاں مولانا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں"۔

"جی کبھی اسکول میں پڑھانے کا کام مل جاتا ہے اور کبھی اور کوئی دوسری مزدوری کرلیتا ہوں"۔

"لیکن زندگی کے متعلق جو خیالات آپ کے پاس ہیں وہ انگلستان کے لئے کب مفید ہیں۔ اپنے اندر ان خیالات کی موجودگی میں تو آپ کو کسی مولانا کا پرائیویٹ سیکریٹری ہونا چاہئے تھا"۔

"اس چوٹ پر عبید نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور اس نے سوچا کہ اب وہ تنہا نہیں اب احمد کبیر اسے بڑا دلچسپ نظر آنے لگا۔

"ہاں یہ تو بڑی سعادت کی بات ہے جناب باری سے میری یہی التجا ہے۔ مجھے اس خدمت کا موقع ملے کیونکہ مولوی نے ہمیشہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نظریاتی نگراں کا کام کیا ہے اور کبھی خود انقلاب میں بھی شریک ہوا ہے خصوصا" ہندوپاک کی تاریخ میں انقلاب ۵۷ء سے پہلے اور بعد انگریزی سامراج کے خلاف کس نے آواز اٹھائی؟ کبیر صاحب جس طبقے سے آپ تعلق رکھتے ہیں اس نے تو انگریزی سامراج کے تسلط کے بعد انگریزی تعلیم کے ذریعے اپنے مفاد کی حفاظت کی اور اس وقت بھی یہ مولوی سوکھی روٹی کھا کر اور چٹائیوں پر سو کر ہماری تہذیبی اقتدار کی حفاظت کرتا رہا۔ اور آج پھر آپ کا طبقہ سرمایہ دار مغرب اور اشتراکیت سے مرعوب اور مغلوب ہوکر پھر ایک طفیلی تہذیب کو پروان چڑھانا چاہتا ہے جو اس کے لئے منڈی اور کرائے کے فوجی کا کام دے سکے اور اس خدمت کے معاوضے میں آپ کا مفاد اور اقتدار دونوں محفوظ رہیں۔ لیکن آج جس زمانے کا آپ واسطہ دے رہے ہیں وہ ہمارا زمانہ ہے یہ ایک نظریاتی زمانہ ہے اور ہمارا یہ زمانہ تمہارے مفاد پرست طبقے کا خاتمہ کرکے رہے گا۔ کیونکہ تمہارے پاس نہ نظریہ ہے نہ کردار اور نہ تخلیقی صلاحیتیں"۔

"مولانا! آپ بڑے انقلابی نظر آرہے ہیں۔ اللہ اس کی جزا آپ کو ضرور دے گا۔" احمد کبیر نے اب اس کے خیالات سے ٹکرلینا مناسب خیال نہ کیا اور اسے مختصر سا رسمی جواب دے کر خاموش ہوگیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اویس کے اندر اس کے خیالات کی تپش ابھی تک موجود تھی اور اس کا اندازہ اس کی آنکھوں اور لب و لہجے سے لگایا جاسکتا تھا اور اس مرتبہ احمد کبیر نے اس سے جو سوال کیا اس میں بھی اعتماد کی کھنک جوابی طنز اس کے سوال میں بھی موجود تھا۔ اور احمد کبیر نے اس کے سوالات اور لب و لہجے سے اس کے خیالات کی سمت معلوم کرلی تھی۔

"جی میں یہاں ایک معمولی انجینئر ہوں۔" احمد کبیر نے پھر سعادت مندی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"آپ نے ڈاکٹریٹ...." اویس بھی اپنا جملہ ختم بھی نہیں کرپایا تھا کہ احمد کبیر نے جواب دیا۔

"جی ڈاکٹریٹ۔ ہم جیسے معمولی آدمیوں کے بس کی کب ہے' بس روٹی کمانے کے لئے یہ ڈگری لے لی ہے"۔

"پاکستان سے تعلق ہے یا ہندوستان سے؟"۔

"بس آدھا آدھا سمجھ لیجئے"۔

"کیا مطلب؟"۔

"ملک تقسیم ہوا تو ہندوستان سے پاکستان آیا اور وہاں سے انگلستان"۔

"اب یہاں سے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"۔

"یہ رزاق کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دانہ پانی ہوگا۔" احمد کبیر نے اس روایتی جملے کو ادا کرکے (اپنی دانش میں) اپنے کردار کو چھپانے کی کوشش کی۔

اس فقرے بازی نے عبید کو پھر زندہ کردیا کبھی کبھی احمد کبیر خاموش ہو جاتا تو عبید پھر اسلام پر مضحکہ خیز حاشئے تراشنے لگتا۔ اویس دین کی اس تضحیک کو محسوس کرتا اور کبھی تھوڑا سا ہراساں بھی ہو جاتا لیکن جس وضع داری کو اس نے اپنے تعلقات میں ظاہر کیا تھا اس دل آزاری اور تمسخر کے باوجود اسے قائم رکھے رہا۔ جب دین اور دیندار کی تضحیک میں عبید لطف کی خاطر اپنے آپے سے باہر ہونے لگا تو اویس نے ذرا شکایت آمیز مگر درشت لہجے میں عبید کی طرف دیکھا تو وہ سنبھلا اس لمحے اسے پھر وہ اداکاری یاد آئی جو ڈاکٹر کی تکرار کے بعد اس نے شعوری طور پر اختیار کی تھی احمد کبیر اس تضحیک میں شامل نہ ہوا لیکن اس تضحیک سے جو اثرات اس کے چہرے پر ابھر رہے تھے اسے وہ نوٹ ضرور کرتا رہا۔ اور آخر اس تھوڑی دیر کے مطالعہ نے احمد کبیر کو یہ یقین دلایا کہ اب اسلام کے متعلق کوئی خوشگوار تاثر اس کے اندر باقی نہ رہا۔ بلکہ عقیدے کے بجائے ایک نفسیاتی قسم کی جارحیت نے لے لی ہے۔ اس مباحثے میں وقت کافی گزر چکا تھا۔ اور ریستوران کا وقت بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ جھوٹے برتن اٹھانے والا رنگدار لڑکا پھر ٹرالی لے کران کے قریب آیا۔ اویس کی نظر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر گئی۔ دس کا عمل ہوچکا تھا۔ اسے ٹیوب سے گھر بھی تو جانا تھا' اس کے بعد ایک بس پکڑنی تھی اور پھر لندن میں اتوار کے دن ویسے ہی ٹرانسپورٹ سست پڑ جاتی ہے اور مقررہ وقت سے پہلے ہی بند ہو جاتی ہے اویس ساری باتوں کا خیال کرکے اٹھا اور دونوں سے جانے کی اجازت چاہی۔ عبید

تو اس سے پہلے ہی بیزار تھا۔ لیکن احمد کبیر نے رسماً "کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے کہا۔ لیکن اویس کے اصرار کے بعد بڑی احترام آمیز انکساری کے ساتھ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر عبید کو بھی اٹھنا پڑا اور دوبارہ ملاقات کی خواہش کے اظہار کا جملہ بھی دہرایا جو انگلستان کی معاشرت کا ایک اہم جزو ہے لیکن اب وہ ایک طرح کی روایت بن گئی ہے جس کا مطلب وہ نہیں ہوتا جس کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس جملے کو سن کر اویس مسکرایا۔ عبید کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بھی مسکرا دیا اور اویس سلام کرکے ریستوران کے باہر نکل گیا۔

"یہ بڑا سخت قسم کا مولوی ہے۔" اویس جب دونوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو احمد کبیر نے اس فقرے کو ادا کرکے اویس کی صحبت اور بحث سے جو ناگواریت اس کے اندر پیدا ہوچکی تھی اسے قے کی طرح اگل دیا۔

"ارے صاحب پکا مولوی ہی نہیں بلکہ پھل کی طرح پک کر اب سڑنے لگا ہے۔ ایک مرتبہ Heath پر اس سے اور واسطہ پڑ چکا ہے وہاں بھی اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا تھا۔ عبید نے جواب دے کر اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر احمد کبیر کو سگریٹ پیش کیا۔

"کیا مولانا کو عورتوں سے بھی شغف ہے؟" احمد کبیر نے سگریٹ کے لئے معذرت کرتے ہوئے اویس کے متعلق پوچھا۔

"اگر ہوگا بھی تو اسلام کی خاطر اسے چھپا رکھا ہوگا۔" اس مرتبہ عبید نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر احمد کبیر کو ذرا غور سے دیکھا۔

"ویسے آدمی بڑا گھنا اور سرگرم نظر آتا ہے"۔

"جی ہاں لندن کی اس مصروف تنہائی میں کوئی کرے بھی کیا خون کو گرم رکھنے کے لئے کچھ تو کرنا چاہئے"۔

عبید کے اس جملے نے احمد کبیر کو اس کی نفسیات کے اور قریب کردیا اور عبید نے اس کی صحبت میں کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کی بلکہ اس کی صحبت میں اس کے اپنے کچھ خیالات کی تصدیق ہوگئی اور اس تھوڑے سے وقفے میں عبید اس کی صحبت میں بڑی اپنائیت محسوس کرنے لگا۔ اور جب احمد کبیر نے اپنے قورمہ پکانے کا ذکر کرکے اگلے ہفتے اسے اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا تو اس نے اسے بے تکلفی سے منظور کرلیا۔ احمد کبیر

نے اس کی ڈائری میں اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھا۔ ریستوران سے اٹھ کر دونوں ٹیوب اسٹیشن آئے راستے دونوں کے مختلف تھے۔ لیکن احمد کبیر عبید کی خاطر اس کے پلیٹ فارم پر آیا اور جب عبید کی ٹرین آگئی تو اسے سلام کر کے اپنے پلیٹ فارم پر آگیا۔

(لندن۔ ۱۹۷۴ء)

ابھی ابھی جو آواز آئی

ادھیر آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف جارہی تھی اس نے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اپنی کھڑکی میں سے دیکھا تو معاً اسے خیال آیا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہئے اس کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس وقت گزارنے کے لئے کوئی مصروفیت نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ابھی ابھی لندن میں انگریزی سیکھنے کے لئے آئی ہو اور اسے اپنے لئے ایک عاشق کی تلاش ہو۔ یہ پورا قیاس اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے گزرا جب اس نے فلیٹ کا تالا کھولا تو ترکیب بھی اس کے ذہن میں روشن ہوگئی اور وہ جینی سے مخاطب ہوا۔

"مجھے سپرمارکیٹ سے کافی اور شکر خریدنا ہے وہ جلدی بند ہوجائے گی تم یہاں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں"۔

"اچھا جلدی کرنا" جینی نے اپنا کوٹ اتار کر ہینگر میں ٹانگتے ہوئے جواب دیا۔

وہ جلدی سے اپنے گھر سے نکل کر تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن پر آیا تو وہ وہاں اپنا بیگ لئے گھوم رہی تھی جیسے اسے اب بھی معلوم نہ ہو کہ وہ اپنا وقت کہاں گزارے، عبید جلدی سے اس کے قریب آیا اور مسکرا کر اس سے وقت پوچھا۔

"ٹھیک چار بجے ہیں" لڑکی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر بڑے دلربا انداز میں

جواب دیا۔ عبید کو اپنے قیاس کی تصدیق ہو گئی۔

تو پھر اس نے پوچھا "کیا کسی کا انتظار ہے؟"۔

"نہیں ذرا کام ختم کیا ہے تازہ ہوا کھا رہی ہوں"۔

"تو آؤ کافی پی جائے"۔

لڑکی نے پہلے تو کچھ دیر سوچا اس کے بعد اسے دیکھا' عبید آگے بڑھا اور پھر کہا "کیفے یہاں سے کچھ دور نہیں"۔

لڑکی بلا تامل اس کے ساتھ ریستوران میں چلی آئی اور دونوں ایک ساتھ ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ویٹرس کاؤنٹر پر ہی تھی' عبید اپنی سیٹ سے کافی کا آرڈر دے کر پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"میں نے تمہیں برنٹ روڈ پر کئی بار دیکھا ہے"۔

"اچھا۔ کیا تم وہیں رہتے ہو؟"۔

"ہاں میرے مکان کا نمبر ۱۷۳ ہے' دائیں طرف اور تم بھی تو وہیں رہتی ہو"۔

"ہاں میں او پیر ہوں"۔

کوئی بات نہیں یہ تمہارا پیشہ نہیں۔ تم طالب علم ہو صرف اپنی تعلیم کے زمانے تک تم نے یہ پیشہ اختیار کیا ہے اور پھر یہ بھی ایک تجربہ ہے"۔

لڑکی اس بات پر ہنس پڑی اور اسے ذرا دلچسپی سے دیکھا' اس وقت وہ اداس تاثر اس کے چہرے سے غائب ہو گیا جو اس پر "او پیر" کہتے ہوئے طاری ہو گیا تھا۔ "گھر کیسا ہے؟"

بس یہی نہ پوچھو' وہاں ایک قیدی کی طرح ہوں' کام کا طومار ختم نہیں ہوتا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑتا ہے اس پر کچھ کھانا ہو تو پوچھو' کافی بنانا ہو تو پوچھو' باہر جانا ہو تو اجازت لو اور اس کی وجہ بتاؤ' صبح برتن دھونا' گھر کی صفائی' جب شام کو وہ باہر جائیں تو بچوں کی دیکھ بھال۔ بتاؤ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"یہ واقعی بڑی زیادتی ہے تمہاری لینڈ لیڈی کو اس کا احساس نہیں کہ تم یہاں پڑھنے آئی ہو"۔

"وہ یہودی ہے بس دو دن اسکول کے لئے ملتے ہیں اور دو شامیں۔ لیکن گھر میں ۱۲

بجے رات سے پہلے آجاؤ"۔

"یہ تو کھلی ہوئی غلامی ہے آخر تم مکان کیوں تبدیل نہیں کرلیتیں؟"

"مجھے یہاں صرف ایک مہینہ ہوا ہے اور یہاں میں کسی کو نہیں جانتی"۔

"یہ تو کوئی خاص بات نہیں میں کچھ لوگوں کو جانتا ہوں اور تمہارا اسکول"۔

"میں ایک پرائیویٹ اسکول میں جاتی ہوں اور تین مہینے میں ۶۰ گھنٹے کے لئے میں نے ۱۵ پونڈ ادا کردیئے"۔

اور اس شہر کے متعلق تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ یہاں بہترین سرکاری اسکول ہیں جہاں بہترین ماحول' بہترین ٹیچراور ایک ٹرم کے لئے صرف چار پونڈ"

"ہاں مجھے اس کا احساس ہے لیکن کیا مجھے اس سرکاری اسکول کا پتہ بتاسکتے ہو۔ دوسری ٹرم میں وہاں چلی جاؤں گی"۔

"پتہ ہی کافی نہیں بلکہ میں تمہارے ساتھ اس اسکول میں چلوں گا۔ آخر تم جیسی لڑکی کو مصیبت میں دیکھنا کون پسند کرسکتا ہے؟" اس مرتبہ عبید نے اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

ویٹرس ان کی ٹیبل پر کافی اور اس کا بل رکھ کر چلی گئی وہ پھر گفتگو میں مصروف ہوگئے' تھوری دیر کی بے تکلفی نے انہیں ذرا ایک دوسرے سے قریب کردیا تو عبید نے اس سے اس کا نام پوچھا۔

"میرا نام مارگریٹ ہے لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ ہٹلر کی محبوبہ کا نام تھا اس لئے مجھے میگی (MAGI) کہو"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے"۔

"نہیں میں اس زمانے کی کسی چیز سے اپنی نسبت نہیں چاہتی۔

"تمہیں یہ ملک پسند ہے۔" عبید نے پھربات کا رخ تبدیل کرنا چاہا۔

"نہیں"۔

"تمہیں یہ ملک پسند ہے۔" میگی نے وہی سوال پھرعبید سے کیا۔

"ہاں مجھے بہت پسند ہے یہاں آزادی ہے' رواداری ہے"۔

"لیکن تمہارے لوگ یہاں کس بری حالت میں رہتے ہیں تم نے کبھی انہیں جاکر

دیکھا"۔

"نہیں' اچھی بری حالت تو ہر سوسائٹی میں ہوتی ہے"۔

"نہیں! مجھے معلوم ہے کہ تم ایک اچھی جگہ رہتے ہو تو اس طرح لبرل بن گئے ہو"۔

"نہیں' میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں"۔

"تمہیں اپنے ملک اور لوگوں سے محبت ہے؟"

"کیوں نہیں۔" اس مرتبہ اس سوال کے بوجھ سے اس کی آواز پوری طرح نہ نکل سکی' یہ سوال اس کے لئے بڑا غیر متوقع تھا۔

"تو تم اپنے ملک کیوں نہیں جاتے یہاں بیٹھ کر تمہاری محبت سے تمہارے ملک اور تمہارے لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا۔" سوال کر کے میگی نے پھر اپنے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر منہ سے لگایا' عبید نے پھر اپنے سنہری لائٹر سے اس کا سگریٹ جلا کر اس کی کثرت سگریٹ نوشی کا ذکر کر کے پھر گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

"نہیں مجھے اس سوال کا جواب دو اس سلسلے میں آپ کے ملک کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں سے سوال کر چکی ہوں کہ اس جوان عمر میں وہ یورپ میں کیا کر رہے ہیں"۔

"میرے یہاں محبت کا تصور ذرا مختلف ہے"۔

"وہ کیا؟" میگی سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر پوری توجہ سے اس کی طرف مخاطب ہوئی۔

"ہمارے لوگ اب مر چکے ہیں۔ مذہب نے انہیں کہیں کا نہ رکھا اور پھر میرا سوچنے کا طریقہ ان سے الگ ہے"۔

"آخر اس اختلاف کی موجودگی میں میری محبت ان کے کیا کام آسکتی ہے"۔

"نہیں یہ محبت نہیں یہ خود غرضی ہے۔ محبت تو قربانی چاہتی ہے اور تم سارے لوگ جو یورپ میں بیٹھ کر موج اڑا رہے ہو اس قربانی کے لئے تیار نہیں۔ تم واپس اپنے ملک صرف اس وقت جاؤ گے جب وہاں بھی ایسے ہی مزے ہوں گے جیسے آج یورپ میں ہیں' تمہارے لوگ نہیں مرے بلکہ تم سب مر گئے ہو"۔

"جان من سیاست تمہارا کام نہیں۔" عبید نے اس مرتبہ پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا میگی نے اس کا ہاتھ اپنی کمر سے نہ ہٹایا بلکہ اسے غور

سے دیکھا اور اس میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسے اور الجھائے' آخر وہ بھی تو اس ملک میں دوسری قوموں کے لوگوں کو جاننے اور اپنے ذاتی تجربوں سے کچھ حاصل کرنے آئی تھی۔ عبید نے اس کی خواہش کو کچھ اور معنی پہنائے اور ہیتھ کی تنگ اور نیم تاریک چھوٹی چھوٹی گلیوں میں گھومنے کی دعوت دی۔

بل ادا کرکے وہ دونوں باہر آئے۔ قریب ہی بس کا اڈہ تھا وہاں پہنچے' تھوڑی دیر میں بس بھی آگئی اور دونوں بیٹھ کر ہیتھ پر آگئے' میگی اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی اور وہ اس سے لطف لینا چاہتا تھا۔ وہ انڈوپاک کے رسم ورواج' وہاں کی قدیم تہذیب' خصوصاً عورتوں کی حالت' اسلام میں عورتوں کے حقوق' مشرق کے بڑے بڑے ادیبوں کے نام' ان کی تصانیف' ان کے حالات معلوم کرتی۔ عبید ہر سوال کا بڑا مختصر سا جواب دے کر اس کے بدن کے مختلف حصوں پر اپنا ہاتھ رکھتا جسے وہ ہٹا دیتی اور اس سے کہتی کہ وہ ٹھیک طرح سے اس کے ساتھ چلے۔

"اچھا بتاؤ یہ عرب حرم میں اتنی عورتیں کیوں رکھتے ہیں؟" وہ اس کی گرفت سے نکل کر ذرا سنجیدہ ہو کر سوال کرتی ہے۔

"یہ عربوں سے پوچھو"۔

"لیکن تمہارا مذہب بھی تو وہی ہے جو عربوں کا"۔

"نہیں میرا کوئی مذہب نہیں"۔

"اوہ! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا"۔

"یہ بات کوئی اتنی اہم نہیں"۔

"میرے لئے اہم ضرور ہے"۔

"لیکن تم میرے لئے اہم ہو" اتنا کہہ کر عبید نے اس کے ساتھ درازدستی کی تو اس نے اسے جھٹکا دے کر خود سے علیحدہ کیا اور پوچھا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو"۔

"بڑی حسین اور ذہین عورت"۔

"اس کا مصرف تمہارے یہاں صرف یہی ہے جو اس وقت تم چاہ رہے ہو؟"

"اتنی منفی نہ بنو' میں مذاق کر رہا ہوں۔ تمہارا میرے دل میں احترام ہے"۔

"او' شکریہ۔" اس مرتبہ میگی مسکرادی۔

اس وقت وہ ہیتھ کی ایک لمبی گلی کو پار کرکے ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب آگئے تھے۔ عبید نے اس کی مسکراہٹ کے بعد ایک طرح کا اطمینان محسوس کیا تو پھر اس گاؤں کی طرف چلنے کے لئے کہا۔ میگی نے اپنی گھڑی دیکھی اور گھر جانے کے لئے کہا"۔

عبید خاموش ہوگیا اب وہ ذرا اس سے الگ ہوکر چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں اس درجہ بے تکلف نہ ہونا چاہئے بلکہ دھیرے دھیرے۔ اس مرتبہ وہ ٹیوب اسٹیشن پر آئے وہ اپنا ٹکٹ لینا چاہتی تھی عبید نے اس کا ہاتھ روک دیا' وہ مسکرادی گھر آنے پر رات کا سلام کرکے جب اس نے عبید سے جدا ہونا چاہا تو اس نے اس کا بوسہ لینا چاہا۔ اس نے اپنا منہ اس سے بچالیا تو اس نے اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا وہ قہقہہ لگاکر زور سے ہنسی اور کہا "والدین پیشانی کا بوسہ لیتے ہیں" اور اس کے بعد اسے اس نے جرمن زبان میں گڈنائٹ کہا۔

"گوٹھے ناخ (GUTE NACHT)"۔

عبید کو خیال آیا کہ اس کا فون نمبر معلوم کرے چنانچہ اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس نے پوچھا۔

"تمہارا فون نمبر"۔

"او! اس کی کیا ضرورت ہے ہم دونوں قریب ہی تو رہتے ہیں"۔

عبید نے پھر اصرار کیا تو میگی نے اسے اپنا فون نمبر بتایا جسے جلدی سے زبان سے دہرا کر جیب سے پرچہ نکال کر اس پر لکھ لیا اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو جینی صوفے پر انتظار کرتے کرتے سوگئی تھی اور ٹیلی ویژن کھلا ہوا تھا جس پر ایک موسیقار گارہا تھا۔ ٹیلی ویژن کے قریب کھڑے ہوکر وہ چند لمحوں تک جینی کو دیکھتا رہا۔

اس وقت اس کے ذہن میں دو عورتیں تھیں' ایک وہ جو اس کے لئے اب ماضی بن چکی تھی لیکن اس کے لمس کی لذت اب بھی اس کے اندر جلن کی طرح تھی۔ اور ایک وہ عورت جو زندہ انسانی وجود کی حیثیت سے اس کی دست رس میں تھی۔ اس لذت کی موجودگی میں جینی نے ذرا متاثر نہ کیا لیکن وہ اسے دیکھتا ضرور رہا۔ اس مشاہدے میں اس

کی عمر کی پیدا کردہ پختگی اور مونچھیں سوئیوں کی طرح اس کے اندر پیوست ہو گئیں۔ صوفے پر بے خبر سونے سے دن بھر کے کام کی محنت بھی تو جینی کے چہرے کو پھاڑ کر اوپر ابھر آئی تھی' عبید کے احساس نے اس وقت اس کی ایک ایک کمی کو اس میں سے چننا شروع کیا اور جب جینی کی ساری کمیاں اس کے اندر جمع ہو گئیں تو پھر جینی سے اسے کوفت ہونے لگی۔ وہ اپنا کوٹ اتار کر ذرا آگے بڑھا تو ٹیلی ویژن سے ٹکرا گیا' جینی جاگ پڑی اسے سامنے دیکھ کر اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور صوفے سے اٹھ کر اس کے گلے میں اپنی دونوں باہیں ڈال دیں اس کا بوسہ لیا اور پوچھا۔

"ڈارلنگ! اتنی دیر کہاں رہے؟ تم نے اتنی دیر تو مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑا تھا"۔

"او' جینی! معاف کرنا ذرا اپنے دوست سے گفتگو میں اتنی دیر ہو گئی"۔

"کون ایسا دوست ہے جو اتنا اہم ہو گیا۔" جینی کی آنکھوں میں قدرے بے چینی کی ساتھ ایک سوال تیرنے لگا۔

عبید اس سوال سے گھبرایا اور بات بنانے کے لئے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔

"ڈارلنگ تم اس طرح نہ سوچا کرو۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے لئے ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں"۔

اس جواب کو سن کر بڑے مسرور انداز میں جینی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آج میں نے تمہارے لئے نرگسی کوفتے پکائے ہیں' مجھے ٹھیک بتانا کیا میں پاکستانی کھانا پکانا جان گئی ہوں یا نہیں؟"

"نہیں اب تم پاکستانی کھانے پکانے کی ماہر بن چکی ہو"۔

جینی نے جلدی سے چولہا جلا کر سالن گرم کیا۔ ٹیبل پر پلیٹیں سجائیں اور ڈبل روٹی کاٹ کر پلیٹوں میں رکھی۔ عبید اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جینی نے پلیٹ میں نرگسی کوفتے نکال کر کافی کے لئے کیتلی میں پانی چڑھایا اور آگ کو دھیمی کر کے پھر عبید کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی پلیٹ میں سے بڑا کوفتہ اٹھا کر عبید کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"پیارے (LOVE) بتاؤ تم میرے لئے کیا کر رہے ہو"۔

اس پورے وقفہ میں عبید کے ذہن میں کہانی مکمل ہو چکی تھی اس لئے اب جواب

دینے میں اس نے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی"۔

"میں ایک مکان خریدنا چاہتا ہوں"۔

"ڈارلنگ کہاں؟"

"ہیمپسٹیڈ (HAMPSTEAD) میں"۔

"اوڈارلنگ میں تو ہیمپسٹیڈ سے محبت کرتی ہوں۔ وہاں تو میں دیوانی ہو جاؤں گی"۔

"لیکن وہاں سے دماغی اسپتال زیادہ دور نہیں۔" یہ جملہ غیراختیاری طور پر عبید کی زبان سے نکل گیا۔ جس نے جینی پر کاری ضرب لگائی کیونکہ ان دنوں انگلستان میں لوگ ذہنی امراض اور کینسر کا نام سن کر اسی طرح خوف زدہ ہو جاتے ہیں جیسے کچھ عرصے پہلے انڈوپاکستان میں لوگ تپ دق کا نام سن کر خوف زدہ ہو جاتے۔ اس چوٹ نے اسے پتھر کی طرح سن کر کے رکھ دیا اور وہ خاموشی سے عبید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھتی رہی۔ عبید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس اثر کو ضائع کرنے کے لئے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا بوسہ لے کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی تم سے مذاق کرنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے"۔

"نہیں بعض مرتبہ تم بڑے اجنبی اور خودغرض آدمی کی طرح حرکت کرتے ہو"۔

"او' ڈارلنگ۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے جینی کا پھر بوسہ لیا۔ جینی نے بھی اسے اسی طرح جواب دیا تو پھر اسے اطمینان ہوا اور کھانے کے وقت سوچتا رہا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی ہوئی' اگر ایسی غلطیوں کو میں نے سنبھالے نہ رکھا تو زندگی کیا بن جائے گی۔ جینی خاموش تھی اور اسے طرح طرح کے اندیشے ستانے لگے کیونکہ ذہنی طور پر وہ ابھی تک اس کے لئے بالکل تیار نہ تھا کہ وہ جینی سے قطع تعلق کرلے' آخر ایسی عورت اسے کہاں مل سکتی ہے۔

کھانے کے بعد دیر تک وہ اس سے محبت کی باتیں کرتا رہا اور ان محبت کی باتوں میں جینی کو کافی دیر ہو گئی تو اسے اپنے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دے کر اپنی محبت اور وفاداری کو مہر کی طرح اس پر ثبت کر دیا۔

دوسرے دن اسے دفتر جانا تھا اس لئے اس نے بتی بجھائی اور جینی سے بغل گیر ہو کر سونے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس رات اسے نیند بالکل نہ آئی اور وہ

خود بھی اس نیند کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا کیونکہ میگی کے جسم کا لمس اس کے اندر ابھی تک زندہ تھا۔ اس لذت کو یاد کرکے پھر اس نے اس کی ایک ایک ادا اور اس کے آخری جملے جو پیشانی چومتے وقت اس نے کہے تھے اپنے تصور میں بڑے دل خوش کن معنی پہناتا رہا اور سوچنے لگا جو وقت میرا حسین لڑکیوں میں گزرے گا بس وہی حاصل زندگی ہے۔ ان تعبیروں نے اس کے دل کو بڑا خوش کردیا اور وہ صبح کا انتظار کرتا رہا جب وہ اسے اپنے آفس سے فون کرکے پھر ملاقات کی تاریخ مقرر کرے گا۔ محبت کے اس خوش آئند خواب نے اس کی ساری ہوشیاری اور چوکنے پن کو ختم کرکے رکھ دیا۔ بس میگی کی نیلی جھیل جیسی گہری آنکھیں ہوا میں اڑتے ہوئے سنہری بالوں کے بادلوں کے تصور کے دوران قریب لیٹی ہوئی جینی کئی مرتبہ یاد آئی تو اس نے اس وقت اسے اپنے ذہن سے جدا کردیا۔ اس کے بعد پھر میگی کو یاد کرنے کی کوشش کی' ان حسین خیالوں کی موجودگی میں اسے کب نیند آئی اس کا اسے احساس نہ رہا۔ گھڑی کے الارم سے پہلے جینی اٹھی کیتلی میں پانی بھرا اسے چولہے پر رکھا۔ غسل خانے کی ضرورت سے فارغ ہوکر ذرا دانت مانجھے۔ ناشتہ تیار ہوا تو عبید کو جگایا وہ جلدی اٹھا۔ ذرا دیر ہوگئی تھی اس لئے اس دن شیو بھی نہ کیا بس منہ پر پانی کا چھپکا مار کر کپڑے تبدیل کئے اور ناشتے کے لئے ٹیبل پر آگیا۔ جینی کو آج ایسی جلدی نہ تھی آج وہ اپنے دفتر کا ناغہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے جب عبید گھر سے نکلا تو وہ کھڑکی میں سے اسے جاتے ہوئے دیر تک دیکھتی رہی۔ گزشتہ رات عبید کی قربت نے اس کی محبت کو بڑا قوی کردیا تھا۔

اس دن دفتر میں وہ ذرا خوش تھا اس خوشی اور امید کی موجودگی میں اس نے کام بھی دل جمی سے کیا۔ میس روم میں پھر بوڑھے کلرک نے تارکین وطن کے مسائل پر گفتگو شروع کی تو اس نے اس کی ہاں میں ہاں ملاکر رضامندی کا اظہار کیا۔

"ہاں واقعی یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ آخر کتنے لوگ یہاں آسکیں گے اور حکومت کو اب قطعی دولت مشترکہ کے لوگوں کا داخلہ بند کردینا چاہئے اور پھر انہیں یہاں اپنا طرز زندگی باقی رکھنے کا کیا حق ہے۔ وہ اکثریت کے ہی رنگ میں کیوں نہیں رنگ جاتے"۔

عبید کی اس غیر متوقع تقریر سے میس روم کے سارے کلرکوں کو بڑا تعجب ہوا اور اس کے خیالات سن کر وہ بہت خوش ہوئے میس روم میں جب صبح کی چائے کا وقت ختم

ہوا اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے میس روم سے آہستہ آہستہ وہ اپنے آفس میں آیا جیب سے میگی کا فون نمبر کا پرچہ نکالا۔ اسے سامنے ٹیبل پر رکھ کر ذرا انداز سے ڈائیل گھمایا۔ پہلے تو گھنٹی بجتی رہی' تھوڑی دیر بعد کسی نے ریسور اٹھایا تو اس نے میگی کے لئے پوچھا۔

جس لڑکی کے ہاتھ میں ریسور تھا اس نے ہنستے ہوئے میگی کو آواز دی جو عبید نے فون پر سنی اور وہ خوش ہوا۔ جب میگی فون پر آئی تو عبید نے بڑی چاہت بھرے لہجے میں پھر کہا۔

"ہیلو"۔

"ہیلو"۔

مس میگی"۔

"ہاں میگی آپ سے مخاطب ہے"۔

"او' پیاری اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے تم سات سمندر پار سے آرہی ہو"۔

"یہ میرے کام کا وقت ہے"۔

"کیا آج شام تمہیں کوئی کام ہے؟"۔

"نہیں"

"تو پھر میں کیا تمہارا انتظار کر سکتا ہوں؟"

"کس لئے' کوئی خاص بات؟"

"بس تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے"۔

"کیوں؟"

"میرا دل تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہے"۔

"کیوں؟"

"اس کیوں کے سلسلے کو ختم کرو۔ اس سوال کا جواب ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا' بس تمہاری قربت میں پھر زندہ ہو جاؤں گا"۔

"اس شام کسی اور اوپیر لڑکی کو مدعو کر لینا میں کوئی ایسی حسین لڑکی نہیں"۔

"خیر یہ تو میرے دل سے پوچھو"۔

"کیا؟"۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے"۔

میگی نے فون پر ایک زور کا قہقہہ لگا کر اس سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے چاہتے ہو؟"

"بالکل تمہیں چاہتا ہوں ڈارلنگ"۔

"کتنے دن سے؟"

عبید نے اس کا جواب نہ دیا تو تھوڑے سے توقف کے بعد خود میگی ہی نے کہا۔

"میں تم سے ملنا نہیں چاہتی اور آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔ میری لینڈ لیڈی اسے پسند نہیں کرتی۔" اس کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ عبید تو اس کے پہلے جملے سے ہی شل پڑ کر رہ گیا تھا۔ جب اس نے بغیر معذرت کے فون رکھا تو احساس کمتری اور پشیمانی کا ملا جلا جذبہ اس پر طاری ہو گیا۔ رات کی لذت تو ابھی تک اس کی نس نس میں بھری ہوئی تھی جس سے اس پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری تھی لیکن اس مایوسی نے اسے ملول کر کے اس کی ساری لذت کو زہر آلود کر دیا اور اب اس کے دل میں خوشی و مسرت کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

ریسیور رکھ کر وہ بھی اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی' کرسی پر بیٹھے ہوئے جتنا وقت گزرا اس نے اس کی مایوسی کو اور قوی کر دیا۔ اس مایوسی میں اس کا دل بیٹھنے لگا۔ تو پھر اسے خیال آیا ہر خوبصورت چیز تو میرے لئے خواب بن جاتی ہے۔ مجھ سے زیادہ کالے اور بد شکل ان گوریوں کو لے کر زندگی کے مزے اڑاتے ہیں۔ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے؟ مجھے کوئی ایسی حسین اور صحت مند جوان لڑکی کیوں نہیں ملتی۔ جس کی محبت کی لذت مجھے زندگی بھر زندہ رکھے۔ آخر میرے حصے میں پرانی کاروں کی طرح استعمال شدہ عورتیں ہی کیوں آتی ہیں۔ آخر مجھ میں ایسی کیا کمی ہے۔ آخر مجھے اور کیا چاہئے جو میری شخصیت میں وزن اور کشش پیدا کر دے؟ اس کا سگریٹ خود بخود سلگ کر پوروں تک آچکا تھا۔ اس نے اس کی تپش کو محسوس کیا پھر پیاسوں کی طرح ایک آخری لمبا کش اور لگایا' اس کے بعد اسے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

چھٹی کے بعد جب وہ اسٹیشن سے نکل کر ٹیوب اسٹیشن پر آیا تو بری طرح تھکان محسوس کررہا تھا۔ خلاف معمول اس نے دفتر سے نکلتے ہوئے اپنی ٹائی کی نوک تک نہ ٹھیک کی، پلیٹ فارم پر جینی کھانا پکانے کے سامان کا تھیلا لئے اس کا انتظار کررہی تھی اسے دیکھتے ہی وہ خوشی میں پھول کی طرح کھل گئی۔ لیکن جب وہ قریب آیا تو اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھ کر جینی کو ذرا تشویش ہوئی کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے اس کی ٹائی ٹھیک کی، پھراس کے مزاج پوچھے۔

"ڈارلنگ آج تم بہت اداس کیوں نظر آرہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" عبید نے اسٹیشن پر کھڑے ہوئے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا جو ان دونوں کو بڑی توجہ سے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔

"بتاؤ کیا بات ہے۔" جینی نے پھر ذرا بے چین ہوکر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" اس نے پھر ان لوگوں کا خیال کرکے مختصر سا جواب دیا۔

جب ٹرین آئی تو اس میں جلدی سے دونوں بیٹھ گئے۔ اپنے فلیٹ میں آکر عبید صوفے پر دراز ہوگیا تو جینی ذرا پریشان ہوئی اور بستر پر اس کے قریب آکر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا

"ڈارلنگ! کیا بات ہے آج تم اتنے اداس کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں جینی میں آج ذرا تھکا ہوا ہوں مجھے ذرا آرام کرلینے دو"۔

اس جواب کے بعد جینی کچھ دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی پھر خاموشی سے اٹھی جو سامان وہ آج پکانے والی تھی اسے کاغذ کے تھیلے سے نکال کر کچن LARDER میں رکھا۔ اس کے بعد پکانے کے لئے برتن دھوئے۔

کھانا تیار کرکے پھر وہ عبید کے پاس آئی اسے بستر پر بٹھا کر دیر تک اسے دیوانوں کی طرح چومتا رہا کیونکہ جب اسے اپنی اداسی کے نقصان دہ پہلو کا احساس ہوا تو اس نے اس اداکاری کی ضرورت محسوس کی، جینی کو پہلے تو اس والہانہ اظہار پر بھی ذرا تعجب ہوا لیکن عورت کو جب اپنے چاہنے والے سے ایسی محبت ہو تو اس کی موجودگی میں وہ سب کچھ بھول کر خود کو اس محبت کے سپرد کردیتی ہے اور پھر یہ محبت جینی کی بڑی ضرورت تھی لیکن عبید کو بھی اس اداکاری سے جذباتی سکون ملا۔ اس نے اسے پھر چوما اس کے ساتھ

کھانے کی میز پر آکر بیٹھ گیا۔

اس نے آج اس کے سامنے روسٹ بیف یورک شائر پڈنگ کی پلیٹ رکھی۔ عبید اسے چکھ کر بڑا خوش ہوا اور یہ ڈش ہے بھی کچھ مزے دار۔ کھانے کے دوران دیر تک خاموش رہی جسے جینی زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکی۔ اسے عبید کے لئے پانی کا گلاس یاد آیا جسے وہ محبت کے مزے میں بھول گئی تھی اپنا کھانا چھوڑ کر وہ کرسی سے اٹھی اس کے لئے پانی کا گلاس ریفریجریٹر سے بوتل نکال کر بھرا اور ٹیبل پر اسے رکھتے ہوئے پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

"ڈارلنگ تم نے کبھی مجھے اپنے مذہب اور تہذیب کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ مشرق تو تہذیبوں کا گہوارہ ہے"۔

"تم سمجھتی ہو کہ ان تہذیبوں کی آج کے جدید آدمی کو ضرورت ہے؟"

"بالکل ڈارلنگ" جینی کو عبید کے جواب پر بڑا تعجب ہوا۔

"آخر ہمارے پاس سوائے فیکٹریوں اور ہتھیاروں کے تمہیں دینے کے لئے کیا ہے؟"

"حوصلہ اور آزادی کے نت نئے تصور۔ مشرق کی ساری تہذیبیں خدا کے گرد گھومتی ہیں۔ کوئی خدا کے آگے سپر ڈالنے کا مشورہ دیتی ہے' اور کوئی اس دنیا کو مایا تصور کرکے آدمی کو کل میں ضم کردینا چاہتی ہے۔ آدمی آدمی کی حیثیت سے کہیں نہیں رہتا۔ لیکن جدید آدمی کے پاس اب اتنا تجربہ اور علم جمع ہوچکا ہے کہ وہ اپنا راستہ خود ڈھونڈلے"۔

اس راستے کو اختیار کرکے ہمیں کیا ملا۔ آج ہم لذت احساس سے محروم ہیں۔ ہم کسی چیز کو چکھتے ہیں تو اس کا مزا محسوس نہیں کرسکتے' ذہنی بیماری دیکھتے نہیں کس تیزی سے بڑھ رہی ہے اب مغرب کے پاس اس خودسری اور ذہنی بیماری کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ جو اس راستے پر چل کر اسے شکست اٹھانا پڑی۔ اسے چھپانے کے لئے اب وہ شاعری کررہا ہے اور عوام کو مصروف اور خود کو مطمئن کرنے کے لئے پیداوار بڑھاؤ اور موج کرو۔ اس کے بعد آبادی کا کنٹرول ہائڈروجن بم' پلوشن' بتاؤ' اب ہمارے پاس کیا ہے۔ آج تم یہ کیسی باتیں کررہے ہو تم نے میرے تصور کو چکنا چور کرکے رکھ دیا"۔

"جینی! تمہیں مشرق کیوں اچھا لگتا ہے؟"

"میں نے اسے پڑھا اور میری خواہش ہے کہ میں اس سورج اور انسانی خلوص سے روشن زمین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں"۔

"لیکن واں جاکر تم گندگی اور بے انصافیاں دیکھو گی تو پھر تمہاری رائے اس مشرق کے متعلق معلوم کروں گا"۔

اس مرتبہ عبید نے ذرا پھیکے طنز سے مسکراتے ہوئے اپنے جواب کو وزن دار کیا لیکن اس تمسخر کا جینی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"ضرور۔ کیا مجھے تم اپنے ساتھ پاکستان لے چلو گے؟" اس مرتبہ عبید خاموش ہوگیا تو پھر اس نے اس کا ہاتھ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"جواب دو؟"

"مستقبل کے متعلق میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔

جینی اس گفتگو سے بڑی دل برداشتہ ہوئی اور اس نے مکمل خاموشی اختیار کرلی۔ کھانا ختم ہوا اس نے ٹیبل سے برتن اٹھائے انہیں باورچی خانے میں جاکر دھویا۔ پھر باورچی خانہ صاف کیا۔ اس کے بعد واں چیزوں کو ترتیب سے رکھا۔ اس کے بعد عبید کے پاس آئی جو ٹیلی ویژن پر کورنیش اسٹریٹ فلم بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جینی بھی اس کے پاس بیٹھ کر اس مشغلے میں شریک ہوگئی۔ فلم میں ایسے کئی مقامات آئے جہاں عبید نے ایک خاص قسم کا اشتعال محسوس کیا۔ لیکن جینی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی اس خاموشی کو عبید نے محسوس تو پہلے ہی کرلیا تھا لیکن ابتدا میں اس نے اپنی مردانہ تنک سے کام لیا اور جب اس کا خاطرخواہ ردعمل جینی کی طرف سے نہ ہوا۔ تو پھر اسے ذرا تشویش ہوئی اور وہ اپنے رویئے اور خیالات پر غور کرنے لگا۔ اس کے ذہن نے یہاں بھی مصلحت کا مشورہ دیا جو وہ زندگی بھر برتتا رہا لیکن اس مرتبہ اپنے ذہن کے اس رویئے پر اسے جھنجلاہٹ ہوئی اور اس نے خود ہی سوچا کہ آخر کہیں تو میں اپنے اصل خیالات کا اظہار کروں۔ اس مصلحت سے تو میرا دم گھٹتا جارہا ہے۔ یہ میرا کردار نہاں کہیں تو مجھے موقع دے۔ آخر یہ زندگی کیا ہے یہ لڑکی بھی مولوی سے کم نہ نکلی آخر یہ سب مجھ سے چاہتے کیا ہیں۔ آخر میں کیا بن کر زندگی گزاروں جو میں نہیں ہوں۔ وہ ظاہر کروں لیکن کب تک؟ جو میں نہیں چاہتا تھا اسے ضرورت کے لئے حاصل کیا اور اپنی زندگی کے بہترین وقت کو

اس شعبدے بازی میں گزارا یہ دوہری شخصیت تو میرے لئے عذاب بن گئی ہے۔ آخر دنیا میں ایسی جگہ کہاں ہے جہاں میں اپنا اصل کردار ظاہر کروں۔

گھڑی نے ساڑھے دس بجائے تو جینی نے اپنا کوٹ سنبھالا۔ عبید اٹھا' اسے کوٹ پہنایا اس کے بعد اسے خوب چوما لیکن اس مرتبہ وہ پھول کی طرح نہ کھل سکی اور رات کا سلام کرکے اپنے گھر کی راہ لی۔

اس حادثے نے اس پر بڑا گہرا اثر کیا ساری رات پہلے تو اسے خدشوں نے ستایا لیکن جب صبح ہوئی تو جلدی سے میکانیکی طور پر دفتر جانے کی تیاری کی اس کے بعد دفتر میں بھی وہی رویہ رکھا جو سالوں کے تجربے کے بعد اس نے تخلیق کیا تھا۔ کام کی مصروفیت نے اس میں عجیب طرح کی سردمہری پیدا کردی تھی۔ گزشتہ رات جینی کے رویئے نے جو اسے ہلکان کیا تھا اب وہ خدشہ پھر اس کے ذہن میں ابھر آیا اور اس نے اپنے اندر جلن سی محسوس کی۔ جب چھٹی ہوئی تو اسٹیشن پر آیا واں جینی نہ تھی تو اس کے لئے اس نے اپنے اندر بڑی بے چینی محسوس کی۔ اس وقت اس طرح گھر جانے کے خیال سے اسے وحشت ہوئی تو پھر وہ اسی ریستوران میں پہنچ گیا جہاں اس نے سالوں گزارے تھے۔ اس وقت وہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا وہ اس وقت ذرا اچھا لگا اور سیٹ خالی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوری دیر بعد سیٹ بھی اسے مل گئی وہ جلدی سے جاکر وہاں بیٹھ گیا۔ یہاں کچھ لوگ اسے جانتے بھی تھے۔ بعض سے کافی تبادلے بھی ہوئے لیکن اس وقت کسی نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ ویٹرس آئی اس کے چہرے پر بھی وہی بے تعلقی عیاں تھی۔ اس ماحول نے بھی اس کی وحشت کو اور تیز کردیا جس سے اس کے جذبات میں حدت پیدا ہوگئی۔ بل ادا کرکے وہ ریستوران سے نکلا۔ باہر کی تازہ ہوا کھاکر اس میں آزادی کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اب وہ کسی انسانی رشتے میں اپنے دل کو شریک نہ کرنا چاہتا۔

عورت کا تصور خصوصاً" مغربی عورت کا تصور اب اس کے دل ودماغ دونوں پر ایک ایسا بار بننے لگا جس سے اسے کوفت ہوتی وہ سوچتا مغرب میں عورت کے کھیل میں شریک ہوکر (تھوڑی سی لذت کے لئے) جذباتی لہولہان ہونے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اور یہ سودا بڑا مہنگا ہے۔ آخر دینی تعلیم کے بعد کتنا عرصہ اس نے عورت سے جی بھر کر محبت کرنے

کی خواہش میں صرف کردیا۔ آخر اسے کیا ملا۔ یورپ میں تو ہر چیز کی بنیاد کاروبار ہے۔ یہی مفاد زندگی میں ہر سرگرمی میں خون کی طرح جاری ہے جب تک تمہارا مفاد ہے دوسرے ہم جنس سے تعلق قائم ہے اور جب کسی وجہ سے اس مفاد پر زد پڑی تو انسانی رشتہ ختم خصوصاً" ان عورتوں کے کاروبار میں ایک عاشق مزاج یہاں کی عورتوں سے جذباتی طور پر ملوث نہیں ہوتا۔ ایک گئی دوسری آئی۔ لیکن یہ تو اس کے ہوشیار ذہن کا رویہ تھا۔ اس کا دل تو اب بھی مشرقی روایات کے تربیت یافتہ دل کی طرح ردعمل کرتا اور وہ عورت میں جذباتی طور پر ملوث ہوکر انسانی رشتے سے زندہ رہنے کا لطف لینا چاہتا' بغیر کسی ارادے کے سڑک پر گھومتے ہوئے اس نے اپنے دل ودماغ کے اس تجزیئے سے بھی شعوری طور پر پیچھا چھڑایا اور پھر آزادی کو یاد کیا۔

جینی کو جو وہ باقاعدگی سے فون کیا کرتا اب اس میں ناغہ کرنا شروع کردیا۔ یہ ناغہ ہفتوں تک پھیل گیا۔ اس کا احساس نہ رہا۔ بس بے مقصد زندگی کی سنسناہٹ تھی جو اس کے ویرانے میں ایک جھکڑ کی طرح چلا کرتی اور کبھی ان دنوں اسے کسی چیز کا خیال بھی آتا تو بس وہ خود اظہاری تھی جس میں وہ بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے ہر مصلحت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا اظہار کرے۔ لیکن وہ خود کیا ہے اور کیا چاہتا ہے اسے ابھی تک اس کا پتہ نہ تھا۔ آخر ایک اتوار کے دن وہ بیٹھا گھر پر ریڈیو سن رہا تھا۔ اس دن ریڈیو میں ویت نام کے جلوس کی اطلاع تھی' یہ خبر اس کے دل کو لگی اور اس نے سوچا کہ آج وہ خود اس جلوس کو دیکھے۔ گھر سے نکل کر وہ سیدھا ٹریفلگر اسکوائر پہنچا۔

جلوس چل پڑا تھا۔ نوجوان کے چہروں اور ان کے نعروں نے اس کے اندر بھی ایک آواز پیدا کردی اور اس میں بھی احتجاج کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن وہ کس کے خلاف احتجاج کرے؟ اس نے سوائے پنی ذات کے دنیا کے لئے کیا کیا اس کا ذہن ابھی تک اجتماعی نہ بنا تھا۔ جب کبھی اسے زمانے اور سوسائٹی سے شکایت ہوئی تو وہ صرف اپنے مفاد پر زد پڑنے کی وجہ سے۔

اس متحرک جلوس اور نعروں نے اس کے جذبات میں ایک طرح کی حرکت پیدا کی اور اس وقت اس ماحول سے متاثر ہوکر اس کے اندر امریکہ کے خلاف جذبات پیدا ہوگئے اور وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ جلوس کے ساتھ چلتا رہا تو چند نوجوانوں نے اسے

جلوس میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ جواب دینے کی اس میں اس وقت جرات نہ ہوئی لیکن وہ ان نوجوانوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر مسکرا ضرور دیا۔

جلوس بیچ سڑک سے گزر رہا تھا۔ پولیس کا عملہ ان کے ساتھ اسی رفتار سے چل رہا تھا جس رفتار سے جلوس۔ جلوس کے پیچھے پولیس کی کار تھی اور فٹ پاتھ پر دونوں طرف ادھیڑ عمر کے لوگ سنجیدہ چہروں کے ساتھ بڑے ناگوار اور درشت انداز میں اس جلوس کو دیکھ رہے تھے اور کبھی کبھی تو کوئی ادھیڑ عمر کا تماشائی اپنی ناگواری کا اظہار زبان سے بھی کرتا۔ عبید کی طرح کافی لوگ فٹ پاتھ پر جلوس کے ساتھ تماشائیوں کی طرح گزر رہے تھے تو پولیس کے چند سپاہی ان کے قریب آئے اور ان سے کہا' یا تو اس جلوس میں شریک ہوں۔ اگر نہیں تو راہ گیروں کے لئے راستہ چھوڑ دو۔ لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی اور عبید بھی ان منتشر ہونے والے لوگوں میں تھا۔

جب امریکن سفارت خانے کے سامنے تصادم شروع ہوا تو عبید وہاں سے غائب ہوگیا اور ایک گلی میں مڑکر پھر ہائڈ پارک میں آگیا اب اس قسم کے ہنگاموں سے اسے دلچسپی ہوگئی اور جذبات میں اس نے کافی حدت محسوس کی۔ سورج آسمان پر بڑا زرد اور نحیف تھا اس میں روشنی تو تھی لیکن تپش نہیں تھی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ ویسے سورج کے اجالے نے اسے تھوڑا سا مسرور کیا۔ پارک کے اس کونے میں چند آئس کریم کے ٹھیلے' کچھ مونگ پھلی والے' دو ایک ہاٹ ڈوگ کے ٹھیلے۔ ذرا کچھ فاصلے پر چینی کمیونسٹ پارٹی کا اسٹال اس سے ذرا ہٹ کر انارکسٹوں کا اسٹال اور درمیان میں برطانیہ کی سوشلسٹ پارٹی کا اخبار بیچنے والے کھڑے اپنا اخبار بیچ رہے تھے۔ جگہ جگہ مقرر بینچوں پر کھڑے دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ ان کے گرد لوگوں کی بھیڑ تھی۔ سوال وجواب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ ان مقروں میں کوئی عیسائیت کی تبلیغ کر رہا تھا۔ کچھ سالویشن کی بوڑھی عورتیں گاکر لوگوں کو اپنے پیغام کی طرف متوجہ کر رہی تھیں اور کوئی مذہب کی مخالفت میں تقریر کر رہا تھا۔ لیکن ان مقرروں میں اکثریت کالے رنگ والوں کی تھی اور ان کے گرد جو حاضرین تھے ان میں اکثریت سفید رنگ والوں کی تھی جو وہاں کھڑے مونگ پھلی کھاتے' سوال کرتے اور سوالوں کا گرم گرم جواب پاکر قہقہہ لگاکر ہنس رہے تھے۔ عبید ان ساری ٹولیوں کے قریب سے گزرتا ہوا ان لڑکیوں کے قریب آیا

جو ماؤ کی سرخ کتابیں ہاتھ میں مکے کی طرح اٹھا کر چینی ادب بیچ رہی تھیں ان کے پاس ماؤ کی سرخ کتاب کے ترجمے یورپ اور ایشیا کی تقریباً" ساری زبانوں میں تھے عبید جب ان میں سے ایک لڑکی کے قریب آیا تو اس کے رنگ کو دیکھ کر اس نے ماؤ کی سرخ کتاب کا اردو ترجمہ اسے دکھایا۔ اردو کے ایڈیشن کو دیکھ کر اس نے ذرا منہ بنایا اور اپنے چاروں طرف دیکھ کر ذرا آہستہ سے کہا۔

"انگریزی میں ہو تو دکھاؤ"۔

"ضرور" لڑکی آگے بڑھی اور زمین پر جو کتابیں اور چینی لٹریچر رکھا ہوا تھا ان میں سے انگریزی کا ترجمہ اٹھا کر اسے دیا۔ عبید نے اسے دیکھے بغیر اس کی قیمت پوچھی پھر ادھر ادھر دیکھا اور کتاب کو جلدی سے جیب میں رکھ کر اسے پیسے ادا کر کے اس اسٹال سے چل دیا۔ ذرا فاصلے پر اسے رنگ دار لوگوں کی بھیڑ نظر آئی تو اس میں اشتیاق پیدا ہوا تو وہ ادھر چل دیا۔

پارک کے اس کونے میں خاموش پولیس والے سب کو نظر میں رکھے ہوئے لوگوں کے گرد گھوم رہے تھے۔

وہ جب کالے لوگوں کی بھیڑ کے ذرا قریب پہنچا تو اسے ہوا میں لہراتا ہوا پاکستانی پرچم نظر آیا جس کے قریب ایک کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان سر پر قراقلی ٹوپی پہنے انگریزی میں دھواں دھار تقریر کر رہا تھا اور اس کی تقریر کا موضوع "پاکستانیوں پر اسکن ہیڈ کے حملے" تھا وہ بار بار ان جملوں کو دہرا رہا تھا۔

"ہم اس ملک میں رومیوں کی طرح نہیں آئے بلکہ اپنا پیٹ بھرنے آئے ہیں اور ہم اس ملک میں ایک بوجھ نہیں بلکہ اس ملک کی پیداوار بڑھانے میں ایک بڑا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ ہم اس ملک میں کسی جرم میں شریک نہیں"۔

اس جملے کو سنتے ہی بھیڑ میں سے ایک ادھیڑ عمر کے سفید آدمی نے کہا۔

"یہ صحیح نہیں کتنے پاکستانی غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہو رہے ہیں کیا یہ جرم نہیں؟"

اس کے اس اعتراض سے بھیڑ میں قدرے برہمی پیدا ہوئی۔ چند پاکستانی نوجوان اس پر بپھرے بھی لیکن مقرر نے سب کو سختی سے خاموش رہنے کی تلقین کرنے کے بعد جواب

دیا۔

"ہم ان غیر قانونی طور پر آنے والوں کو مجرم سمجھتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ انہیں سزا دے اور ہم ہندوپاک کی دونوں حکومتوں سے التجا بھی کرتے ہیں کہ ان مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ اس سے ان دونوں ملکوں کا وقار یورپ میں سخت مجروح ہو رہا ہے اور ان جرائم کی موجودگی میں ان دونوں حکومتوں کا وہ پروپیگنڈہ جو وہ اپنی پرانی تہذیبوں کے متعلق کرتی ہیں بے کار ہو کر رہ گیا ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ بھی پوچھتے ہیں کہ آخر اس ساری نفرت کا رخ پاکستانیوں کی طرف کیوں۔ ہمیں اس کی سزا کیوں ملتی ہے۔ ہمیں اب کہیں دیکھا جاتا ہے تو مار پیٹ کر ہماری جیبوں میں جو کچھ ہوتا ہے اسے چھین لیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں پولیس ہماری کوئی مدد نہیں کرتی کیا یہ جرم نہیں؟ اس لئے ہمیں خود اپنی حفاظت کرنا چاہئے"۔

عبید خاموشی سے اس تقریر کو سنتا رہا۔ اس وقت واقعی وہ اس تقریر میں کھو گیا اور اس وقت اسے سالوں کی ہتک اور بے انصافی بھی یاد آئی۔ اس یاد نے اس کے خون میں تھوڑی سی حدت پیدا کر دی اور بعض مرتبہ تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے یہ اس کی اپنی آواز ہو۔ تھوڑی دیر بعد جلسے میں پھر گڑبڑ سی ہوئی وہاں پھر اک سفید بوڑھا کھڑا بڑے درشت لہجے میں پھر کہہ رہا تھا۔

"تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ ہمیں اجنبی خیالات' اجنبی لباس اور اجنبی طرز معاشرت پسند نہیں۔ جب تم یہاں نہیں ہوگے تو یہ مسائل بھی نہ پیدا ہوں گے۔" اس کے ان جملوں کو سن کر چند پاکستانی نوجوان اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے بحث کرنے لگے۔ عبید ان کے ذرا قریب آیا تو اسے ان نوجوانوں میں پھر اولیس نظر آیا۔ عبید اس سے نظر بچا کر دوسری طرف جانا چاہتا تھا کہ اس نے اسے دیکھ لیا اور مسکرا کر اسے سلام کیا عبید نے اس کے سلام کا جواب دیا تو وہ اس کے قریب آکر اس کی مزاج پرسی کرنے لگا۔

"کہو کیسے مزاج ہیں؟"

"بس جی رہا ہوں۔" عبید نے جواب دیا۔

"یہ تو مجھے نظر آرہا ہے۔ اب کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو پہلے کر رہا تھا"۔

"لیکن اب اس "کرنے" میں کچھ اضافہ کرلو۔ دیکھتے نہیں آج کل ہم لوگوں پر یہاں کیا بیت رہی ہے؟"

لیکن مجھے تمہارے خیالات سے اتفاق نہیں۔ تم ہر جگہ اسلام کو لے آئے ہو' اب یہ تمہاری عادت بن چکی ہے۔

(جاری ہے)

(لندن۔ ۱۹۷۴ء)

پورا چاند آدھا آدمی

لندن میں سورج کا سب کو انتظار رہتا ہے۔ لیکن اس سال... جب گرمیوں کا موسم آیا تو جون کا مہینہ ضرورت سے زیادہ روشن اور گرم رہا۔ ان دنوں سورج صبح سویرے تقریباً" پانچ بجے لندن کے آسمان پر براجمان ہو جاتا اور رات کے دس بجے وہ شہر لندن کو شام نما ہلکی سرمئی رات کے اندھیرے اور ٹھنڈی ہواؤں کے سپرد کر کے آسمانوں میں پھر کہیں چھپ جاتا۔

ان دنوں جب لندن والے صبح سویرے بستروں سے اٹھ کر اپنے خوبصورت آرام دہ مکانوں کی کھڑکیوں کے پردے سرکاتے تو سورج کی کرنیں کھڑکیوں سے پھسل کر ان کے کمروں کے فرش ان کے خوبصورت پھولوں کے گلدانوں' اور کمروں کی سجاوٹ کی دوسری چیزوں پر ابرق کی طرح مچلتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ ننھی ننھی ترچھی کرنیں باورچی خانوں کی طرف رینگنے لگتیں تو ان خوبصورت مکانوں میں رہنے والوں کو صبح کی تازگی کے ساتھ کرنوں کی شوخیوں کو دیکھ کر تھوڑی سی خوشی بھی مل جاتی۔

وقت مقررہ پر دفتروں اور فیکٹریوں میں پہنچنے کے لئے وہ جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر جب اپنی گلیوں اور سڑکوں پہ آتے تو صبح کی تازگی کے ساتھ دھوپ انہیں چاروں

طرف پھیلتی ہوئی نظر آتی' راہ چلتے ہوئے انہیں رنگ برنگے پھولوں اور ہرے بھرے درختوں سے بھی واسطہ پڑتا تو ان کی خوشی میں تھوڑی سی اور توانائی پیدا ہو جاتی۔ اس لئے راستے میں جن شناساؤں سے ملاقات ہوتی تو تعلقات کے پیش نظر کسی سے ہیلو اور کسی سے گڈ مارننگ کا تبادلہ ہوتا رہتا۔

سورج کی روشنی' پھولوں کی بہار' تازہ ہوائیں اس کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں خوشی کی موجودگی ان ساری چیزوں سے لندن میں انسانی زندگی کسی قدر خوش گوار ہو جاتی ہے لیکن اس جون کے روشن اور گرم مہینے میں ایک دن ایسا بھی آیا کہ نہ جانے کیوں سورج آسمان پر چمکتا ہوا نظر نہ آیا' بادلوں نے دن کے اجالے کو پھر ذرا دھندلا دیا۔ ہواؤں میں بھی ضرورت سے زیادہ خنکی پیدا ہو گئی۔ فضاء پھر ناخوشگوار بن گئی۔ لوگ پھر ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر۔۔۔ فاصلے رکھتے ہوئے صنعتی شہر کی تیز رفتار زندگی کا ساتھ دینے لگتے۔ لیکن یہ عادت تو ان کی بڑی پرانی تھی۔ اسی کے بل بوتے پر عیش و عشرت موہوم سی بے چینی انہیں پیداوار بڑھانے کی خاطر انعام کے طور ملا کرتی۔ دھوپ اور خوشگوار موسم کی طرح یہ چیزیں بھی تو ان کی زندگی کی ضروریات بن گئی تھیں۔ ان کے بغیر اب جینا محال تھا۔ اس لئے وقت اور حالت کیسی بھی ہو اپنی ضروریات اور تعیش کی خاطر کام پر انہیں ضرور جانا پڑتا۔

رمضان کے مقدس ایام بھی اس سال اسی مہینے میں آئے۔ لیکن تصدق رسول کی عادتوں اور مزاج نے اس مقدس مہینے کا استقبال نہ کیا۔ تھوڑی سی رسہ کشی کے بعد اس کے ایمان نے اس کے مزاج اور عادتوں پر غلبہ پالیا۔ اپنے اندر اپنی عادتوں اور مزاج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سارے سال میں یہی دن تو ایسے ہوتے ہیں جب مسلمان کے جینے میں ایک طرح کی معنویت پیدا ہو جاتی ہے"۔

رمضان کے ابتدائی دنوں میں روزہ داری کے وقت بھوک' پیاس' سگریٹ نوشی کی طلب' بار بار چائے کافی پیتے رہنے کی خواہش' اس کے ساتھ میٹھی میٹھی چیزوں کا شوق۔ خوبصورت عورتوں کے نظارے' ان کی صحبتیں اور دوسری عادتوں نے اس کے اندر کافی رسہ کشی کی۔ روزے کے تقدس کی خاطر تصدق رسول اپنی ہر خواہش سے نبرد آزما رہا۔ نیت اور ارادوں کی وجہ سے کامیابی اسے ملی لیکن ردعمل میں اپنے اندر جھنجھلاہٹ اس

نے ضرور محسوس کی۔ اس مقدس مہینے میں وہ خدا کو ضرور خوش کرنا چاہتا تھا' تاکہ لندن کی پرعیش اور سنہری زندگی میں اس سے تعلق کمزور نہ ہو۔ اس احساس نے تصدق رسول کی زندگی میں جب ارادے کی شکل اختیار کرلی تو اپنے نفس اور پرانی عادتوں پر قابو پانے میں اسے زیادہ جدوجہد نہ کرنا پڑی۔ اس روزہ داری میں تھوڑے دن اور گزرے تو اس کی اپنی بھوک پیاس۔ مجبوری اور بے بسی ایک طرح کا جام جمشید بن گئی۔ اسی بھوک اور پیاس میں اس نے دوسرے بھوکے پیاسے انسانوں کی ضرورت اور مجبوری کو محسوس کیا۔ بھوک پیاس سے آدمی کتنے دکھ محسوس کرتا ہے' وہ خود روزے کی حالت میں اسی مقام پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ انسان کے ان دکھوں کا ذاتی تجربہ کرکے اسے کچھ سکون اور آگہی ملی' روزے کی حالت میں وہ انسانی دکھوں سے اور قریب آگیا۔

جس دن رمضان کے مہینے میں دھوپ تیز ہوتی تو اس کا حلق خشک ہو جاتا پیاس اس کے لبوں پر آجاتی' ان لمحات میں وہ تیسری دنیا کے ان مجبور بھوکے اور بیمار لوگوں کے متعلق سوچنے بیٹھ جاتا جن کی تعداد زمانے اور سائنس کی ترقی کے ساتھ برابر بڑھتی جارہی ہے ایڑیاں رگڑرگڑ کر اس دنیا سے اس عمر میں جارہے ہیں جو مرنے کی عمر نہیں۔ ان کی مجبوری' بھوک اور بیماری کی یاد اس کے اندر ایک طرح کا سناٹا سا پیدا کردیتی۔ اس وقت اپنی بھوک پیاس کی وجہ سے نفس کی جھنجلاہٹ اور اس کی اپنی کوئی پرانی عادت بالکل سر نہ اٹھاتی۔

خدا سے تعلق رکھنے کی خواہش اور انسانی دکھوں کے ذاتی تجربے سے جو آگہی اسے ملی اس نے اس کے نفس اور جسم کی ضرورتوں کو ان دنوں ٹھنڈا کرکے رکھ دیا۔ لیکن جب اس کے سامنے سے کوئی حسین عورت گزرتی تو اس کے نظارے کے لئے وہ اپنے اندر ایک شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس کرتا۔ شعلہ کی لپک میں ایسی شدت ہوتی کہ وہ اپنے اعصاب تک میں ایک طرح کی جلن محسوس کرتا۔ لیکن روزے کی حالت میں اس حسین عورت کو دیکھنے کے لئے وہ دوبارہ نظر نہ اٹھاتا' بلکہ روزے کی وجہ سے جو ایک قسم کا Atoma عادت کی طرح اس کے اندر پیدا ہوگیا تھا۔ نظروں کو جھکائے اس مقام سے جلد سے جلد گزر جاتا۔ لیکن اس عمل سے اس کے رومانی جذبات لہولہان ہو جاتے۔ حسین عورتوں سے تعلق کی اس میں کتنی شدید خواہش تھی' لیکن روزے کی حالت میں اب وہ

کسی کی پرواہ نہ کرتا۔ کبھی کبھی یہ حسن پرستی اس کی ہر خواہش پر غالب آجاتی تو روزے کی حالت میں وہ بڑا اضطراب اور بدحواسی محسوس کرتا۔

تصدق رسول خود ایک رومانی شاعر تھا۔ حسن جو بچپن سے ہی اس کی توجہ کا مرکز رہا' رنگ اور خوشبو ہمیشہ اس کے ساتھ سائے کی طرح رہتے لیکن ان دنوں روزہ صرف منہ کا ہی نہیں بلکہ جسم کے ہر حصے کا تھا۔ روزے کی حالت میں جسم اور ذہن کے کسی حصے سے ایسا کام نہیں لیا جاسکتا جو اللہ سے تعلق کو کمزور کردے۔

اگر جسم اور ذہن کے کسی حصے سے گناہ کیا تو صحیح معنوں میں روزہ مکمل کب رہا۔ جسم اور ذہن کا ہر حصہ اس احساس کا ساتھ دے۔ آدھے روزے پورے ہونے کے بعد عموماً" جب کبھی تصدق رسول کے سامنے (روزے کی حالت میں) حسین عورتیں خوشگوار موسم ٹھنڈی ہواؤں اور دھوپ سے لطف لیتیں قہقہے لگاتیں اس کے سامنے سے گزرتیں تو اب خودبخود اس کی نظریں جھک جاتیں۔ اس حالت میں ارادے سے وہ اس وقت کام لیتا جب ان حسین قہقہوں کی موسیقی اس کے جذبات میں ارتعاش پیدا کرتی تو اسے درد کی طرح سہہ کر ان سے بے تعلق ہو کر آگے بڑھ جاتا۔ رمضان کے احترام اور برکتوں کی خاطر وہ ہر اس جذبے اور خواہش کو اپنے اندر ختم کرنے کا تہیہ کرچکا تھا جو روزے کی حرمت کو اس کے اندر ذرا بھی مجروح کرے۔ جب وہ راہ چلتے ہوئے اپنے فاسد جذبوں پر قابو پالیتا تو پھر اپنی طبیعت کو سنبھالنے کے لئے مناظر قدرت۔ نیلا آسمان' خوش رنگ پھول یا کسی حسین یا متوازن چیز کا مطالعہ کرکے طبیعت کو بہلاتا رہتا۔ یا کسی نیک کام کو تلاش کرنے لگتا کیونکہ نیکی' عدل' انصاف' رحم' دوسروں کے کام آنا بھی تو حسن ہیں۔ روزوں کے بعد تصدق رسول نے اپنے جسم کے ہر عضو' اور نفسیاتی خواہش پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ لیکن یہ پرانی عادتیں اور خواہش اس کی مضبوط گرفت کے باوجود اس کے اندر زندہ رہیں' وہ روزے کی حالت میں انہیں بھی محسوس کرتا' دھوپ کھانے کی ان دنوں لندن میں سب کو خواہش تھی۔

ان دنوں خوبصورت سنہرے بالوں والی لڑکیاں جا نگیہ پہنے ننگے پیر بازاروں' گلیوں اور پارکوں میں نظر آتیں تو یہ دلی خواہش پھر چنگاریوں کی طرح دہک کر شعلے بن جاتیں اور تصدق ان خواہشوں کی شدت محسوس کرکے آنکھیں بند کرلیتا۔ لیکن اس تصادم سے

اس کا ذہنی اور جذباتی نظام بڑا متاثر ہوتا اور اس کے زور کو توڑنے کے لئے وہ خود کو کسی نیک کام میں مصروف کرلیتا۔ جب یہ نیم برہنہ لڑکیوں کا طوفان اس کے سامنے سے گزر جاتا تو وہ لندن کے آسمان پر پھیلے ہوئے اودے اودے بادلوں کو دیکھنے لگتا۔ خصوصاً" شفق کے رنگ میں یہ اودے اودے بادل ذرا گلابی ہو جاتے تو انہیں دیکھ کر اس پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی۔ لندن کی پرانی اونچی اونچی برسات کی سیاہی میں ڈوبی ہوئی عمارتوں کے عقب میں شفق کے قرمزی رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل کتنے حسین ہو جاتے۔ اور ایسے عالم میں جب کوئی پرندہ پر تولتا ہوا شفق کی طرف بڑھتا تو تصدق رسول اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا۔ اور کبھی کبھی اس میں کھو جاتا۔

تصدق رسول لندن میں تقریباً" پندرہ سال سے رہ رہا تھا۔ قد متناسب ذرا دبلا پتلا' چھوٹی چھوٹی بجھی بجھی سی آنکھیں اس طرح روشن ہو جاتیں جیسے کسی نے ڈوبتے چراغ کی بتی کا سرا اونچا کردیا ہو۔ لندن میں آکر اس نے دنیا میں تیرنا سیکھ لیا تھا' لیکن اس کی شخصیت کا بہت بڑا حصہ ابھی تک اس کے دینی آئیڈیل اور خوابوں میں چھپا ہوا تھا۔ جب وہ اپنے غریب ملک میں تھا تو اپنی تہذیب اور اپنے لوگوں کی بہتر زندگی کے منصوبے بناتا رہتا۔ اور جو جدوجہد اس کے لئے شروع ہوتی وہ اس میں بھی شریک ہوتا۔ چند ہی مہینے کے بعد لندن کے سنہرے دن اس پر ایسے غالب آئے کہ اسے نہتا دیکھ کر اس کی کمزوری نے بھی اپنی گرفت اس پر مضبوط کرلی۔ حسین عورتیں اسے بچپن سے پسند تھیں لیکن اپنے غریب ملک کے معاشرے' اس کی اخلاقی اقدار' رسم و رواج نے اس کی اس رومانی خواہش کو کبھی سر اٹھانے نہ دیا۔ عورت کا حسن اسے اپنی طرف اسی طرح بلاتا' جس طرح سمندر کی لہریں چاندنی رات میں ہاتھ پھیلا کر دیکھنے والے کو اپنی طرف بلاتی ہیں۔

وہ عورت سے کیا چاہتا ہے۔ اس سے وہ پوری طرح واقف نہ ہوسکا البتہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی شدید تمنا ضرور اس کے ساتھ رہتی۔ لندن کی اس Golden Age میں اسے سارے مواقع حاصل تھے' برٹش ریل کے دفتر میں وہ کلرک تھا۔ وہیں کلرکی کرتے ہوئے مشغلے کے طور پر کچھ امتحانات پاس کئے جب گرمیوں کا زمانہ آتا تو چھٹیاں گزارنے یورپ کے خوبصورت شہروں میں چلا جاتا۔ اسے امتحانات میں کامیاب ہونے کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی ملیں' لیکن عورت سے تعلق کا تصور اس کا

ابھی تک مشرقی تھا۔ وفا اور ایثار' لیکن یورپ کی جدید عورت کے نزدیک ایسی صفات مرد کے تصرفات کے عناصر ترکیبی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو مرد سے اس قسم کے تعلق کی روادار تھی جیسے سمندر کی شوخ لہر مچلتی ہوئی ساحل پر آئے اور جلدی سے چھوکر اپنی آزادی کی خاطر پھر سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرتی رہے۔ یورپ کی اس Gloden Age میں مرد اور عورت کی محبت تو ایک Game بن کر رہ گئی تھی۔ اس کا ان دنوں صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ ایک دوسرے کو ہتھیا جائے اس Game اور لندن کے عیش عشرت سے تصدق رسول بڑی جلدی تنگ آگیا۔ اضطراب۔ خالی پن اور کاہلی' لوگوں اور کتابوں کا مطالعہ کرنا اور سوچنا' اس کا عقیدہ اور ماضی کے ارادے سب لندن کے سنہری دنوں کی راکھ میں چنگاریوں کی طرح دب کر رہ گئے تھے۔ وہ صرف اس وقت انگاروں کی طرح دہکتے جب اس کو کوئی حادثہ پیش آتا تب وہ دینی کاموں میں چندہ دے کر۔ یا اپنے غریب ملک میں کسی ضرورت مند کے کام آکر اپنے اضطراب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا اور اپنے عقیدے کو دوبارہ اپنی زندگی کا محور بنانے کی سوچتا رہتا۔

تصدق رسول نے اس سال ماہ رمضان میں روزوں کا جو اہتمام کیا تھا وہ اسی کشمکش کے دباؤ کا نتیجہ تھا کیونکہ اس کے عقیدے نے اس کے جینے میں ایک معنویت پیدا کردی تھی۔ یورپ میں یورپین کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے علوم و فنون سے واقفیت یہاں کی چیزوں اور خیالات کو برتنے کے بعد اب یورپ کا اس پر کوئی رعب نہ رہا۔ وہ یورپ اور اپنی تہذیب کے پیدا کردہ رجحان سے واقف تھا۔ یورپ کو طاقت (Power) سے دلچسپی تھی۔ اور اسلامی تہذیب کو انسان کے لئے انصاف اور مساوات اس کے عقیدے کے مطابق دنیا ایک نعمت تھی جو خدا نے انسان کو دی تاکہ اس دنیا کو اپنے عقیدے کے پیدا کردہ عدل کے ساتھ برت کر اپنی آخرت بنائے' اسے Power سے اب وحشت ہونے لگی۔ انسان کے لئے انصاف اور مساوات اس کی دلچسپی کی چیزیں بن کر رہ گئیں۔ البتہ یورپ میں عیش کرنے اور سوچنے کے علاوہ اس میں شک کرنے کی عادت بھی پڑگئی تھی۔ تصدق رسول ڈھونڈ ڈھونڈ کر شک و شبہات اپنے اندر سے نکالتا اگر کچھ شکوک اسے کام کے نظر آتے ان سے کام لیتا۔ بعض غلط فہمی اور بعض کسی دشمنی پر مبنی ہوتے۔ ان سے واقف ہوکر انہیں اپنے ذہن سے دھول کی طرح جھاڑ کر پھینک دیتا۔ اب اسے یورپ

کے معاشرتی نظریات سے زیادہ یورپین قدرتی مناظراور ان کی عورتیں زیادہ حسین نظر آتیں۔ ہاں یورپی تہذیب میں احترام آدمیت' جسم کی پرورش اور صحت' ان کی ٹیکنالوجی۔ یہ چیزیں ایسی ضرور تھیں جن کا اس کے دل میں احترام تھا۔ جس دن وہ سوچنے میں زیادہ وقت صرف کرتا اس کے بعد اسے نیند خوب آتی۔ اس کی نوجوانی کو گزرے ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے جسم اس کا توانا اور چاق و چوبند تھا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ہنراس نے یورپ میں سیکھا تھا۔

ان تھوڑے سے دنوں میں روزہ داری نے تصدق رسول میں بڑی نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ دفتر میں جہاں وہ کام کرتا خوبصورت لڑکیوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتا۔ جب کبھی لندن کا موسم اچھا ہوتا تو کسی کے ساتھ شام یا رات لندن کے کسی اچھے ریستوان' کلب یا کسی دوسری تفریح گاہ میں صرف کرتا اور مہمان خوبصورت لڑکی کو خوش اور مرعوب کرنے کے لئے جی بھر کر اس پر رقم خرچ کرتا کیونکہ لندن کے ان سنہرے دنوں میں بازی صرف دولت لٹانے سے ہی حاصل کی جاسکتی تھی لوگوں کے لئے پیسہ ہی الہ دین کا چراغ بن چکا تھا۔ دولت ہی کو اکثرو بیشترلوگ مشکل کشا تصور کرتے تھے۔ لیکن اس طرح دولت کے ذریعے زندگی کو ایک کھیل بنانے سے حقیقی خوشی کی پیاس اور بڑھ جاتی۔ اور پھرلندن کے کہرزدہ سنہرے دنوں میں خوشی کو اسی طرح تلاش کرتے رہتے جیسے اندھیرے میں کوئی غار سے نکلنے کے لئے راستہ تلاش کرے۔ بعض مرتبہ دولت سے حاصل کی ہوئی Exitement جسے وہ خوشی قرار دیتے بالکل اسی پیاس کی صورت اختیار کرلیتی جیسے ناتواں کشتی میں کوئی سمندر کے لمبے سفر میں سمندر کے کھارے پانی کو پی کر محسوس کرے۔

تصدق رسول ان سارے تجربوں سے کشتی کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر اپنا راستہ بھول چکا تھا۔ روزہ داری نے جب بھوک پیاس' مجبوری اور بے بسی کے ہچکولوں کے بعد اس کی زندگی میں معنویت پیدا کی تو اس نے اس احساس کو مضبوطی سے تھام لیا۔ لیکن اس روزہ داری سے تصدق رسول میں جو تبدیلی پیدا ہوئی' دفتر کی لڑکیوں کو اس پر تعجب ہوا۔ کوئی صرف تعجب کے احساس سے ہی لطف لے کر اپنے دوسرے کام میں الجھ جاتی کیونکہ وہ جوان تھی اور اسے اپنے حسن اور لوگوں کی طلب کا احساس تھا۔ جو ذرا عمر پختہ کی طرف

بڑھ رہی تھیں انہوں نے اس تبدیلی کو نفسیاتی بیماری پر محمول کیا۔ کیونکہ اس معاشرے میں اس Rat race میں گر کر کافی ایسے بنتے جارہے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ یہاں Nur لگی ہوتی ہے جب تصدق رسول نظریں جھکا کر اپنے کام سے کام رکھتا تو لڑکیوں نے بھی ایسی ہی سردمہری اختیار کرکے اسے اپنے ذہنوں سے بالکل اسی طرح نکال کر پھینک دیا جیسے کوئی دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دے' تصدق رسول کو ان ساری چیزوں کا احساس تھا۔ لیکن یہ رویئے روزے کی حالت کو دکھ نہ پہنچا سکے۔ دفتر سے فارغ ہوکر راستے میں جو اسے چھوٹی سی مسجد ملتی۔ وہاں جاکر ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھتا اور مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے وہیں مسجد میں روزہ افطار کرنے بیٹھ جاتا۔ جہاں قریب ہی بنگالی مزدوروں کے گھروں سے ان کے بچے روزہ داروں کے لئے افطاری لاتے۔ تصدق رسول خود بھی اپنے ساتھ کافی پھل لاکر اس افطاری کے ساتھ شامل کرکے روزہ داروں کو کھلاتا اور جو پھل وہ لاتا اس میں عرب کی کھجوریں ضرور ہوتیں کیونکہ ہمارے نبیؐ کو یہ کھجوریں بہت پسند تھیں۔ تراویح اور دوسری نمازیں وہ گھر پر ادا کرتا۔ بعض اپنے انگریز اور یورپین دوستوں کو رمضان کے دنوں میں اپنے گھر پر مدعو کرکے ان کے لئے وہ کھانے پکاتا جو انہیں پسند ہوتے۔ ان مقدس دنوں میں ان کاموں کو انجام دینے کے باوجود وہ نیکیاں تلاش کرتا رہتا۔ اور کوشش کرتا کہ لوگوں اور اللہ کی مخلوق کے کام آئے۔

اسی جون کے مہینے میں ایک دن پھر لندن شہر میں ایسا آیا کہ شہر دھوپ میں ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ فاصلے سے ہلکی ہلکی کہر آسمان کے کناروں پر جھالر کی طرح لگی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ایسے خوشگوار اور خوبصورت دن کو چھوڑ کر دفتر کی چہاردیواری میں وقت گزارتا تصدق رسول کے لئے ایک بار محسوس ہوا اس نے اپنے دفتر انچارج کو فون کیا۔ اور جو چھٹیاں اس کی باقی تھیں ان میں سے ایک مہینے کی درخواست کی۔ آفیسر انچارج اس پر مہربان تھا خوش گوار موسم کو دیکھ کر تصدق رسول کی ضرورت کو اس نے محسوس کیا اور تصدق نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر سے نکل کر Heath جو ذرا فاصلے پر اس کے گھر کے سامنے پھیلی ہوئی تھی وہاں پہنچ کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہوکر دھوپ میں نکھرے لندن کو دیکھتا رہا۔ لیکن روزے کی حالت میں خود کو مصروف رکھنے کے لئے اسے کچھ اور

کاموں کی بھی ضرورت یاد آئی تاکہ گھر پر بے کار پڑے رہنے سے بھوک پیاس۔ سستی اس کے پاس پھٹکنے نہ پائے۔ Heath پر چہل قدمی کر کے جب وہ گھر واپس آیا تو اسے پھر کچھ چیزیں خریدنے کا خیال آیا' اس کام کے یاد آنے پر وہ خوش ہوا اور سوچا سارے ہفتے کے لئے کھانے پینے کا سامان آج کیوں نہ خرید لیا جائے۔ سامان کے لئے باورچی خانے سے دو تھیلے اٹھائے اور گھر سے نکل کر پھر سڑک پر آگیا۔

جہاں وہ رہتا تھا وہ لندن کا ایک پوش علاقہ تھا یہاں تصدق رسول صرف رہنے کا لطف لیتا یہاں کی صفائی سڑکوں کی کشادگی۔ گھروں کے سامنے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے باغیچے شاندار جدید طرز کی دکانیں لیکن ان دکانوں میں علاقے کی نسبت سے ہر چیز مہنگی تھی۔ تصدق رسول سوچتا آخر ان چیزوں کو مزدوروں کے علاقے میں جو دکانیں ہیں وہاں سے کیوں نہ خریدا جائے اور اس طرح پیسے بچا کر ان پیسوں کو کسی بہتر اور اعلیٰ مقصد کے لئے صرف کیا جائے خصوصاً" اس رمضان کے مہینے میں اپنے غریب ملک میں رہتے ہوئے کفایت شعاری کی اسے عادت پڑ گئی تھی۔ ان سارے خیالات کے ہم راہ وہ پیدل اپنے پوش علاقے سے گزرتا ہوا' وہاں کی شاندار جدید طرز کی دکانوں کو چھوڑتا ہوا' مزدوروں کے علاقے کی طرف بڑھتا رہا' جو اس کے علاقے سے زیادہ دور نہ تھا۔

اس کے اپنے علاقے اور مزدوروں کی بستی کے درمیان ایک کشادہ سڑک تھی۔ اسے پار کر کے دو چھوٹی چھوٹی گلیوں سے اسے اور گزرنا پڑا۔ مزدوروں کے علاقے میں آیا تو وہاں آکر تصدق رسول نے اپنی رفتار ذرا اور تیز کردی تاکہ سپر مارکیٹ میں جلد پہنچ جائے کیونکہ دیر ہونے کے بعد گرہستی عورتیں اپنے گھروں کے کاموں سے فارغ ہو کر سپر مارکیٹ کی طرف آتیں تو وہاں کافی بھیڑ ہو جاتی۔

تصدق رسول جب یہاں پہنچا تو گاہک زیادہ نہ تھے جلدی سے اس نے اپنی ضروریات کی چیزیں خریدیں اور سپر مارکیٹ سے نکل آیا۔ سپر مارکیٹ سے نکل کر اسے ضروریات کی کچھ اور چیزیں یاد آئیں جنہیں وہ سپر مارکیٹ میں خریدنا بھول گیا تھا وہ اسے ایک چھوٹی سی دکان سے خریدنا پڑیں جس کی قیمت اسے زیادہ دینا پڑی جو اس وقت گراں گزری۔ کیونکہ منافع خوروں سے زیادہ ان دنوں وہ ضرورت مندوں کا خیال رکھتا کیونکہ یہاں تو دولت سے سب کو عشق ہے۔ جتنی مل سکے لیکن طبیعت پھر بھی سیر نہ ہو بلکہ دوسرے کی

امیری کو دیکھ کر اپنی امیری بڑھانے کی ہوس یہاں ایک Game بن چکی تھی۔ ہر ایک یہی سوچتا سب سے زیادہ میرے پاس ہو مجھ سے آگے کوئی نہ بڑھ سکے۔ دکان سے نکل کر تصدق رسول سڑک پر آیا کچھ دیر یہاں چل کر پھر ایک گلی میں مڑا اسے طے کر کے ایک AL سے گزرا اس کے بعد پھر مزدوروں کے علاقے میں آخر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھیلے لئے اس علاقے کی فٹ پاتھ سے گزرتا رہا۔ یہ علاقہ پہلے علاقے سے ذرا مختلف تھا۔ جہاں کونسل کے بنائے ہوئے جدید مکانات' فلک شگاف عمارات تھیں ان عمارتوں کے اردگرد چھوٹے چھوٹے پارک' بچوں کے کھیلنے کے لئے طرح طرح کے پارک درختوں کی ایک لمبی قطار' ان ہی کے آس پاس کہیں کہیں کاریں جو قدرے پرانی اور میلی کچیلی' کہیں کہیں بڑے بڑے سفید دھبے جو سورج کی روشنی میں بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ انگریزوں کی طرح ان کی اس بستی پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ یہاں کچھ پرانے مکان ایسے بھی تھے جن کی مرمت ہو رہی تھی۔ محنت مزدوری کرنے والوں کے ان جدید گھروں میں تقریباً" وہ تمام سہولتیں تھیں جو کسی زمانے میں صرف امیروں' اس کے بعد متوسط طبقے کے پیدائشی حقوق تصور کئے جاتے۔

ہمارے زمانے کی انسانی حقوق کی جدوجہد نے ان میں سے کافی سہولتوں کو محنت مزدوری کرنے والوں کی ضروریات میں شامل کرنے کا نعرہ لگایا تو سرمایہ داروں نے ان کی بیداری سے چوکنے ہو کر کچھ سہولتیں ان کے سامنے بھی ڈال دیں۔ جس طرح بھوکے اور غصے والے کتے کے سامنے چھوڑی ہوئی ہڈیاں۔

لیکن صدیوں تک افلاس' بد نظمی اور محرومیوں میں محصور ہو کر جس قسم کی زندگی گزارنے کے یہ محنت مزدوری کرنے والے عادی ہو چکے تھے اس کی پیدا کردہ بہت سی عادتیں اب بھی ان کے ساتھ تھیں۔ پالتو جانوروں میں صرف کتے اور بلیاں ان جدید گھروں میں انہیں رکھنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی مالکوں کے گھروں سے جاتے ہی خود بھی سڑکوں اور گلیوں میں مٹرگشت کے لئے نکل آتے اور جگہ جگہ سونگھتے پھرتے۔ جب کبھی ان میں کسی کو پیشاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو اپنی پچھلی ٹانگ اٹھا کر بڑی موٹر کار کے پہیئے یا دیوار کی آڑ میں پیشاب کرتا اس کے بعد پھر ہڈی کی تلاش میں نکل جاتا۔

کتوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر جو لوگ گزر رہے تھے وہ ایک دوسرے کو بغیر دیکھے گزر جاتے لیکن جب ان کی آپس میں نظریں ملتیں تو وہ نہ صرف نظریں ہی ایک دوسرے سے پھیرتے بلکہ کوئی راہ گیر تو اپنی انسانی بے تعلقی یوں ظاہر کرتا کہ گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اس روشن دن ہوا بھی خوب چل رہی تھی۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر استعمال کی ہوئی چیزیں' خوبصورت پیکنگ کے کاغذ' پنی' Beer کے ٹن راہ گیروں کی ٹھوکروں سے ٹکرا کر ادھر ادھر لڑھکتے نظر آتے۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر یہ لاوارث گندگی کچھ ایسی ہی تھی جیسے برصغیر پاک و ہند کی سڑکوں پر لاوارث چیزیں اور پان کی پیک نظر آتی ہے۔ خاموشی انگریزی کردار کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ اس وقت ان کی اس بستی پر بھی قائم تھی۔ راہ گیروں کے علاوہ جوان خوبصورت مائیں بھی گھر کے کاموں سے فارغ ہوکر اپنے بچوں کو گاڑیوں (Prams) میں لئے ہوئے فٹ پاتھ سے گزر رہی تھیں۔ مکانوں کی مرمت کرنے والے مزدور جو دوپہر کے کھانے کی چھٹی میں کھانے سے فارغ ہوکر اپنے اپنے ہاتھ سے سگریٹیں بنا کر اسے پیتے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھتے تو ان خوبصورت جوان ماؤں پر بھی ان کی نظریں پڑ جاتیں تو خوشی سے وہ اچک پڑتے۔ انہیں اشارے کرتے ان پر ہنستے ہوئے فقرے کستے۔ تحسین کی خاطر سیٹیاں بجا بجا کر ان خوبصورت ماؤں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔ راہ چلتی ہوئی خوبصورت مائیں مردوں کی ان سیٹیوں اور فقرے بازی کو چاہت اور تحسین کی طرح محسوس کرتیں تو بے اختیار مسکراہٹ ان کے چہروں پر پھیل جاتی لیکن ان مردوں کو جواب دینا تو درکنار ان کی طرف نظریں اٹھا کر بھی نہ دیکھتیں۔ انہیں تو اس عمر میں چاہت اور تحسین کی ضرورت تھی۔ تاکہ انہیں برابر یقین ہوتا رہے کہ وہ اب بھی چاہت کے قابل ہیں۔ ان کے حسن میں اب بھی دلکشی ہے۔

روزے دار تصدق رسول سورج سے روشن اور گرم دن میں اس محلے کی فٹ پاتھ سے نظریں جھکا کر گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی راہ چلتے ہوئے تصدق رسول کی نظریں اضطراری طور پر کسی خوبصورت ماں کی نظروں سے ٹکرا جاتی تو اس کے حسن کے نظارے کی جھلک سے وہ اپنے اندر پھر شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس کرتا لیکن اس شعلے پر درد کی طرح قابو پا کر پھر نظریں جھکا لیتا۔ نظروں کو جھکا لینے پر سامنے والی خوبصورت ماں پر بالکل دوسرا ردعمل

ہوتا وہ سوچتی یہ رنگدار آدمی مجھے نظرانداز کر رہا ہے۔ اس خیال سے متاثر ہو کر وہ بھی غصے میں اکڑ کر اپنی نظریں دوسری طرف کر لیتی۔ جیسے وہ بھی اس رنگدار آدمی کو بتانا چاہتی ہو کہ اس ملک میں کسی خوبصورت عورت کا کسی مرد کو دیکھنا ایک طرح کا اعزاز ہے۔ آخر مجھے دیکھ کر تڑپ اور خواہش کیوں پیدا نہ ہوئی۔ اس عمر میں تو مرد کے اندر خواہش حسرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یہاں کے تیز رفتار معاشرے میں ہر لحہ کسی نہ کسی قسم کی حرکت رہتی۔ ان طرح طرح کی حرکتوں کے لوگ اب کچھ اس طرح عادی ہو چکے تھے جیسے وہ ان دیکھی مشین کے پرزے بن کر رہ گئے ہوں۔ زندہ رہنے کے لئے حرکت ہر جگہ استعمال کی جاتی۔ پیداوار بڑھانے کے لئے' راستہ چلتے ہوئے' اپنی اہمیت اور انفرادیت جتانے کے لئے اور کبھی غرور اور گھمنڈ میں ایک دوسرے سے ٹکرانے میں۔ تصدق رسول بھی اس معاشرے میں رہتے ہوئے اس عادت اور Atomation سے قدرے متاثر ہوا تھا اس وقت روزے کے پیش نظر اپنی زبان کو لگام دینے کے ساتھ اپنی آنکھوں پر خول چڑھائے ماحول کی ساری حرکتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے نظروں کو جھکائے رکھتا اور چلتا رہا۔

بادلوں نے آسمان پر سورج کو پھر اپنی چادر میں لپیٹ لیا' ہوا بھی ذرا ٹھنڈی پڑ گئی' راستے میں پڑے ہوئے کاغذ کے گندے پرزے پتنگوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ تصدق رسول نے ان اڑتے ہوئے کمزور کاغذ کے گندے پرزوں کو دیکھا اور ایک گلی کی طرف مڑ گیا تو اسے پھر ایک خوبصورت دبلی پتلی جوان ماں' سفید ٹی شرٹ تنگ زین کی پتلون' پیروں میں اونچی ایڑی کے سینڈل' بڑی خوبصورت جھیل کی طرح گہری نیلی آنکھیں لیکن اس وقت ان خوبصورت آنکھوں میں بیزاری' غصہ' گھمنڈ اور نسوانی غرور کا کاجل رچا ہوا تھا' لبوں پر سرخ تحریر' ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ' دوسرا ہاتھ پریم کے ڈنڈے پر وہ Pram کو لئے ہوئے دوسری سمت جا رہی تھی۔ اس سے اپنے غصے اور بیزاری پر اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔

اس کے پیچھے اس کا ایک معصوم بچہ سنہرے بالوں نیلی آنکھوں والا بالکل ماں کی طرح (یہی کوئی تین ساڑھے تین برس کا) ذرا تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ اپنی ماں کے قریب ہو جائے لیکن ماں کی رفتار فاصلے کو اور سائے کی طرح دراز کر دیتی تو وہ اپنی رفتار

اور تیز کر دیتا لیکن فاصلہ برابر دراز ہوتا رہا۔ تو اس نے روہانسا ہو کر اپنی ماں کو تتلاتے ہوئے آواز دی۔

"امی! ذرا ٹھہر جا۔" بچے کی آواز سن کر ماں ٹھہر گئی مڑ کر اسے دیکھا پھر سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر بچے کو ایک گھرکی دی "جلدی کر۔" بچہ ماں کی اس گھرکی کو سنتے ہی پھر اور تیز چلنے لگا تو اس کی ڈھیلی پتلون اس تیز چلنے سے اترنے لگی تو اسے اپنے ننھے ہاتھوں سے سنبھال کر وہ ماں کی طرف دوڑتا رہا۔ پتلون اس کے ہاتھوں سے پھسل کر اس کے پیروں میں زنجیر بن گئی تو دوڑنا اس کے لئے محال ہو گیا۔ لیکن اس نے پھر دوڑنے کی کوشش کی تو دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ اس مرتبہ وہ رو دیا اور اپنی ماں کو مخاطب کیا "امی میں گر پڑا"۔

ماں کو پکارنے کے بعد معصوم بچے نے اپنی مقدور بھر توانائی اور ارادے سے کام لیتے ہوئے فٹ پاتھ پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ تصدق رسول چلتے ہوئے بچے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے تیز تیز چلتے ماں کو پکارنے اس کے ساتھ ساتھ اپنی ڈھیلی پتلون کو سنبھالنے پر تصدق رسول کو بڑا ترس آیا۔ بچے کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر اسے اس کی ماں کے قریب کر دے۔ لیکن معاً اسے پھر اپنی اجنبیت کا خیال آیا کہ کہیں بچے کو اٹھانا اس کی ماں پسند نہ کرے۔ یا بچے کو اٹھانے کو کوئی دوسرے معنی پہنائے ذہن میں ان اندیشوں کے آتے ہی وہ رک گیا۔ لیکن چلتے ہوئے بچے کو دیکھتا ضرور رہا اور اس کے دکھ کو محسوس کرتا رہا۔ اپنی مجبوری کا خیال کر کے پھر اسے خیال آیا کہ ان اندیشوں نے تو اس وقت کسی کام کا نہ رکھا۔ سوائے بچے کے دکھ محسوس کرنے کے۔ لیکن جب اس کی نظروں کے سامنے بچہ گر پڑا تو اس کی بے بسی کو محسوس کر کے تصدق رسول نے اپنے خوف اور اندیشے کو دھول کی طرح جھاڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سامان سے بھرے ہوئے تھیلوں کو فٹ پاتھ پر رکھ کر جلدی سے گرے ہوئے بچے کی طرف بڑھا تاکہ اسے اٹھا کر اسے اس کی ماں کے پاس لے جائے۔

ویسے تصدق رسول خود ایک نرم دل آدمی تھا لیکن روزہ داری کے احساس نے اس کی طبیعت کی اس نرمی میں ایک طرح کی ممتا پیدا کر دی تھی اسے اس کام سے خود اندازہ ہوا وہ آدمی کے دکھوں کے کتنے قریب آچکا تھا۔ فٹ پاتھ پر تھیلے رکھ کر جب وہ بچے کے پاس

آیا تو بچہ رونے لگا۔ تصدق رسول نے بچے کو اپنے کلیجے سے لگاکر اس کے سر کو کبھی اس کی پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے بچے کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔

بچے کی معصوم نیلی نیلی آنسوؤں بھری آنکھوں میں اس انسانی سہارے کو محسوس کرتے ہی ہنسی اور خوشی دونوں ہی جھلک آئے تصدق رسول نے جب بچے کی خوشی سے روشن آنکھوں کو دیکھا تو رخساروں سے اس کے آنسو پونچھے اس کے بعد اس کے کپڑوں کی دھول جھاڑی۔ اس کی پتلون ٹھیک کی اور بچے کو ہنستے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگا۔ بچہ ٹکٹکی باندھ کر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ تصدق رسول نے پھر اسے چمکارا تو ہنسی اور خوشی اب اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی اور جو تھوڑا بہت اجنبیت کا پیدا کردہ خوف بچے میں رہ گیا تھا اس چہرے پر آئی ہوئی خوشی اور ہنسی نے اسے بھی صاف کردیا۔ اب بچے میں اجنبیت اور خوف کے بجائے ایقان اور اعتماد تھا۔ چند لمحوں تک خاموشی میں دونوں اجنبی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اس لمحہ کسی نے کسی سے کچھ نہ کہا ان دونوں کو قریب دیکھ کر بچے کی ماں بھی ان کے قریب آگئی اور بچے کو اپنے قریب کرلیا اور دھول کے دھبے جو آنسوؤں میں مل کر بچے کے چہرے پر جم کر رہ گئے تھے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں اپنا تھوک لے کر بچے کے چہرے سے ان کو صاف کیا اس کے بعد جو رومال اس کی آستین میں اڑسا ہوا تھا اسے نکال کر اس کے چہرے کو صاف کیا۔ ڈھیلی پتلون پھسل کر پھر پیروں میں الجھ گئی تھی اسے اٹھاکر اسے ٹھیک سے پہنائی۔ تصدق رسول وہیں کھڑا بچے اور ماں کو دیکھتا رہا۔ ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جب بچے کی چھنگلی پکڑ کر وہ اسے Pram کی طرف لے جانے لگی تو ماں نے اس کا شکریہ ادا کرنا تو درکنار اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ لیکن تصدق رسول وہیں کھڑا اپنے اس ننھے دوست کو دیکھتا رہا۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ جارہا تھا۔ سورج اب آسمان پر پھر چمکنے لگا تھا۔ جب دونوں گلی کے موڑ پر آئے تو بچے نے اپنے نئے دوست کو اپنے ننھے ہاتھ کی مٹھی سے الوداع (بائی بائی) کہا دھوپ نے معصوم بچے کی مسکراہٹ کو اور چمکا دیا۔ تصدق رسول نے اس اجالے میں اپنے ننھے دوست کی خوشی کو محسوس کرکے بالکل اسی کی طرح اپنے دائیں ہاتھ (سیدھے ہاتھ) کو مٹھی کی طرح بھینچ کر اس کے آخری سلام کا جواب دیا اور انہیں جاتے

ہوئے دیکھتا رہا۔ دھوپ اب اور کھل گئی۔ ہوا بھی خوشگوار ہوکر آہستہ آہستہ چلنے لگی جب کونسل کے اونچے اونچے فلک شگاف ٹاوروں نے اس کے دوست کو چھپالیا تو تصدق رسول نے بھی اپنے دونوں تھیلے فٹ پاتھ پر سے اٹھائے اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس دن تصدق رسول روزہ افطار کرنے کے بعد اپنے باورچی خانے میں بیٹھا تو کسی چیز کو کھانے سے پہلے اپنے ننھے دوست کی خوشی کی ضرورت محسوس کی۔ وہ بلانے پر اس کے پاس آگئی تو پھر اس نے اپنا روزہ افطار کیا۔ معصوم بچہ اسی طرح اس کے تصور میں ہنستا رہا۔ تصدق رسول بھی اس کے متعلق سوچتا رہا۔ میں ایسے بچوں کے لئے کیا کروں؟

اس دن کا روزہ تصدق رسول کو مہینوں یاد رہا۔ کبھی کبھی وہ اس دن کو یاد کرکے زندہ رہنے کا سہارا تلاش کرلیتا۔

ذرا دل کو جگا لوں تو چلوں

یہ مصنف یا کسی دوسرے فرد کی زندگی کی نہیں بلکہ اس پوری نسل کی داستان ہے جو بہتر معیار زندگی اور عیش و عشرت کے لئے اس سونے چاندی کے دیس میں آئے۔ سونے چاندی کی تلاش میں اس راہ گزر سے گزرتے ہوئے بہت سوں نے جان دیدی اور جنہوں نے اپنی منزل پالی وہ سونا چاندی پاکر خود پتھر کے بن گئے۔ وہ سکون، خوشی، مسرت اور لذت احساس سے محروم ہوگئے۔

تین ہفتوں سے وہ ایک کمرہ تلاش کر رہا تھا۔ ویسے قانون کے پاس ہو جانے کے بعد اب لوگ کمرے کے اشتہار میں صرف یورپین یا رنگدار آدمی نہیں لکھتے تھے البتہ اس تعصب نے دوسرا ذریعہ اظہار اختیار کرلیا تھا۔

فون پر ایک رنگدار آدمی کی آواز ہی سے اس کا رنگ اور طبقہ لینڈ لیڈی کے ذہن میں بجلی کی طرح روشن ہو جاتا اور اس فون کے جواب میں نہایت دل آویز آواز میں جواب آتا۔ "افسوس کمرہ بھر گیا"۔

ان تین ہفتوں میں اس نے کافی Six pence کے سکے خرچ کرڈالے لیکن ہر مرتبہ فون پر بڑے دلربا انداز میں یہی افسوس والا جواب ملا۔ آخر چوتھے ہفتے اسے فون پر جواب

ملا کہ کمرہ خالی ہے۔ اس اطلاع سے اسے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ پہلے مکان سے دیئے گئے نوٹس کا یہ آخری ہفتہ تھا۔ وہ اسی رات کو کمرہ دیکھنے گیا۔ لینڈ لیڈی کے گھر پر آکر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا' اس نے دروازہ کھولا۔ "میں نے ابھی ابھی آپ کو کمرے کے لئے فون کیا تھا۔" اس نے نہایت مودبانہ مشرقی انکساری کے انداز میں لینڈ لیڈی کو مخاطب کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" لینڈ لیڈی نے جواب دے کر اس کا ایک گہری نظر سے جائزہ لیا اور اسے اپنے گھر کے اندر نہ بلایا بلکہ خود اپنے گھر سے باہر آکر مخاطب ہوئی۔ "دو ہفتوں کا کرایہ ایڈوانس"۔

"کتنا میڈم؟"۔

"دس پونڈ"۔

دو ہفتوں کے ایڈوانس کرائے کی شرط سن کر وہ ذرا سوچ میں پڑ گیا' کیونکہ اس دن اسے گھر سے بھی خط ملا تھا کہ اس کی ایک بیٹی بیمار ہے۔ دوسری کے امتحان' ادھر بیٹا تھا کہ روز روز گھر کی مصیبتوں سے تنگ آکر لکھنا پڑھنا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ وہ اس ہفتے اپنی ساری تنخواہ اور باقی کچھ اثاثہ گھر بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن اس دو ہفتوں کے ایڈوانس کے مطالبے نے اسے پھر مایوس کردیا۔ اور فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ اپنے ذہن کی لاجوابی سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور اسی بدحواسی میں اس نے پوچھا۔

"پانچ پونڈ سے کم نہیں؟"۔

"نہیں جلدی کرو۔ مجھے کچھ اور بھی کرنا ہے۔" لینڈ لیڈی نے جواب دیا اس وقت اس کے چہرے پر سپاٹ پن اور اس ہوشیاری کے علاوہ کچھ نہ تھا جو اس نے اس کا جائزہ لینے کے بعد حاصل کی تھی۔

"پانچ پونڈ۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پتھرائی نظروں کے ساتھ لینڈ لیڈی کے جملے کو دہرایا۔ "میڈم! کچھ کم کردو میرے بچے ہیں"۔

"ہمارے بھی تو بچے ہیں اور تم دیکھتے نہیں ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ ریٹ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔" اس مرتبہ لینڈ لیڈی بالکل ناامید اور بیزار ہوکر اپنے گھر کے اندر جانے لگی۔ تو اس نے ذرا مری ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا! میں جمعہ کے روز آؤں گا"۔

"تو تمہیں یہ کرایہ منظور ہے؟"۔

"ہاں میڈم مجھے منظور ہے"۔

"تو لاؤ ایڈوانس"۔

"میں جمعہ کے روز آکر دے جاؤں گا"۔

"نہیں ابھی کچھ دو"۔

"اس وقت تو میرے پاس پونڈ نہیں ہیں"۔

"تو کیا ہے؟"۔

اس نے اپنی جیب سے لینڈ لیڈی کے سامنے پرس نکالا۔ اس کے پرس میں ایک پونڈ ۴ شلنگ ۳ پنس تھے۔ "دس شلنگ دیدوں؟" اس نے رقم کا جائزہ لینے کے بعد لینڈ لیڈی سے کہا۔

"نہیں ایک پونڈ"۔

"میرے پاس خرچ کے لئے کچھ نہ رہے گا"۔

"اس سے مجھے کچھ مطلب نہیں، میں اس سے کم ایڈوانس نہیں لے سکتی"۔

اس نے اپنے پرس میں سے ایک پونڈ نکال کر اس کی تہوں کو کھولا اسے سیدھا کرکے لینڈ لیڈی کو دیتے ہوئے پھر پوچھا۔

"کس وقت جمعہ کے روز؟"۔

"۷ بجے سے پہلے آنا"۔

"بہت اچھا میڈم، شکریہ"۔

جہاں وہ رہتا تھا وہ بھی لندن کا غلیظ ترین بوسیدہ علاقہ تھا۔ اس کے مکان کے اردگرد بہت سی عمارتیں ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں ذرا فاصلے پر کونسل کے کشادہ فلیٹ تھے خود اس کا مکان بڑا بوسیدہ تھا۔ رطوبت تو ہر وقت یہاں رہا کرتی۔ جب کبھی ہوا زور سے چلتی تو کھڑکیوں کے پٹ رات بھر ملکر تاشوں کی طرح بجا کرتے۔ اس مکان کے جس کمرے میں رہتا تھا، اس کی پشت پر ریل کا گزر ہر وقت رہا کرتا۔ یہاں کسی رات وہ آرام کی نیند نہ سویا۔ اس علاقے پر ایک اداسی برسا کرتی۔ اسی لئے مکان کے مل جانے کے احساس نے

اس کے دل کو پھر ہلکا اور پر امید کر دیا۔ جمعہ کے دن فیکٹری سے آتے ہی وہ سیدھا نئی لینڈ لیڈی کے گھر پہنچا' گھنٹی بجائی۔

لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولنے سے پہلے کواڑ میں جو سوراخ تھا اس میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور دروازہ کھول کر اسے گھر کے اندر بلایا۔ اندر سے گھر کتنا صاف' دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ گلدان میں تازہ پھول رکھے ہوئے تھے' دائیں طرف ایک آئینہ' ایرانی سرخ دبیز قالین' گھر کو دیکھ کر اس نے لینڈ لیڈی کے ذوق کی داد دی اور سوچا اب مجھے بھی ایک اچھے گھر میں رہنے کا موقعہ مل رہا ہے۔ لینڈ لیڈی خاموش نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اس کی نگاہیں لینڈ لیڈی کی نگاہوں سے ملیں تو ان نگاہوں کو دیکھتے ہی اس نے اپنی جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے پانچ پانچ کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ لینڈی لیڈی نوٹ لے کر اپنے کمرے میں گئی تو پھر اسے یاد آیا کتنے عرصے سے ایک اچھے گھر میں رہنے کی خواہش میرے ساتھ تھی۔ لینڈ لیڈی اتنے میں کمرے سے چابیوں کا گچھا لائی اور اس گچھے میں سے اس کے مکان کی چابی تلاش کرنے لگی وہ اسے مل گئی لیکن گچھے سے چابی نکالنا اس کے لئے مشکل تھا تو وہ خود آگے بڑھا۔ لینڈ لیڈی نے اس کے گھر کی چابی کی نشاندہی کی۔ اس نے اسے نکال کر گچھا پھر لینڈ لیڈی کی جانب بڑھایا جسے اس نے اس کے ہاتھ سے لے لیا لیکن شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ کلیم نے اس غیر شائستگی کو محسوس کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر مکان نمبر' گلی کا نام لکھ کر اسے دے کر گھر کا دروازہ بند کرنے کے لئے دروازے پر آئی تو گھر سے نکلتے ہوئے کلیم نے اس سے کرائے کی کتاب کا مطالبہ کیا اسے سن کر لینڈ لیڈی نے پھر غصے اور درشتی سے کہا۔ "ہم کسی کرائے دار کو رینٹ بک نہیں دیتے اور ہر ہفتے تم کرایہ دینے ہمارے گھر پر آؤ گے۔" لینڈ لیڈی کے رویئے نے کلیم کو پھر خوفزدہ کر دیا اور اس نے سوچا کہ کہیں یہ مکان بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے اس خیال نے کلیم کے رویئے میں کافی نرمی اور مصلحت کوشی پیدا کر دی' جیسے ہی وہ مکان سے نکلا لینڈ لیڈی نے گھر کا دروازہ بند کر دیا تو اس نے پھر گھر کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد جیب میں غیر اختیاری طور پر ہاتھ گیا تو چابی کو اس کے ہاتھ نے چھوا' وہ خوش ہو گیا۔ نئے مکان میں رہنے کی خوشی میں اسے ماضی کی بیزاری بھی یاد آئی کہ جسم و روح کو تھکا دینے والا غیر دلچسپ کام غلیظ گھروں

اور علاقوں میں رہنے سے پستی اور بیزاری کس طرح اس کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا نفسیاتی اثر اس پر یہ ہوا کہ وہ اپنی اس حالت کی موجودگی میں وہ اپنے جاننے والوں سے کتراتا' بیزاری اکثر و بیشتر اس کے اندر چکر لگاتی رہتی۔ لیکن جب اسے نئے مکان کا خیال آتا تو اپنے تصور میں اس مکان کے اندر بچوں کی طرح رنگ بھرنے لگتا۔ سارے راستے وہ اپنے مکان کے متعلق سوچتا رہا کہ وہ بھی لینڈ لیڈی کے مکان کی طرح صاف ستھرا اور کشادہ ہوگا کھڑکی کے پردے بھی ایسے ہی دیدہ زیب جیسے لینڈ لیڈی کے مکان کے' سارے مکان میں قالین بھی اسی طرح کا' اپنے کمرے میں بیٹھ کر وہ اپنے کمرے کے ہیٹر کی ہلکی ہلکی تپش سے لطف اندوز ہوگا۔ لندن میں انگریزوں کے گھروں میں جو آتش دان ہوتا ہے' اس سے تو اسے عشق سا تھا' گھر کا اندھیرا اس میں آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی ہلکی ہلکی روشنی' کتنی رومان انگیز۔ جاڑے کی سرد راتوں میں کچھ وقت اس آتش دان کے قریب بیٹھ کر تھوڑی سی خوشی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پرانے انگریزی ناولوں نے اس کی اس آرزو میں اور کیف بھر دیا تھا۔ جب وہ گلی کے ایک نکڑ پر آیا تو اس نے مکانوں کے نمبر دیکھنا شروع کر دیئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا چاروں طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ جب اسے زیادہ سردی محسوس ہوئی تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں ڈال کر سر کو نہوڑا کرکے کوٹ کے کالروں میں چھپالیا۔ کبھی کبھی کوئی آدمی بھی اسے وہاں گزرتا ہوا نظر آجاتا لیکن وہ ذرا فاصلے پر ہوتا۔ آخر تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی اس کے قریب سے گزرا تو اس نے اپنے پاکستانی لہجے کی انگریزی میں اس گلی اور مکان کا نمبر پوچھا۔ بوڑھا آدمی اس کے لہجے اور تلفظ سے اس کا مدعا نہ سمجھ پایا تو اس نے پھر اپنی جیب سے لینڈ لیڈی کا لکھا ہوا پرچہ دیکھا اور پھر اسے انگریزی میں دہرایا' بوڑھا اس کا پرچہ لے کر ذرا بجلی کی روشنی میں آیا (جو ایک قریب کے مکان سے چھن چھن کر آرہی تھی) اور جیب سے اپنا چشمہ نکال کر اس پتے کو بڑی توجہ سے پڑھنے لگا جب تحریر اس کی سمجھ میں آسانی سے آگئی تو اس نے پرچہ اس کے ہاتھ میں دے کر اپنا چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔

''دوسرے موڑ پر دائیں طرف''۔

اس نے اس بوڑھے انگریز کا شکریہ ادا کیا اور پتے کا پرچہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر

سیدھا اس طرف چل دیا۔ اب سردی اسے زور کی لگنے لگی لیکن اس وقت اس نے اسے سوائے محسوس کرنے کے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور جب وہ اس نکڑ پر پہنچا تو سڑک کے کنارے لگے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اس نے خود مکان کا نمبر پڑھا جس طرف وہ کھڑا تھا اس طرف O.D نمبر تھے۔ جسے وہ اب سمجھ چکا تھا۔ اس لئے اب اس نے دوسری طرف چلنا شروع کیا۔ اسے پھر اس مکان کا دروازہ کھلا ہوا ملا تو اس نے پھر اس گھر کی بجلی کی روشنی میں مطلوبہ مکان کا نمبر پڑھا اور پھر اس مکان کو دیکھا۔ مکان کا نمبر دروازے کے اوپر تھا اس نے اسے پڑھا یہی مکان اسے مطلوب تھا۔ نمبر کی تصدیق کے بعد اس نے پھر مکان اور اس کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھلا ہوا دروازہ تو وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ لیکن مکان کے سامنے جو تھوڑی سی زمین تھی (جو لندن میں باغیچوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے) وہاں کچھ خودرو سوکھی ہوئی گھاس' ایک کٹے ہوئے درخت کا ٹنڈھ' کچھ گندے کاغذ' ٹوٹے پھوٹے گندے ڈسٹ بن اس کے گرد پڑا ہوا کوڑا کرکٹ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اور گھر میں داخل ہونے سے پہلے جو چھوٹا سا لوہے کا پھاٹک ہوتا ہے وہ ٹوٹا ہوا مکان کے سامنے جو منڈیر تھی اس پر رکھا ہوا تھا۔ اس ماحول کو دیکھ کر پھر اس کا دل ڈوبنے لگا اور اپنے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے سردی بھی محسوس کی۔ اب وہ سردی میں کانپنے لگا لیکن اسی حالت میں اس نے اس کے دروازے کی کنڈی بجائی۔ لیکن کوئی آدمی باہر نہ آیا۔

پھر اس نے چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی نہ تھا البتہ چند کمروں میں سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آوازیں آرہی تھیں تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ذرا زور سے دروازے کی کنڈی بجائی تو اوپر سے ایک سانولے رنگ کی جوان عورت اپنے کمرے سے باہر نکل کر نیچے آئی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں کسی کا انتظار چمک رہا تھا لیکن اس شوق اور امید سے باہر آنے کے بعد اس نے اپنے ہم رنگ آدمی کو دیکھا اور اسی کے ساتھ بیزاری بھی چھا گئی۔

"کیا چاہیئے؟" اس جوان عورت نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"لینڈ لیڈی..."۔

"ہاں۔ لیکن وہ یہاں نہیں رہتی"۔

"ہاں مجھے یہ معلوم ہے' میں یہاں رہنے آیا ہوں مجھے کمرہ نمبر۸ بتادوگی۔" اس کے

رنگ کو دیکھ کر اس نے اس سے اردو میں پوچھا۔

اس نے اوپر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انگریزی میں جواب دیا۔ "اوپر دائیں طرف"۔

اس نے اس جوان عورت کی بدتمیزی اور بے تکلفی کو بھی محسوس کیا لیکن جس حلیے میں اس نے اسے دیکھا اس سے اس میں ایک قسم کی حقارت محسوس کی۔ جس نے فوری طور پر اس کی بدتمیزی اور بے تکلفی کے دکھ کو اس کے اندر سے دور کردیا۔ وہ اوپر آیا اور دائیں طرف مڑ کر اس کمرے کو کھولا۔ اسے دیکھنے کے لئے بتی جلائی تو یہ کمرہ بھی قبر کی طرح لمبا تھا۔ ایک پرانا سنگل بیڈ' ایک پرانا صوفہ کونے میں ایک ٹیبل پر رکھا ہوا گیس رنگ اس کے گرد گندگی کا ایک دائرہ کمرے کے فرش پر ایک چھوٹا سا قالین کا ٹکڑا جو گندگی میں اپنا اصل رنگ بھی کھو چکا تھا۔ اس دھیمی بجلی کی روشنی میں اس نے آنکھیں پھاڑ کر پھر کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے کا طول و عرض 12X9 سے کچھ زیادہ نہ تھا اور چھت پر جالے' اس کمرے کے ماحول نے اسے پھر جذباتی اور ذہنی طور پر تھکا کر رکھ دیا اور اس وقت اس نے آرام کی شدید ضرورت محسوس کی وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا تو اس کا گدا بھی پتھر کی طرح سخت اور درمیان میں گڑھے۔ سرہانے دو گندے بلاغلاف تکئے' دو فوجی پرانے کمبل جس میں جگہ جگہ سوراخ اور ان پر ایک تھپی ہوئی مہین چادر جس پر گہرے سرخ رنگ کے گلاب کے پھول۔ اب فکر پھر بغیر ارادے کے اس کے وجود پر بخار کی طرح چڑھنے لگی اس نے پھر چاروں طرف کمرے کی تنگی اور میلی دیوار کو دیکھا تو اس کی آنکھوں اور دل میں اندھیرا اور گہرا ہوگیا۔ گھر میں گھستے ہی اسے جو ٹیلی فون نظر آیا تو اسے قدرے اطمینان ہوا تھا لیکن اب اس کی بھی خوشی کب تھی آج کون تھا جو اسے یہاں فون کرتا یا وہ کسی کے فون کا انتظار کرتا اور اگر وہ کسی کو جانتا بھی تھا تو اس گھر میں اسے کیسے بلاتا۔ دل و نظر کے اندھیرے سے گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور دروازہ بند کرکے پھر نیچے جانے لگا تو ٹیلی فون کے پاس ایک ٹوٹا اور گندا صوفہ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس پر چند ٹیلی فون کی ڈائریاں۔ اب وہ بڑا زود حس بن گیا تھا اس لئے ہر چیز اسے اپنی طرف متوجہ کرتی' گندے صوفے پر پڑی ہوئی ڈائریوں پر سے گزرتی ہوئی سیڑھیوں پر پڑی تو وہ بھی تنگی اور جب وہ اس پر سے گزرتا تو سیڑھیوں کی چوں چوں کی آواز بھی اس

کے ذہن پر ضرب کی طرح پڑتی گھر سے نکلتے ہوئے فرش کی گندگی نے بھی اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور غیر شعوری طور پر اس نے جب دروازہ بند کیا تو دیواروں کا اکھڑا ہوا کاغذ چھت پر مکڑی کے جالے' کہیں برسات کے پانی کے دیئے ہوئے دھبے بھی' اسے اس گھر میں منہ چڑھاتے ہوئے محسوس ہوئے۔

اس گھر سے جلدی سے نکل کر وہ باہر سڑک پر آگیا۔ سردی اب بھی تھی لیکن کھلا ہوا ماحول اور تازہ ہوا نے تھوڑی دیر کے لئے اسے پھر زندہ کردیا۔ بس اندھیرے ماحول میں اوپر اٹھنے کی کوشش میں اس نے پانچ سال صرف کردیئے تھے لیکن اس کے رنگ نے یہاں اس کا مقام اور مقدر متعین کردیا تھا سوائے اس دائرے میں کولہو کے ایک بیل کی طرح گھومنے کے وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ سوسائٹی میں اس کا کام اور مقام متعین تھا وہ خود ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا لیکن اس غریبی نے اس کا ایک بڑا کام اس کی زندگی میں ضرور کیا اور وہ تھا جدوجہد اور اللہ پر توکل۔ یہ دونوں چیزیں اس کی تربیت میں گھل مل گئی تھیں۔ اسی تربیت نے اس میں لچک اور لگن دونوں کوٹ کوٹ کر بھردی تھیں انہی صفات کے سہارے زندگی میں وہ کامیاب بھی ہوا لیکن لندن کا ماحول اس کے نزدیک ایک ریگستان بن گیا تھا۔ جس میں ۵ سال سے برابر چلتا جارہا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے لیکن اگر اسے معلوم بھی ہوتا تو کیا وہ اس برف کے ریگستان میں اسے پا بھی سکتا تھا۔

لندن قسمت آزمانے کی تمنا کی خاطر اس نے اپنی ہندوستان میں چھوڑی ہوئی زمین کا کلیم اور کچھ گھر کا اثاثہ بیچ کر یہاں آنے کا ٹکٹ خریدا اور جس وقت وہ گھر سے چلنے لگا اس کے گھر میں صرف ۳ روز کا راشن کا آٹا اور بیوی کے پاس ۸ روپے باقی تھے۔ رہا راشن والے اور دوسرے دکانداروں کا حساب اس نے ان کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے صرف دو مہینے کی مہلت طلب کی تھی وہ لندن آرہا تھا اس لئے دکانداروں نے اس پر زیادہ زور نہ ڈالا۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ یوپی کے ایک دیہات میں بڑھا پلا اس ماحول سے اسے جو چیزیں اس کے اندر مضبوط ہوئیں ان میں آزادی' سادگی اور وسعت کا شدید احساس تھا۔ حد نظر تک اس کے سامنے لہلہاتے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے نظر آتے' ان کے بیچ میں

کھڑے ہو کر وہ آسمان پر شفق کی جھالر میں الجھ جاتا اور اس وقت اسے دنیا اور مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ صرف اس کیفیت میں ڈوب کر وہ ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا۔ اسی ماحول میں کہیں کہیں کسی کسان کی جھونپڑی۔ کہیں پکا مکان ایک شاہی مسجد اس کے اردگرد پیڑوں کے بکھرے ہوئے پتے بھی کبھی کبھی اس کے دل اور روح کو چھو لیتے لیکن اس عمر اور اس ماحول میں وہ صرف چیزیں تھیں۔ اس وقت کبھی اس نے کسی چیز کو معنی نہیں پہنائے لیکن یہ ساری چیزیں اس کے اندر پیوست ضرور ہو گئیں۔ دیہات سے وہ شہر میں آگئے جب ہندوستان تقسیم ہوا تو اس کے بعد بوڑھے باپ کو فسادات میں برچھوں سے شہید کردیا گیا اس وقت وہ خود انڈین سول سروس میں ایک نوعمر کلرک تھا لیکن باپ کی شہادت کے بعد ایک بھائی ایک بہن کا بوجھ اس پر اور آپڑا تھا لوگ کہتے ہیں کہ ان ذمہ داریوں نے اسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا بنا دیا تھا لیکن اس کے ملنے جلنے والے اور اس کے اپنے عزیزواقارب اس کی برطانوی حکومت کی ملازمت کو بڑی حسرت سے دیکھتے تو یہ احساس اسے تھوڑا سا ذاتی مزا دے جاتا لیکن وہ بھی کبھی کبھی۔

جب اپنے بھائی کو علی گڑھ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرا چکا تو خود پاکستان چلا آیا اور تھوڑے عرصہ کے بعد اپنے خاندان کو بھی پاکستان بلالیا۔ یہاں آکر جب اس نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اس کی ملازمت کو کل تک حسرت سے دیکھا کرتے تھے آج پاکستان میں اپنے مرتبے کی وجہ سے اس کے لئے حسرت بن گئے جسے وہ برداشت نہ کرسکا لندن روانگی میں اس احساس کو بھی بڑا دخل تھا۔

لیکن ان دنوں اس ماضی کو یاد کرکے بھی وہ کیا کرتا۔

ہفتے کی صبح اس نے اپنا سامان اس نئے مکان میں منتقل کرنا شروع کیا ایک پرانا ٹیلی ویژن جو اس نے جنبل سیل سے خریدا تھا چاول کی ایک بوری دو بکسے اور کچھ کھانے پینے کا سامان بس یہ اس کی کل کائنات تھی۔

۱۲ بجے دن سے پہلے اسے اپنے پرانے کمرے کو خالی کردینا تھا۔ سب سے پہلے وہ اپنے دونوں بکسوں کو اٹھا کر پرانے مکان سے باہر آیا تو راستے میں Milk Man کی اس پر نظر پڑی تو اپنا ہاتھ روک کر وہ اسے دیکھتا رہا کہ یہ کدھر جارہا ہے جب وہ اس کے

قریب آیا اور ملک مین کی مشتبہ آنکھوں سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو ملک مین مسکرایا۔ لیکن شبہ اور سوال اب بھی اس کی آنکھوں میں تھا اس نے دودھ والے کی آنکھوں کو پڑھ کر اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے تو دے دیا لیکن اس کی آنکھوں کے سوال اور شبہ کو وہ سمجھ گیا کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے؟

"کہاں جا رہے ہو؟"۔

"کیا میرا پتہ معلوم کرنا چاہتے ہو۔ مجھ پر کسی کا ایک پیسہ نہیں؟"۔

"نہیں میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں کدھر جا رہے ہو۔ بتاؤ سامان میری گاڑی میں رکھ دو"۔

"نہیں شکریہ ویسے میں اپنا پتہ تمہیں ضرور بتائے دیتا ہوں"۔

دودھ والا خاموش ہوگیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے نئے مکان کی طرف چلنے لگا۔ دودھ والے نے تھوڑی دیر تو اس کا نظروں سے تعاقب کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ گلی کے آخری سرے پر ایک بوڑھی عورت اور ملی تو مسکرا کر اس نے بھی پوچھا۔

"کیا مکان تبدیل کیا ہے؟"۔

"ہاں"۔

"کیا اچھا مل گیا؟"۔

"اگلی گلی میں مکان نمبر ۱۰۷۔" اس مکان کا نام سن کر بوڑھی عورت ذرا ہنس پڑی اور کہا۔

"ہاں اس گلی میں وہ بڑا مشہور مکان ہے۔ تمہارے کسی جاننے والے کو اسے معلوم کرنے میں یہاں کوئی دقت نہ ہوگی"۔

اس جواب سے اس نے ایک چوٹ سی محسوس کی جیسے اسے کسی نے بھرے بازار میں ننگا کردیا ہو۔ وہ چلتے ہوئے سوچتا رہا کہ محض رنگ کی وجہ سے اس شہر میں ایسا کوئی مکان نہ مل سکا جو اس قابل ہو کہ اس کے تعلق سے تھوڑی بہت عزت مل سکے۔ دل میں اس وقت اس کے دکھ تھا، لیکن چلتے ہوئے اسے غصہ بھی آرہا تھا اور رہ رہ کر اسے خیال آرہا تھا۔ اس ملک میں وہ ایمانداری سے رہتا ہے سخت محنت کرتا ہے رہنے کے لئے

بڑے سے بڑا کرایہ دیتا ہے لیکن میرے رنگ کی وجہ سے یہ آبروریزی اور گندگی ہی میرے حصے میں آتی ہے اور جب لوگ اس گندگی کو دیکھتے ہیں تو پھر مذاق اڑاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ آخری مرتبہ وہ چاول کی بوری پیٹھ پر رکھ کر لایا تو کئی راہ چلتی ہوئی عورتوں نے اسے دیکھا تو ان کی ہنسی نہ رک سکی۔ اس نے اس چوٹ کو بھی محسوس کر کے برداشت کیا۔

گھر کا سارا سامان ڈھو کر وہ ایک زخمی کی طرح بستر پر گر پڑا اور آنکھیں بند کر کے اپنے خیالوں میں الجھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پیاس محسوس ہوئی۔ وہ اٹھا' لینڈ لیڈی کا دیا ہوا ٹوٹا ہوا کپ لے کر وہ غسل خانے میں آیا تو وہاں اس کا ایک پڑوسی جو برتن دھو رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر اس سے ہیلو کہا۔

"ہیلو۔" برتن دھونے والے پڑوسی نے اسے جواب تو دے دیا لیکن جواب دیتے ہوئے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ "مجھے تھوڑا سا پانی چاہیئے"۔

"ہاں لے لو۔ اس کا پڑوسی ذرا سرک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے غسل خانے کے نل سے کپ میں پانی بھرا اور کمرے میں آ کر اپنا دروازہ بند کر لیا صوفے پر بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیا۔ اس ٹھنڈے پانی سے جہاں اس کی پیاس بجھی وہاں تھوڑی سی دل کی کدورت بھی دور ہو گئی۔

اس وقت وہ بڑی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اس نے پھر اپنے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اس پر پردہ ہوا سے جھوم رہا تھا اور باہر کے روشن دان کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پورا پٹ کھول کر پردے کو ایک طرف ٹانک دیا تاکہ دن کے اجالے سے اس کا سارا کمرہ روشن ہو جائے اور اس کے بعد پھر کھڑکی میں سے جھانک کر باہر کی دنیا کو دیکھتا رہا اس نظارے نے اس میں سونے کی آمادگی پیدا کی اور وہ بستر کو قرینے سے لگائے بغیر سو گیا۔

شام کو اس کی بڑی دیر میں آنکھ کھلی تو اسے بڑا ملال رہا کہ آج وہ حلال گوشت نہ لا سکا لیکن اسے پھر اپنے چاول کی بوری اور مسور کی دال یاد آئی۔ بوری میں سے اسی ٹوٹے ہوئے کپ سے چاول نکالے اور پلیٹ میں ڈال کر اسے پھر دھونے کے لئے غسل

خانے میں آیا کیونکہ اس کے کمرے میں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس مرتبہ غسل خانے میں گھستے ہی اسے ایک ۔ بھپکا سا لگا وہاں ذرا گرمی اور بڑی گندگی تھی ابھی ابھی اس کا کوئی پڑوسی غسل سے فارغ ہو کر گیا تھا۔ ٹب میں ابھی تک بدن کا میل اور بال لگے ہوئے تھے گرم پانی کی بھاپ اور گندگی کی غلاظت سے تو اس کا دم گھٹنے لگا اور اس نے غسل خانے کی کھڑکی کو کھولنا چاہا لیکن وہ بھی ٹوٹی ہوئی تھی اس لئے اس نے فرش پر سے ایک اینٹ اٹھا کر اس کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی۔ تو کھڑکی کھلی باہر سے تازہ ہوا آئی اس نے جلدی سے تین مرتبہ چاول دھوئے اس میں پانی بھرا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔

دال اور چاول تیار کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ جتنی جلدی وہ تیار ہوا اتنی ہی جلدی اس نے اسے کھایا اور اپنے کمرے سے باہر نکل کر سڑک پر آگیا۔ ہفتے کی رات تھی خود اس کے گھر سے اور قریب کے دوسرے گھروں سے قہقہوں اور موسیقی کی آوازیں' چمکتی ہوئی کاروں کا ادھر سے ادھر گزرنا' اپنے گھر کے قریب فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا.... اور یہ ماحول پہلے ماحول سے بہتر نظر آیا۔ یہاں زندگی تو ہے ہر وقت ریل کی گڑگڑاہٹ تو نہیں اس کے دل نے پھر تھوڑا سہارا ڈھونڈ لیا۔ اور اس چہل پہل نے فاصلے کے باوجود اسے اس وقت خوش کر دیا اور وہ خود کافی پینے کے لئے ایک قریب کے ریستوران میں چلا گیا جو اس نے راستے میں دیکھا تھا اور جہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ریستوران میں وہ بڑی رات تک بیٹھا رہا وہاں اسے کچھ جاننے والے بھی مل گئے ان سے بھی تھوڑا بہت ہنسی مذاق رہا۔ انہوں نے نئی ہندوستانی فلم دیکھنے کے لئے کہا اس نے اس کی حامی بھرلی۔

اور اس ہفتے کی رات کو جب وہ گھر پہنچا تو اس کا موڈ بڑا اچھا تھا اور اتوار کے دن خوب سونے کا احساس اس کے ساتھ تھا۔ کہ اس دن وہ جی بھر کر سوئے گا۔ سونے سے اسے بڑا پیار تھا فیکٹری سے اسے جب کبھی چھٹیاں ملتیں وہ زیادہ وقت سونے میں گزارتا لیکن کام کے دوران اگر اسے نیند آنے لگتی تو اپنے اس احساس سے وہ گھنٹوں جنگ کرتا اور خود کو محنت میں ڈبو کر اپنے اعصاب کو تھکا ڈالتا اور اس وقت دم لیتا جب نیند کا شائبہ تک اس کے جسم کے کسی حصے پر نہ رہتا۔ لیکن اس رات سونے کا مزا پھر اس کے اندر ابھر آیا تھا۔ گھر آتے ہی اس نے پہلے کمرہ گرم کیا۔ اپنے بستر میں سے بوتل نکال کر گرم

پانی بھرنے کے لئے پانی لینے غسل خانے میں گیا اور پانی کو گرم کرنے کے لئے کیتلی چولہے پر چڑھا کر رفع حاجت کے لئے پیخانے میں گیا تو وہاں ٹوائیلٹ پیپر کا پتہ نہ تھا اخبار کے کاغذ ادھر ادھر بکھرے ہوئے پڑے تھے اور فضلہ کموڈ میں تیر رہا تھا۔ کموڈ کے قریب برش کے بجائے درخت کی سوکھی ہوئی ٹہنی جو سوکھے ہوئے فضلے سے بھری ہوئی تھی ایک ٹوٹے ہوئے ٹین کے ڈبے میں رکھی ہوئی تھی جو غالباً" کموڈ کا ڈھکن کھولنے کے کام آتی۔ یہ منظر اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اس نے جلدی سے زنجیر کھینچ کر فلش سے فضلے کو بہانا چاہا۔ زنجیر کے کھینچنے کے بعد زور شور کی آواز تو آئی لیکن پانی نہ آیا۔ اس نے پھر زنجیر کھینچی پھر وہ آواز پانی کا اب بھی پتہ نہ تھا۔ رات کا وقت تھا بار بار زنجیر کھینچ کر شور مچانا وہ نہ چاہتا تھا اس لئے اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر اس نے پیخانے کا دروازہ بند کر کے چٹخنی لگانا چاہی تو وہ بھی اسے ٹوٹی ہوئی ملی اس۔لئے اس نے اس دروازے کو بھی یونہی چھوڑا اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کرلیا۔

بڑے مختصر سے عرصے میں اس نے اس نئے گھر کی زندگی کو سمجھ لیا اور اس کا عادی ہوگیا۔ اس گھر میں ہر ایک کا دروازہ بند رہتا اگر کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا کسی کا دروازہ کھول بھی دیتا تو جلدی سے اسے پھر بند کردیا جاتا۔ ہر کرائے دار اپنے کمرے کی صفائی کا ذمہ دار تھا۔ اگر باہر کسی کو ایک تنکا بھی نظر آتا تو اسے کوئی نہ اٹھاتا اور یہی صورت یہاں آپس کے انسانی رشتوں میں بھی پنہاں تھی۔ ہر شخص کو صرف اپنی فکر تھی یہاں سوائے دو تین کے کوئی کسی سے بات چیت بھی نہ کرتا۔ اس مکان میں ۷ کمرے تھے جن میں مختلف ملکوں کے لوگ رہتے۔ ایک اسپین کا ویٹر جو لندن کے ایک بڑے ہوٹل میں ۷ برس سے ملازم تھا اس بڑے ہوٹل اور بڑے لوگوں کی خدمت سے بڑا سا غرور اسے ضرورت سے زیادہ مل گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ کسی کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرتا۔ تین پرتگالی او پیر لڑکیاں جو گھروں کے کاموں سے تنگ آکر یہاں غیر قانونی طور پر بغیر پرمٹ کے ریستورانوں میں کام کرتیں اور اس گھر میں رہ کر لندن کی آزادی کا پورا لطف اٹھاتیں ایک قبرص کا جواری ادھیڑ عمر کا آدمی جو اکثر وقت بیٹنگ شاپ اور شراب خانے میں گزارتا' اس میں وہ صرف سونے کے لئے آتا اور اتوار کے دن اپنے گھر سے

بالکل نہ نکلتا اور اس دن گھر میں کسی کے ریڈیو کی آواز ذرا تیز ہو جاتی تو اس کے دروازے کو زور سے کھٹکھٹا کر دو چار سخت فقرے ادا کرتا اور جب ریڈیو کی آواز آہستہ ہو جاتی تو اپنے کمرے میں جا کر بڑے زور سے غصے میں دروازہ بند کرتا۔ جس سے ساری عمارت ہلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ البتہ کینیا کی جو ایشیائی لڑکی یہاں رہتی تھی۔ اس کے رویئے میں تھوڑی سی مہارت آمیز نرمی اور مسکراہٹ ہر وقت اس کے چہرے پر رہتی وہ اس گھر میں بڑی قرض طلب اور پراسرار عورت شمار کی جاتی جس کے متعلق مختلف کہانیاں لوگوں کی زبان پر تھیں۔ وہ کینیا کے ایک مالدار تجارتی گھرانے سے اپنا تعلق ظاہر کرتی۔ کبھی کبھی بینکوں کے خط بھی اس کے نام اس گھر کے پتے پر آتے لیکن قرض وہ یہاں سب سے مانگتی رہتی' گیس کے لئے ایک شلنگ کا سکہ' غسل خانے کا پانی گرم کرنے کے لئے چار پینی اور کبھی کبھی کسی سے دو اور کبھی پانچ پونڈ۔ اس کے جاننے والوں میں سب ہی ملکوں کے لوگ شامل تھے' وہ گھر میں ہمیشہ رات کے آخری پہر آتی۔ پڑوسی اس سے تنگ آچکے تھے لیکن اس کا وہ کیا کرسکتے تھے وہ لینڈ لیڈی کی منظور نظر تھی اور گھر میں کسی قسم کا حادثہ ہوتا تو اس کے توسط سے خبر لینڈ لیڈی کو پہنچ جاتی۔ کلیم نے ابتدا میں تو دو چار مرتبہ اس کی مدد بھی کردی تھی کئی مرتبہ اسے غسل خانے کے پانی کو گرم کرنے کے لئے پینیاں بھی دیں اس میں سے کچھ اس نے واپس بھی کیں۔ ایک انگریز جوڑا بھی یہاں رہتا تھا وہ کلیم سے ذرا مانوس ہوگیا' ابتدا ہی میں ان سے علیک سلیک ہوگئی جب اس ایشیائی لڑکی نے کلیم سے قرض کا سلسلہ شروع کردیا تو اس کے انگریز پڑوسی نے اسے اس سے واقف کرایا اس کے بعد لین دین کا سلسلہ بند ہوگیا۔

اس مکان میں دو منزلیں تھیں' غسل خانہ اور پیخانہ اوپر کی منزل میں تھا۔ سیڑھیاں' یہ دونوں صحن' غسل خانے اور پیخانے یہاں مشترک تھے۔ سب سے زیادہ گندگی یہاں ہی جمع رہتی۔ ان میں سے کسی جگہ کوئی گندگی ہوتی تو کوئی بھی اس پر توجہ نہ کرتا۔ ہر ایک کو اپنے کام اور ضرورت سے غرض تھی وہ ضرورت پوری کرتا اور گندگی میں اور اضافہ کرکے چلا جاتا۔ لیکن کبھی کبھار یہاں لینڈ لیڈی بھی آنکلتی اور گھر کو اس حالت میں پاکر صحن میں کھڑی ہوکر وہ صفائی پر ایک لمبی تقریر کرتی اس تقریر میں سب کو نکل جانے کے نوٹس کی دھمکی ملتی۔ محض پیسوں کی خاطر کسی مستقل صفائی کرنے والی کو نہ رکھتی اور اس

تفریر کے بعد خود صفائی شروع کردیتی۔ آپس کے تعلقات میں جو سب کی ناک اونچی تھی بے تکلفی، غرور، تنہائی اور گندگی جو ان سب میں مشترک تھی لینڈ لیڈی کو جب صفائی کرتے دیکھتے تو اس وقت ان میں ان احساسات میں سے کچھ نہ رہتا اور اسے صفائی کرتا دیکھ کر خود بھی صفائی میں مصروف ہو جاتے کہ واقعی انہیں مکان خالی کرنے کا نوٹس نہ مل جائے آخر ایسا گھر انہیں کہاں ملے گا جہاں آزادی ضروت سے زیادہ تھی کرائے داروں کا یہ تعاون لینڈ لیڈی کو ذرا نرم کردیتا اور وہ پیخانے میں برش ڈال کر اپنے گھر چلی جاتی۔

حالات اور ضروریات کو دیکھ کر کلیم نے تھوڑا سا غرور اور بے تعلقی کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تھا لیکن اس گھر میں جب کوئی اس سے محبت اور مسکراہٹ کے ساتھ بولتا تو اپنے اس غرور اور بے تعلقی کو وہ دھول کی طرح جھاڑ کر بڑے خلوص سے اس سے ملتا۔ اس گھر میں انگریز جوڑے سے اس کے تعلقات ذرا مخلصانہ تھے۔ دو ایک مرتبہ اس نے بریانی پکائی تو انہیں بھی مدعو کیا ان کو اس کا پکایا ہوا پلاؤ بڑا پسند آیا تو پھر ادھر سے بھی اسے کچھ تحفے ملے اور اس طرح ان کے انسانی تعلقات ایک ننھے پودے کی طرح پروان چڑھنے لگے۔

انگریز نوجوان ۳۰ کے لگ بھگ تھا لیکن اس کے اندر کی روحانی پیاس نے اس کے چہرے کو سوت کر رکھ دیا تھا اس کی نیلی نیلی آنکھیں ہر وقت چمکا کرتیں اور ایک گہری تلاش ہمیشہ اس کی آنکھوں میں تیرا کرتی جب کبھی وہ زیادہ تنہائی محسوس کرتا تو کلیم سے مشرق کی تہذیبوں اور اس کے فلسفوں اور ادیان کے متعلق سوالات کیا کرتا۔ اور ان سارے سوالوں کے بعد فوراً" اس کی پیاس اس کے لبوں پر آجاتی۔

"کیا تمہارے لوگوں کو خوشی حاصل ہے؟"۔

"ہاں، جن لوگوں کے پاس زندہ رہنے کا مقصد ہے"۔

"زندہ رہنے کا کیا مقصد ہے؟"۔

"کائنات کے دوسرے اجزاء کی طرح خود کو اللہ کے سپرد کردو"۔

اس کی گرل فرینڈ میں اس قسم کی کسی تلاش کا جذبہ نہ تھا۔ البتہ چہرے پر معصومیت تھی قد دراز، آنکھیں ہرنی کی بے قرار آنکھوں کی طرح، دہانے کے قریب ایک ہلکا سا تل۔ اجنبی چیزوں کو بڑے شوق سے دیکھتی۔ کچھ اجنبی چیزیں اپنی زندگی میں بھی داخل کرلی

تھیں لیکن اس کے ساتھ روایتی انگلش غرور اور تھوڑی سی کاہلی بھی اس کے کردار کے نمایاں پہلو تھے لیکن ایلن کے تعلق نے اس کے روایتی انگلش غرور کو بڑی حد تک کم کردیا تھا البتہ اس میں جو کاہلی تھی اسے رہنے دیا۔ آخر وہ ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی اور اس کی کچھ خدمت کرکے اپنی اندرونی پیاس کی تھوڑی سی تسکین پہنچاتا۔

وہ خود تھوڑے پیسے لے کر شیلٹر میں کام کرکے لندن کے غریب خاندانوں کے لئے کچھ کام کرتا اس لڑکی سے اس کے تعلقات بہت پختہ ہوتے جارہے تھے کیونکہ اب وہ خود عورت سے رشتہ قائم کرنے میں Personal ہونا چاہتا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ نے بڑی جلدی اس کی اس ضرورت کو دریافت کرلیا تھا اور بار بار کے تجربوں کے سکھائی ہوئی ہوشیاری کے تحت جو ذہانت اسے ملی تھی وہ اسے اس انسانی صفت کو طاقت ور کرنے کی کوشش کرتی رہتی اور پھر یہ اس کی بھی تو ضرورت تھی۔

کلیم نے اس نئے گھر میں کافی وقت گزار دیا یہاں رہ کر جو تھوڑا سا انسانی تعلق اس نے محسوس کیا تو اس کی موجودگی میں اردگرد کے ماحول میں موجود گندگی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ سردی کا زمانہ پھر آیا ایک رات زور کی برف باری ہوئی اس کا احساس اسے اپنے کمرے میں ہوا۔ صبح ہوئی تو اس نے کھڑکی کے گندے پردے کو ہٹا کر باہر کی فضا کو پھر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا برف کی سفید چادر ہر نظر آنے والی چیز پر پڑی ہوئی تھی۔ مکانوں کی سرخ چھتیں' فٹ پاتھ کے پیڑ' سڑک پر کھڑی ہوئی کاریں اور خود سڑک سب ہی کچھ سفید نظر آرہا تھا اور آسمان ابر آلود تھا۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو برف میں ملبوس دیکھ کر اسے بڑی راحت معلوم ہوئی' اس نے ہمیشہ لندن کو جب برف میں ڈھکا ہوا دیکھا تو اس پر بڑی رومان انگیز پراسراریت طاری ہو جاتی اور وہ لندن کو خاموش کھڑا ہوکر دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس وقت وہ یادیں بھی اس کے ذہن میں پھر ابھر آئیں اور ان یادوں کی موجودگی میں اس کے منظر سے لطف اندوز ہونے کا مزا اور گہرا ہوگیا۔ لیکن اس دن اسے فیکٹری میں کام پر بھی تو جانا تھا اس لئے جلدی سے وہ ناشتے سے فارغ ہوکر گھر سے نکلا اور ٹیوب اسٹیشن کی راہ لی جو گھر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ وہ جلدی میں تھا لیکن برف پر چلتے ہوئے اسے بڑا لطف آیا۔ ایک مرتبہ جہاں برف لوگوں کے چلنے سے سخت پڑ کر چکنی ہوگئی

تھی۔ وہاں پر وہ پھسلا بھی۔ لیکن پیروں کو چوڑا کرکے پھر خود کو سنبھال لیا۔ اور دو چار قدم آہستہ آہستہ چل کر اس نے پھر تیز چلنا شروع کردیا اور اسٹیشن پر آکر جلدی سے اس نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پہنچا ادھر سے ٹرین آئی وہ اس میں بیٹھ گیا۔

جب وہ فیکٹری پہنچا تو اسے پانچ منٹ کی دیر ہوگئی اور اپنا کارڈ اس نے بڑی پژمردگی میں پنچ کیا کیونکہ اس پانچ منٹ کی تاخیر کے سبب پندرہ منٹ کی اجرت کٹے گی۔ فیکٹری میں بلا کی سردی تھی۔ اس سردی کو محسوس کرکے تو اس پر کپکپی چڑھ گئی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس کی فورمین سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے اس تاخیر پر اسے آنکھیں نکال کر ذرا غصے کی نظر سے دیکھا۔ برف باری اور برسات نے لیبر کو بیکار کرکے رکھ دیا۔ پانی اندر فیکٹری میں گھس آیا اس لئے مزید ریڈیو تیار کرنے کے بجائے فورمین نے سارے مزدوروں کو فیکٹری سے پانی نکالنے میں لگادیا۔ کلیم نے اس حکم کی تعمیل کی وہ دوسرے ڈپارٹمنٹ میں جاکر بکسے ڈھونڈنے میں مصروف ہوگیا' بارش پھر شروع ہوگئی بکسے لاکر مزدوروں کو دوسرے ڈپارٹمنٹ میں جانا تھا جو پانی سے کسی قدر محفوظ تھا لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لئے فیکٹری کے کھلے ہوئے لان سے گزرنا پڑتا۔ اور مزدور بھاری بکسے جلدی جلدی اٹھا کر اس کھلے ہوئے لان سے گزر رہے تھے اس لئے کلیم کو بھی بھاری بکس لے کر اس برسات میں لان سے گزرنا پڑا تو وہ سردی سے کانپنے لگا جس سے اس کے کام کی رفتار بھی متاثر ہوئی۔ دوسرے مزدوروں نے اس کی اس کمزوری کو محسوس کرلیا اور وہ اس کا جسمانی طور پر کمزور ہونے کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس نے سردی کے ساتھ اسے بھی برداشت کیا اور کام کرتا رہا۔ کیونکہ یہ جمعرات کا دن تھا اور جمعہ کے روز ساری تنخواہ اسے گھر بھیجنی تھی جہاں اس کی ایک بچی ابھی تک بیمار تھی اور راشن والے نے پھر راشن ادھار دینے سے انکار کردیا تھا کیونکہ اس کا پہلا بل ابھی تک ادا نہیں کیا گیا تھا۔ اس احساس نے اس وقت اسے سنبھالے رکھا لیکن جب وہ کام سے واپس آیا تو سردی سے اس کا برا حال ہوگیا وہ بستر پر لیٹ گیا تو پھر اسے زور کا بخار چڑھا وہ ہمیشہ اپنے پاس اناڈین رکھتا اور جب اسے سردی سے زکام ہوتا تو اسی کو استعمال کرتا۔ اس لئے جب بخار زور پکڑنے لگا تو اس نے پانی گرم کرکے دو گولیاں اس وقت بھی کھائیں لیکن اس مرتبہ اناڈین نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ساری رات اسے زور کا بخار چڑھا رہا۔ بخار

کی حالت میں گھر والوں کی فکر اور طاقتور ہو کر پریشان کرتی رہی۔ صبح ذرا اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی اس لئے مزید احتیاط کے لئے اس نے اوپر نیچے دو موٹے موٹے سویٹر پہنے اور سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھکا اور اوورکوٹ پہن کر گھر سے نکل گیا کیونکہ آج جمعہ تھا اور اسے تنخواہ لے کر گھر بھیجنا تھا۔ فیکٹری میں محنت نے اس کے درد کو ذرا کم کردیا تھا لیکن جب گھر آیا تو پھر اسے بڑی سردی لگنے لگی۔ کمرے کو گرم کرنے کے لئے اس نے پیسے ڈالے اور گیس کا بند کھول دیا۔ پھر اس کی کھڑکی پر نظر پڑی تو اس نے اٹھ کر اسے بھی بند کیا تاکہ کمرہ جلد گرم ہو جائے اس رات بستر پر پڑتے ہی اس میں اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی ہفتہ اور اتوار کو ڈاکٹر کا مطب بند رہتا تھا اس لئے پھر اسے اناڈین پر اکتفا کرنا پڑا۔ پیر کی صبح اس کی طبیعت سنبھلی ہوئی تھی اس لئے پھر کام پر چلا گیا۔

گئے ہفتے وہ بخار میں کام کرتا رہا لیکن اس مرتبہ پیر کو جب وہ کام پر آیا تو اس کے ہاتھ پیر قابو سے باہر ہونے لگے۔ کام سے سیدھا گھر واپس آیا بستر پر تھوڑا سا آرام کیا اس کے بعد اپنے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا یہاں ویٹنگ روم میں مریضوں کی ایک لمبی قطار تھی اس نے انتظار کی ذہنی تکلیف سے پیچھا چھڑانے کے لئے ٹیبل پر رکھے ہوئے مہینوں پرانے باتصویر رسالوں کی ورق گردانی شروع کردی۔ تقریباً" پون گھنٹے کے بعد اس کی باری آئی۔ انتظار کے کمرے سے باہر آیا اور ڈاکٹر کو دیکھتے ہی سلام کہا۔

اس کے دیکھتے ہی ڈاکٹر کے چہرے پر بڑا بیزار کن ناگوار تاثر ابھر آیا لیکن سلام کا جواب دینے سے پہلے مصنوعی مسکراہٹ سے اپنے چہرے کو سجانے کی کوشش کی اس کے بعد سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

"کہو مسٹر پٹیل تمہاری کیا خدمت کروں"۔

"ڈاکٹر میرا نام کلیم ہے پٹیل نہیں۔" اس نے جواب دیا تو ڈاکٹر نے ذرا شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کے یہاں کالے مریضوں کی اکثریت تھی اس لئے ہر کالے کو وہ پٹیل ہی کہہ کر پکارنے کا عادی بن گیا تھا اور پھر اس دن کالے مریضوں کی اس کے مطب میں زیادتی تھی۔ جس سے وہ کچھ بیزار سا ہو گیا تھا اور جب کلیم کو اس نے دیکھا تو اپنی بیزاری پر وہ کچھ قابو نہ رکھ سکا۔

"Sorry مسٹر کلیم میں آپ کی کیا خدمت کروں۔" اس مرتبہ ڈاکٹر کے لہجے میں ذرا

سی نرمی پیدا ہو چکی تھی۔

"دو ہفتوں سے مجھے بخار ہے اور سارا بدن ٹوٹ رہا ہے"۔

"تم اپنے وطن واپس کیوں نہیں جاتے؟"۔

"ڈاکٹر! کیا میں نے یہاں کوئی جرم کیا ہے جو آپ مجھے واپس وطن بھیجنا چاہتے ہو؟"۔

"نہیں وہ آب و ہوا تمہیں سوٹ کرتی ہے"۔

"تو میری بیماری آب و ہوا کی وجہ سے ہے؟"۔

ڈاکٹر نے اس سوال کا جواب نہ دیا بلکہ ذرا غصہ میں اسے ایک مرتبہ پھر دیکھا اور بغیر اسے ہاتھ لگائے نسخہ لکھ کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "لو یہ دوا استعمال کرو اور اس کے ساتھ آرام۔" اس کے بعد ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نسخہ مروڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور ڈاکٹر کو سلام کر کے دکان پر کیمسٹ کی دکان پر دوا لینے چلا گیا۔ یہان بھی لوگوں کی قطار تھی اس نے آدھا گھنٹہ دوا کے انتظار میں یہاں صرف کیا جب دوا اسے مل گئی تو سیدھا اپنے گھر آیا اور پھر بستر پر بیٹھ گیا دو روز سے اس نے کچھ بھی نہ کھایا تھا اور کچھ کھانے کو اس وقت بھی اس کا جی نہ چاہا تو وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

کمرے کی وحشت دیکھ کر اس کا دل پھر ڈوبنے لگا۔ اس وقت اس نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے وہ زندہ قبر کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ اس احساس تنہائی اور لاچاری سے وہ پھر گھبرا گیا اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کا گندہ پردہ ہوا سے جھول رہا تھا۔ پڑوسی کے کمرے سے ریڈیو سے پاپ گانوں اور قہقہوں کی آواز آ رہی تھی تو اس کا بھی جی چاہا کہ کوئی اس وقت اس کے پاس ہو جو اس کی دوا اسے پلائے' اس کے کھانے پینے کی فکر رکھے۔ اس کی ڈھارس بندھائے آخر وہ بیمار تھا آخر یہ سب کچھ وہ کرنے کے قابل کب تھا؟ تیز بخار نے تو اسے کسی قابل نہ رکھا۔ اسے اپنی بیوی اور بچے بھی یاد آئے جو اسے ایسے ہی تیز بخار کی حالت میں جب اسے خوب جاڑا چڑھتا تو رضائی کی طرح اس پر بچھ جاتے اور اپنے بدن سے اسے گرمی پہنچاتے۔ وہ اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے۔ اس کی آنکھوں سے دور نہ ہوتے اور اس بیماری میں وہ چڑچڑا ہو جاتا تو وہ خاموشی سے اسے بھی برداشت کرتے اس وقت تو اس کے سارے انسانی تعلقات کو زندہ کر کے رکھ

دیتے۔ ماضی کی یہ یاد ایک لکیر کی طرح اس کے دل پر کھنچ گئی اور اسے پھر اپنے ہولناک روم کا خیال آیا' جہاں کبھی کبھی باہر کسی کار کے جانے کی روشنی اور پرچھائیں دیواروں پر رینگتی ہوئی نظر آتی۔ پھر اسے دوا کا خیال آیا تو وہ اپنے بستر سے اٹھا کیتلی اٹھا کر غسل خانے میں گیا اسے چولہے پر رکھ کر اسے جلایا پانی گرم کرکے اپنی دوا پی اور بستر پر لیٹ گیا--- اس دوا کے پینے کے تھوڑی دیر بعد بخار اور تیز ہوگیا پھر اسے فیکٹری یاد آئی۔ وہ وہاں ناغہ نہیں کرنا چاہتا تھا گھروالوں کو تو پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ پھر اس کی بیٹی بھی اسپتال میں تھی۔ ان کے یاد آتے ہی پھر اس نے سوچا آخر میری زندگی میں اب سوائے گندے کام کرنے کے کیا رکھا ہے۔ ان کی زندگی تو میری زندگی سے اہم ہے۔ انہوں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی اور کیا ہے؟ لیکن اس احساس سے اس کا بخار کب کیسے متاثر ہوتا۔

بخار کی تیزی کی وجہ سے اب اس کے کانوں میں سنسناہٹ گونجنے لگی۔ باہر سے کبھی آواز آتی تو وہ بھی ایسی معلوم ہوتی جیسے یہ بہت دور سے آرہی ہو۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے بخار تیز ہوتا رہا خیالات کا ایک طوفان اس کے اندر اٹھ کھڑا ہوا ان خیالوں میں ماضی کی بہت سی یادیں تھیں۔ مستقبل سے متعلق خیالات' لیکن یہ سب اس کے شعور کی سطح پر ستاروں کی طرح چمکتے اور پھر اس کے نہاں خانے میں ستاروں کی ہی طرح ڈوب جاتے اور اسے کچھ یاد نہ رہتا جب وہ کروٹ لیتا تو دیواروں کا دھوئیں سے اٹا رنگ' دوا کی شیشی' کبھی کبھی کمبل کے سرک جانے سے جو اسے سردی لگنے لگتی اس کا احساس ضرور ہوتا۔ دیواروں پر سے تو وہ نظریں پھیر لیتا۔ اس کے بعد پھر آنکھیں بند کرلیتا۔ اس وقت جسمانی تکلیف اور سوچنے سے وہ بے چین تھا اور سونے کی اس میں شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی--- لیکن یہ نیند ہی تو اس وقت اس کے لئے عنقا تھی اس نے آنکھوں کو ایک مرتبہ کھولا اس کے بعد پھر بند کرلیا--- اور وہ تھا زندگی کے متعلق اس کا عقیدہ اور اس کا پیدا کردہ Survival کا جذبہ۔

زمانہ ہوا ماضی کی دنیا اس کے اندر ٹوٹ چکی تھی۔ اس جان سے زیادہ عزیز یاد کی موجودگی میں اس نے پھر اس دنیا کی کرچی کرچی اٹھا کر اپنے اندر جمع کرنی شروع کیں۔ زود حسی اور یادوں سے اس کا بخار اور تیز ہوتا جارہا تھا۔ لیکن اس کے ایمان کی یاد بھی تو

ان کرچیوں کو جوڑ کر اس کے اندر کوئی صورت بنا رہی تھی اس وقت اسے عبدالرحمٰن ثانی کا کھجور کا پیڑ یاد آیا جو اس نے اسپین کی سرزمین میں لگایا تھا۔ کھجور کا یہ ننھا پیڑ اسے اقبال کی نظموں میں ملا' پاکستان کی جدوجہد کے دوران اس کا شعور جاگا اس تجربے کی موجودگی میں اس نے پھر کھجور کے ننھے پیڑ کی یاد اور اس خیال سے کہ اپنے بچوں کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کہ اب یورپ میں اپنی پاک محنت سے اپنے کون سے درخت کی آبیاری کرے۔ اس یاد سے اس کے بخار کی حالت میں اسے بڑا سکون ملا۔ اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب فٹ پاتھ کے پیڑوں پر چڑیوں کے سہانے گیت نے اسے جگایا وہ بستر سے اٹھا بخار اور نقاہت اب بھی اس کے جسم میں تھی لیکن اس کیفیت کی موجودگی میں اپنی جسمانی نقاہت کی اس نے چنداں پروانہ نہ کی۔ غسل خانے سے کیتلی میں پانی لایا Gas stove پر رکھا اور فیکٹری جانے کے لئے اپنے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

اس زمانے میں سارے رنگدار لوگ چاہے وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں صرف نچلے کام ہی ان کے لئے مخصوص تھے۔ فیکٹری میں وہ جھاڑو دینے سے لے کر سامان ڈھونے تک' کبھی ٹائلٹ بند ہو جاتا تو پاخانے کی بھی صفائی کرنا' الغرض وہ سارے کام جو نچلے طبقے سے متعلق تھے اسے فورمین کے آرڈر ملنے پر کرنا پڑتے حالانکہ اس فیکٹری میں اس کا تقرر بحیثیت ایک اسسٹنٹ کے ہوا تھا اور اسی کام کی اسے تنخواہ ملتی تھی ابتدا میں جب بھاری کام ملنے پر فورمین سے اس کا تذکرہ کرکے اپنے اصل کام کی نشاندہی کی جس پر اس کا تقرر ہوا تھا اور فورمین نے اس کے جواب میں اسے کارڈ تھما دینے کی دھمکی دی تو وہ خاموش ہوگیا۔ کیونکہ اس جیسے ہزاروں کالے لوگوں کو اسی طرح کے کاموں کے علاوہ یہاں کیا مل سکتا تھا' رہا اس کا اپنا پیشہ اور اس سے متعلق اس کا تجربہ تو وہ پہلے ہی یہ کہہ کر نظرانداز کردیا گیا کہ اسے لندن کا تجربہ حاصل نہیں اور اس طرح اس کی تعلیم پر خاطرخواہ توجہ نہ دی گئی۔

جب وہ فیکٹری میں کام پر واپس آیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ڈیوٹی کے لئے فٹ ہے اس لئے فورمین نے اسے ان کاموں پر پھر لگا دیا جو وہ تقریباً" روز کیا کرتا۔ صبح ہی صبح جب دوسری فیکٹری کے کچھ ریڈیو Box ٹرک لایا تو اسے ان کو ٹرک سے اتار کر ایک

محفوظ مقام پر رکھنا پڑا اس کے بعد اس نے ڈپارٹمنٹ میں جھاڑو دی اور پھر دوسرے چھوٹے کام۔ صبح صبح تو اس نے کمزوری محسوس نہ کی لیکن دوپہر کے کھانے کے بعد جو اس نے تھوڑا سا آرام کیا تو اسے بخار پھر چڑھ آیا فیکٹری کا جب سائرن بجا تو مزدور کینٹین سے اٹھے اور آہستہ آہستہ کام کے لئے فیکٹری کی طرف جانے لگے اس وقت وہ کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا آرام کر رہا تھا جب اس نے لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے اندر بھی ایک تحریک محسوس کی اور وہ اٹھ بیٹھا۔

فورمین فیکٹری میں اس کا انتظار ہی کر رہا تھا جب اسے آہستہ آہستہ چلتے دیکھا تو اسے جلدی سے چلنے کا اشارہ کرکے اپنے پاس بلایا۔ ''جاؤ تم گودام میں وہاں پانی سے بکسے خراب ہوگئے ہیں انہیں دوسری طرف اٹھا کر رکھنا ہے۔'' اس آرڈر کو سن کر اس کی جان نکل گئی اور اس نے سوچا ''اس بخار کی حالت میں پھر سردی اور پانی میں مجھے کام کرنا پڑے گا'' لیکن یہ اس نے صرف اپنے دل سے کہا اور کلرک روم میں اپنا اوورکوٹ لینے چلا گیا۔ گودام فیکٹری سے تقریباً ۲ میل دور تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک درمیانے قد کا بوڑھا آدمی ان مزدوروں کو گودام لے جانے کے لئے ایک کار لایا۔ مزدور اس کار میں خوش خوش بیٹھ گئے آخر میں وہ بھی ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گودام بہت بڑا تھا جگہ جگہ تیار ریڈیو بکسوں میں بند رکھے ہوئے تھے اور کہیں کہیں گودام کی نشیبی سطح پر برسات کا پانی کھڑا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے کافی بکس گیلے ہوکر خراب ہوگئے تھے۔ منتظم نے ان بکسوں کو اٹھانے کے لئے کچھ مزدور منتخب کئے ان مزدوروں میں کلیم بھی تھا۔ بکس کافی بھاری تھے مزدور جلدی جلدی گیلے فرش سے اٹھا کر دوسری جگہ انہیں چن رہے تھے بکس کا یہ وزن کلیم کے لئے ناقابل برداشت ہونے لگا تو وہ اسے پھر فرش پر رکھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا' اس کی جسمانی کمزوری کو دوسرے مزدوروں نے محسوس کیا اور اس کا مذاق اڑانے لگے تو بوڑھے بے رحم یہودی منتظم کی اس پر نظر پڑی اس نے دیکھا کہ کلیم سے بکس سنبھالا نہیں جارہا تو اسے درشت لہجے میں جھڑک کر قطار سے نکال دیا کہ کہیں اس کے ہاتھ سے کوئی بکس گر نہ جائے اس سے فیکٹری کا بڑا نقصان ہوگا یہ بوڑھا یہودی منتظم مراکش کا یہودی تھا اور جس آدمی کی یہ کمپنی تھی وہ خود یہودی لیکن یورپین تھا اس میں اتنی بے رحمی اور سختی نہ تھی وہ صرف اوورٹائم کی رقم بچانا چاہتا تھا اور مقررہ وقت پر

ان مزدوروں سے یہ کام ختم کرانا چاہتا تھا مراکش کے بوڑھے منتظم یہودی کو اپنے مالک کی ضرورت کا احساس تھا اس لئے مزدوروں پر وہ اور سختی کر کے مقررہ وقت پر کام ختم کرا کر فیکٹری کے مالک کی نظر میں خود کو اہل ثابت کرنا چاہتا تھا۔

لندن کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں تھا گودام کے باہر اب پھر سرد ہوا تیز چلنے لگی تھی کلیم کو اب گودام سے باہر آ کر ان بکسوں کو کار میں رکھنے پر متعین کردیا گیا۔ سردی کلیم نے پھر محسوس کی لیکن اپنی ہمت کے سہارے یہ کام کرتا رہا کام جیسے ہی ختم ہوا فیکٹری کی سیٹی بجی مزدور جلدی سے کار میں سوار ہوئے کلیم بھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھا بوڑھا منتظم انہیں اس فیکٹری میں لایا جہاں وہ کام کرتے تھے وہاں سے مزدور کبوتروں کی طرح اڑ گئے۔ کلیم کافی تھک چکا تھا آہستہ آہستہ اسٹیشن پر آیا گھر آتے ہی اس کی حالت بری ہوگئی اسے سردی لگ رہی تھی' بستر پر پڑتے ہی درد اس کے بدن میں رینگنے لگا۔ لیکن اب ڈاکٹر کے پاس جانے کو اس کا جی نہ چاہا کیونکہ ڈاکٹر کا سرد چہرہ اور اس کا سلوک اس کے ذہن میں ابھرنے لگا تھوڑی دیر بعد اسے ہول آنے لگا رفع حاجت کی اسے ضرورت تھی بستر سے اٹھا تو اسے گھمیری آنے لگی لیکن ہمت کر کے وہ پاخانے میں آیا اور بے ہوش ہو کر وہاں گر پڑا اس کے گرنے کی آواز سے پڑوسی باہر آئے اور کار میں بیٹھا کر اسے اسپتال لے گئے۔ اسپتال میں دوسرے دن اس کی آنکھ کھلی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے اس دن آسمان پر سورج چمک رہا تھا لیکن سردی نے اس کی تپش کو جذب کرلیا تھا کلیم کو اس وقت لان پر کچھ پھول بھی نظر آئے جو اس کو اس وقت ذرا اچھے لگے تو یہاں بھی اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا صاف ستھرا ماحول قرینے سے رکھی ہوئی چیزیں ڈاکٹر اور نرسوں کی توجہ ان سب کو محسوس کر کے وہ سوچنے لگا یہ سب کچھ تو مجھے یہاں زندگی میں نہیں ملا اور ملا تو صرف یہاں کے اسپتال میں۔ شام کو "ایلن بھی عیادت کو آیا اور دیر تک وہ اس سے باتیں کرتا رہا' جس سے اس کا جی بہل رہا تھا کہ معاً" اسپتال کی گھنٹی بجی عیادت کرنے والے جانے کے لئے اٹھے۔ ایلن بھی اٹھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے دلاسا دیا تو اس کے جاتے ہی پھر احساس تنہائی اس کے باہر آگیا اور اس کی موجودگی میں وہ ایلن کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اسے نظر آیا۔ وہ پھر اداس اور بیزار ہوگیا وارڈ میں دوسری گھنٹی بجی تو جو عیادت کرنے والے مریضوں کے پاس بیٹھے ان

سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور انہیں تسلی دے رہے تھے دوسری گھنٹی کو سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے تو مریضوں کے چہروں پر پھر اداسی اور خاموشی چھاگئی اسے دوسرے مریضوں کو تنہا اور خاموش دیکھ کر پھر تنہائی کا احساس ہوا تو آنسوؤں سے اس کی آنکھیں تر ہو گئیں اور ایلن کے لائے ہوئے پھولوں کو دیر تک دیکھتا رہا۔

اسپتال سے ڈاکٹر نے اسے رخصت کردیا تو وہ اپنے گھر آگیا۔ لیکن اس میں نقاہت کافی تھی اس لئے فیکٹری میں کام پر واپس نہ جاسکا' دو ہفتے کے بعد اس کا انشورنس کارڈ اور کچھ رقم فیکٹری سے منیجر نے اسے پوسٹ کی اب وہ پھر بے کار ہوگیا۔ اس احساس سے اس نے جھٹکا سا محسوس کیا اور وہ سوچتا رہا معلوم نہیں اب ملازمت اور کام کب ملے پھر اس نے سوچا اب وہ چکر پھر شروع ہوگیا جس میں وہ کئی برس سے مبتلا ہے۔ اس کے ماضی کا تصور اس کے ساتھ تھا۔ لیکن اب وہ اداس نہ ہوا اپنا کارڈ وہ اسی دن بے کاری کے دفتر میں جمع کراچکا تھا اب صرف بے کاری کے دستخط کرنے اسے دفتر جانا پڑتا۔ اسی دن دفتر میں مختلف ملازمتوں کے جو اشتہار لگے رہتے انہیں دیکھتا کسی دن کوئی ملازمت اسے پسند آتی وہاں جاتا۔ لیکن وہاں اسے کام نہ ملتا۔ بیکاری کا بھتہ بھی ڈاک کے ذریعے گھر آجاتا جدوجہد کا وہ عادی تھا۔ مایوسی کو کفر تصور کرتا' کام کی تلاش میں پھر گھر سے نکل جاتا۔ بیکاری کا وہ عادی بنتا جارہا تھا لیکن مایوسی کا نہیں۔ ماضی کا احساس تو اس کے لئے ایک طرح کی ڈھال بن چکا تھا جب باہر کی دنیا کی بے انصافی اور گندگی سے اس کا واسطہ پڑتا تو وہ اپنے ماضی کے احساس کو اپنے اندر پھر بیدار کرلیتا اس بیداری کی موجودگی میں باہر کی دنیا کی ساری اذیتیں اس کے جسم و روح کو زیادہ دکھ نہ پہنچاتیں ان سارے مصائب کے لئے وہ ایک چٹان بن گیا تھا۔ جس گھر میں اب وہ رہ رہا تھا اس میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اس کی بیماری اور اسپتال کے داخلے نے جو تھوڑی سی انسانیت ان کے رویوں میں پیدا کردی تھی وہ اس سے خوش ہوتا لیکن ان کا سہارا نہ لیتا صرف اپنی جدوجہد پر زندہ رہنا چاہتا تھا۔

وہ صبح گھر سے کام کی تلاش میں نکلتا اور جب دوپہر کو وہ گھر واپس آتا تو ذرا دیر کبیدہ خاطر رہتا۔ اس بیکاری نے اسے اور زود حس بنا دیا تھا ان دنوں وہ ہر چیز کو بری طرح محسوس کرتا۔ کام کی تلاش کے لئے جمعہ اور پیر کو وہ بڑی محنت کرتا کیونکہ انہی دو دنوں

میں کام ملنے کی بڑی امید ہوتی وہ ہر دفتر اور فیکٹری میں جاکر کام کی پوچھتا اور ہر جگہ سے بڑی خندہ پیشانی سے اسے یہی جواب ملتا کہ فی الحال تو کوئی جگہ خالی نہیں ۱۲ بجے کے بعد وہ پھر لیبر ایکسچینج آتا وہاں بھی اسے اسی ناامیدی سے واسطہ پڑتا' بیکاری کی پیدا کردہ ناامیدی اسے پژمردہ کردیتی۔

صبح ہوتی تو ماضی کا عقیدہ پھر اس کے اندر جدوجہد کا ایک نیا جذبہ پیدا کرتا اور وہ پھر لندن کی فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کی تلاش میں نکل جاتا۔ بیکاری میں اس طرح اس کے چار مہینے گزر گئے ان چار مہینوں میں گھر سے کئی خط آئے ہوئے تھے خط طرح طرح کی مصیبتوں' فکروں اور قرض والوں کے مطالبوں سے بھرا ہوتا کسی خط میں راشن والے کے راشن بند کردینے کی دھمکی کیونکہ اس کا بل مہینے کے مہینے ادا نہیں ہوتا' دودھ والا' ایندھن والا یہ تو روز ہی پریشان کرتا کسی خط میں اس کی سب سے چھوٹی بیٹی لکھتی کہ اتنے دن آپ کو لندن میں ہوگئے' آپ پاکستان ایک مرتبہ بھی نہیں آئے اور جب آپ گئے تھے اس وقت تو میں بہت چھوٹی سی تھی اور اب تو آپ کی صورت بھی میری نظروں میں دھندلی پڑتی جارہی ہے۔ تھوڑے دنوں کے لئے ہی آپ گھر آجاتے۔ جب میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ تمہارے ابا تم سے اب محبت نہیں کرتے آخر اتنے برس تک اپنے بچوں کو چھوڑ کر پردیس میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے ان کی یہ باتیں سن کر میں بڑی رنجیدہ ہو جاتی ہوں۔ میرے پیارے ابا جان مجھے تو آپ کی محبت کا یقین ہے لیکن انہیں کیسے یقین دلاؤں لیکن میری تو یہ بھی خواہش ہے کہ وہ آپ کی محبت کا یقین کرلیں کہ آپ بھی ایک اچھے باپ کی طرح اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں' کئی عیدیں گزر گئیں اس دن سب اپنے باپوں سے عیدی کے لئے مچلتی ہیں جب یہ مقدس دن آتا ہے تو آپ کو نہ پاکر ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ اب میں بڑی ہوگئی ہوں اس لئے میرے لئے لندن سے ایک گرم اونی کارڈیگن لے کر ضرور آیئے کیونکہ جب جاڑوں میں اسکول جاتی ہوں تو میرے پاس سوائے اس پرانی چادر کے کچھ نہیں ہوتا جو ایک مرتبہ آپ نے امی کے لئے بھیجی تھی۔

اپنی بیٹی کے اس خط کو پڑھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی شروع ہوگئی تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور بستر پر بیٹھ کر خوب رویا' لیکن وہ سوائے اس رونے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا اس وقت تو اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے بیچ کر وہ گھر

پیسے بھیج سکے تاکہ دو وقت کی روٹی تو انہیں اطمینان سے مل سکے ان بیکار دنوں میں اس کو فیملی الاؤنس بھی نہیں مل رہا تھا اس کی منجھلی بیٹی بھی اسپتال سے آگئی۔ ڈاکٹر نے اس میں خون کی شدید کمی بتائی اس نے بھی اپنے ہاتھ سے اپنے باپ کو خط لکھا کہ میری بیماری کا سبب ناکافی غذا ہے' ڈاکٹر نے کہا دواؤں سے زیادہ صحت بخش کھانے پر خصوصاً" پھلوں پر توجہ دو۔ لیکن ان دنوں تو ہمارے گھر صرف مہینے میں ایک مرتبہ گوشت پکتا ہے۔ امی نے اب کئی پڑوسیوں کے گھر کام کرنا شروع کردیا ہے وہاں سے جب وہ کچھ لاتی ہیں تو چولہا چڑھ جاتا ہے' بھائی کا پتہ نہیں اور ادھر آپ لندن میں بے کار ہیں۔ آخر آپ واپس پاکستان کیوں نہیں آجاتے۔ یہ بھوک اور محرومیاں ہی ہماری قسمت میں لکھی ہیں؟ لیکن اگر ایسی حالت میں آپ ہمارے ساتھ ہوں گے تو یہ دن آسانی سے کٹ جائیں گے۔ اللہ لندن میں ہی نہیں ہے یہاں بھی ہے' اس خط میں اس کی بیوی نے مزید لکھنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ اس خط میں کچھ جگہ باقی تھی' اس خط کو پڑھ کر اس کے آنسو نہ نکلے بلکہ اس پر ایک بدحواسی سی چھا گئی' اور وہ سوچنے لگا آخر اس طرح خالی ہاتھ میں کیسے جاؤں--- اور پھر اگر میں اس حالت میں چلا بھی گیا تو پھر انہی حالات سے واسطہ پڑے گا جسے درست کرنے کے لئے یہاں آیا تھا--- اور پھر گھر جانے کے لئے بھی تو خرچ چاہئے۔ یہاں سوائے میری جان کے میرے پاس کیا ہے؟

دوسرے دن سے اس نے گوشت' مکھن' کافی سب ہی چھوڑ دیا۔ صرف آلو کھانے پر اکتفا کیا وہ گھر میں گیس ہیٹر بھی نہ جلاتا کیونکہ گیس ہیٹر کے روشن کرنے کے لئے میٹر میں پیسے ڈالنا پڑتے ہیں اس لئے سردی سے بچنے کے لئے وہ لائبریری چلا جاتا جہاں ہر طرح سے گرم رہتا اور جب لائبریری بند ہو جاتی تو زمین دوز ٹرین کے اسٹیشن پر جاکر ہیٹر کے پاس بیٹھ کر خود کو سردی سے بچاتا رہتا وہاں سے بھی اس وقت اٹھتا جب اسٹیشن بند ہونے لگتا اور گھر آتے ہی اپنا ہیٹر نہ جلاتا بلکہ ربر کی بوتل میں گرم پانی بھر کر رضائی کے اندر رکھ کر اپنے بستر پر دراز ہو جاتا گرم ربر کی بوتل کا رواج لندن میں کافی مقبول تھا لوگ رات کے وقت اس کو اپنے بستروں میں رکھ کر سردی کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ بیکاری کا زمانہ تھا اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں اس نے کافی کمی کردی تھی سستے سے سستا گوشت خریدتا' بھیڑ کی گردن جو سستی ملتی تھی' وہ کافی کا عادی تھا اسے

ترک کر کے سستی چائے پینا شروع کردی‘ ناامیدی کو اپنے قریب نہ آنے دیتا روز سردی میں گھر سے کام کی تلاش میں نکل جاتا اور پیدل چلتا اس طرح اپنی ذات پر کم سے کم پیسے خرچ کرتا کیونکہ وہ جلد سے جلد تھوڑے سے پیسے جمع کر کے اسے بیوی بچوں کے پاس بھیجنا چاہتا تھا۔ جمعہ کے روز سیدھا ملازمت دلانے والے دفتر پہنچا کیونکہ اس دن نئی ملازمتوں کی ضرورتوں کا اشتہار اسی دن مختلف اداروں سے ملتا۔ یہاں اسے کام ملنے کی بڑی امید تھی وہاں اسے صفائی کرنے کے کام کی پیشکش کی گئی۔ پہلے تو اس پیشکش کو سن کر اسے دھکا سا لگا اور اس وقت اسے اپنی تعلیمی اور سماجی حیثیت یاد آئی لیکن اس دکھ پر جب اس کی سوچ نے قابو پالیا تو پھر اسے خیال آیا کہ ان پانچ برسوں میں اس قسم کے کام کے علاوہ اس نے یہاں اور کیا ہی کیا ہے تھوڑی سی سوچ بچار اور اس تجزیئے نے اسے کام کے لئے آمادہ کردیا اور اس نے اس صفائی کے کام کی پیشکش کو قبول کرلیا۔ لیبر ایکسچینج کا کارڈ لئے وہ اسی فیکٹری میں گیا فورمین اس سے بڑی عزت سے پیش آیا اور پیر کو کام شروع کرنے کے لئے کہا۔

برسرروزگار ہونے کے احساس نے پھر اس میں ایک قسم کا اطمینان پیدا کردیا۔ پیر کے روز صبح ہی صبح کام پر گیا۔ کام کیا تھا صبح ہی صبح ٹائلٹ کی صفائی‘ ۱۰ بجے لوگوں کو چائے دینا اور بعد میں جو وقت بچے وہ فیکٹری کا کچرا بھر بھر کر باہر ڈسٹ بن میں ڈالتے رہنا اور کبھی ٹرک آجائے تو اس سے موٹے موٹے لوہے کی سلاخیں اتار کر فیکٹری کے اسٹور روم میں رکھنا۔

اس نے اپنے اصل پیشے‘ علم اور عزت کی خواہش کو ذہن سے کھرچ کر اپنی ساری توجہ اس خیال پر مرکوز کرلی کہ اس سوسائٹی میں صرف اپنی محنت کی اجرت وصول کرکے کسی اور چیز کی توقع نہ رکھے‘ لیکن جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس سوسائٹی کو ضرور دیتا رہے‘ شاید وہ چیز مستقبل میں اس کے کام آجائے۔ گرمیوں کا زمانہ شروع ہوچکا تھا لوگ اپنے اپنے گارڈنوں کو ٹھیک کر رہے تھے۔ کلیم کو پھولوں اور خوشبو سے ہمیشہ دلچسپی تھی۔ اس کی پشت پر جو اجڑا ہوا گارڈن تھا اس کو سنوارنے کی اس میں بھی خواہش پیدا ہوئی۔ لینڈ لیڈی سے اس نے اس کا تذکرہ کیا وہ مسکرا دی۔ جب اسے تنخواہ ملی تو بازار سے کچھ پھولوں کے پیڑ لے آیا۔ ہفتے کا پورا دن اس کی صفائی میں صرف کیا اس کے بعد اس نے

گھر کی صفائی کی طرف توجہ کی، کبھی ٹائلٹ صاف کرتا اور کبھی پاخانہ اور کبھی سیڑھیوں پر جھاڑو دیتا، پڑوسیوں کی طبیعت پر اس کا بھی اچھا اثر پڑا۔ کچھ نے اس کی تعریف کی، مہینے کے بعد گارڈن میں گھاس کا فرش بھی قدرت نے بچھا دیا۔ ننھے ننھے پیڑوں میں پھول بھی کھلنے لگے۔ اپنی کھڑکی میں سے انہیں وہ دیر تک دیکھتا رہتا اور بڑا خوش ہوتا۔

ایک دن جب سرخ گلاب کا پھول مکمل ہوگیا تو باغ میں آکر اس نے اسے توڑا اور باریک کاغذ میں لپیٹ کر کمرے میں آکر سوگیا۔ دوسرا دن اتوار کا تھا ایلن اس دن دیر سے اٹھا اور جب دروازہ کھولا تو سامنے لفافہ پڑا پایا۔ اس پر اس نے اپنا نام پڑھ کر اسے کھولا۔ گلاب کا پھول دیکھ کر ایلن نے کہا۔

"شکریہ! یہ گلاب بہت خوبصورت ہے"۔

اس کے ہاتھ میں گلاب اور چہرے پر متشکرانہ مسکراہٹ کو دیکھ کر اس وقت کلیم کی زبان پر کوئی لفظ نہ آیا اس نے مسکرا کر آنکھیں جھکا کر ایلن کا شکریہ قبول کیا۔

"آج ہمارے ساتھ ناشتہ کرو۔" ایلن نے اسے مدعو کیا۔

"کیوں تکلیف کرتے ہو"۔

"اس میں کیا تکلیف ہے"۔

اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے وہ ایلن کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا اس وقت اس کی گرل فرینڈ وہاں ناشتہ تیار کر رہی تھی اس نے اسے گڈ مارننگ کہا۔

لڑکی نے جواب دے کر اس کے مزاج پوچھے۔ کلیم نے اس کا جواب بھی بڑی گرم جوشی سے دیا۔

زندگی اور تجربوں نے اس میں ایک طرح کی یک سوئی پیدا کردی تھی اب کام سے جو وقت بچتا وہ اپنے لگائے ہوئے باغ میں صرف کرتا۔ روزہ، نماز، تلاوت قرآنی اور کبھی کبھی ایلن سے بحث و مباحثوں میں اس کا وقت گزرتا۔ گندے کام کی اجرت لندن میں ذرا اچھی ہوتی ہے کیونکہ اس کام کے لئے آج کل آسانی سے آدمی نہیں ملتے۔ اس لئے اب اسے تنخواہ بھی پہلے سے اچھی ملنے لگی اور گھر پر بھی باقاعدگی سے پہلے سے زیادہ پیسے پہنچنے لگے جب کبھی وہ کام سے گھر واپس آتا تو کمرے میں گھستے ہی کھڑکی میں سے اپنے باغ کو ضرور دیکھتا۔ پھولوں کے پیڑ اب کافی بڑے ہوگئے تھے اس لئے ہوا میں وہ اکثر جھومتے

رہتے انہیں اس حالت میں دیکھ کر اسے اپنے بچے یاد آجاتے جو کبھی اپنے بچپن میں اسی طرح اس کو گھر سے جاتے اور گھر میں آتے ہوئے ہاتھ کے اشاروں سے اپنی محبت پیش کرتے' ان پیڑوں کا جھومنا پھر اس کے ماضی کو اس کے ذہن میں زندہ کردیتا۔ اور اس محبت کے تصور سے اس کا دل مچا مچ بھر جاتا۔

ان ہی دنوں اسپین کے ویٹر نے ایک کار خریدی تھی کار نئی تھی وہ اسے سڑک پر کھڑی نہ کرنا چاہتا تھا اس کے لئے اسے ایک گیراج کی ضرورت تھی اپنی اس ضرورت کا اظہار اس نے لینڈ لیڈی سے کیا' مزید کرائے کے لالچ نے اسے رضامند کردیا۔ اس نے کونسل سے اجازت چاہی اسے اجازت بھی مل گئی۔

اتوار کے دن جب باغ میں نیو کی کھدائی شروع ہوئی تو کدال کی پہلی چوٹ کو سنتے ہی اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا باغ کے گھاس کے فرش پر مٹی کا ڈھیر تھا اور پھولوں کے پیڑ الگ کٹے ہوئے پڑے تھے' باغ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا اور اس وقت اس کے ذہن میں تقسیم ہند کا نقشہ ابھر آیا جب فسادیوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ اور دوسرے عزیزوں کے اسی طرح ٹکڑے کئے تھے اسے غشی آنے لگی لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور بستر پر لیٹ گیا۔

اور پھر اس بستر سے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ باغ برباد ہوا۔ اس کی جگہ ایک جدید قسم کے گیراج نے لے لی۔ اسے دیکھ کر اس نے چپ سادھ لی۔ اب اس کا منہ نہ کھلتا صرف آنکھوں سے وہ زبان کا کام لیتا۔ کبھی کبھی کوئی اس سے کچھ پوچھتا بھی تو آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے پر بھی کچھ تاثرات ابھرتے' آنکھوں سے اپنا کام لے کر پھر وہ اٹھنے اور سنبھلنے کی کوشش کرتا تو اس کی جھیل کی طرح گہری چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گہرا خیال تیرنے لگتا جو اس کے وقت اس کے دل کے ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی تیرنے لگتا۔ اس گھر میں وہ جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا ان میں اتنی صلاحیت اور اہلیت نہ تھی جو دل سے آئے ہوئے خیال کو آنکھوں میں دیکھ کر اسے سمجھ سکیں۔ البتہ اسے دیکھ کر اتنا خیال ضرور ہوا کہ اس نے شکست اب بھی نہیں مانی ہے اگر اسے موقعہ ملے گا تو پھر کوئی اور پودا لگا دے گا۔

(لندن۔ ۱۹۷۰ء)

عشرتوں کے دکھ

میری نوٹ بک کے چند صفحے

جون ۱۹۷۹ء

آج Spring ہولی ڈے کی چھٹی ہے بادل آسمان پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی ہے' لیکن اس میں ہلکی سی خنکی ہے Hampstead کے ایک مشہور کیفے (The Prompt Corner) پرومٹ کارنر میں' میں اداس اور بیزار بیٹھا ہوں۔ موسم نے بڑا متاثر کیا ہے۔ کہیں کہیں بدن میں ہلکا سا درد ہے۔ طبیعت بوجھل۔ اور کاہلی کہر کی طرح اعصاب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس وقت اس کیفے میں کافی لوگ بیٹھے ہیں' کچھ اپنی بیزاری سے تنگ آکر یہاں سے جارہے ہیں لیکن میری طرح اکثر اداس اور بیزار ہیں۔

لندن کے اس جنت نشاں مقام پر جہاں ہر طرف ہریالی' گھروں کے سامنے والے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں رنگ برنگے پھول' خوبصورت دبدبے والی قدیم عمارتیں چھوٹی چھوٹی گلیاں' ان کے کونوں پر چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب خانے Prompt Corner سے ذرا فاصلے پر تالاب میں تھرکتی ہوئی تتلیوں کی طرح عمارتوں کے سائے کشتیوں کی طرح ڈولتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ پرومٹ کارنر خود ایک دنیا ہے

جسے انگریزی کے مشہور ناول نگار جارج اور ویل نے بسائی تھی۔ جن دنوں یہ انگریز ناولسٹ ہمپسٹیڈ میں رہتا تھا اس کیفے میں اس کی کتابوں کی دوکان تھی۔ اب وہاں اس کی کتابیں تو نہ رہیں' البتہ انگریز قوم نے اس کی خدمات کے پیش نظر اس کے نام کی تختی اور اس پر چھوٹا سا اس کا چہرہ ضرور نسب کردیا ہے' لیکن جو لوگ یہاں چائے پینے اور شطرنج کھیلنے آتے ہیں وہ اسے کچھ بھولتے جا رہے ہیں۔

اس خوبصورت کیفے میں شطرنج کا کھیل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ وہ کھلاڑی جو زندگی کو کھیل سمجھ کر اس میں بازی ہار گئے وہ شطرنج میں بازیاں خوب جیتتے ہیں لیکن چھٹی کے دن وہ بھی ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر اداس اور بیزار بیٹھے ہیں۔ کبھی کبھی ریستوران میں جو شیشے لگے ہوئے ہیں ان سے راہ گیروں کو دیکھتے اور سگریٹیں پھونکتے رہتے ہیں۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے انہی بے قرار لوگوں میں قبرص کا ایک ادھیڑ عمر کا یونانی آدمی پرانے اخبار کے صفحے الٹ کر اپنا وقت کاٹ رہا ہے۔ سیاہ قمیض اس پر پیلی ٹائی اور روایتی انگلش کوٹ (جیکٹ) اس کے جسم پر اس وقت کچھ ایسے لگ رہے ہیں جیسے یہ چیزیں اس پر چسپاں کردی گئی ہوں اس دن گھر سے وہ بن ٹھن کر چھٹی کے دن کا لطف لینے نکلا ہے۔

ریستوران میں میری سیٹ کے سامنے جو سیٹ ہے اس پر ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے۔ اس کے کپڑے ٹھیک نہیں' لیکن اس کی آنکھوں میں کاجل کی طرح انتظار اب بھی موجود ہے۔ یہ خوبصورت عورت یہاں اکثر آتی ہے لیکن کسی سے بولتی نہیں کبھی کبھی خاموشی سے گھبرا کر وہ شطرنج کے کھیل دیکھ لیتی ہے۔ قبرص کا ادھیڑ عمر یونانی اپنی سیٹ سے اٹھا اور دوسری ٹیبل سے انگریزی کا عوامی اخبار Daily Mirror اٹھا لایا اور سب سے بے تعلق ہو کر اخبار پڑھنے لگا۔

اس کیفے میں آنے والے تمام لوگ اسے جانتے ہیں اور اسے ٹونی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ٹونی جب اس کیفے میں دخل ہوا اس کا اپنا اخبار مڑا ہوا کوٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اور سر کے بکھرے خشک بال ہوا سے ہل رہے تھے۔ یہ بڑا خاموش آدمی ہے اپنی بربادی اور بڑھتے ہوئے بڑھاپے کا اسے شدید احساس ہے جوئے نے اسے برباد کر کے رکھ دیا۔ اس عمر میں بھی وہ جوئے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب وہ خود جوا نہیں کھیلتا

بلکہ دوسرے عادی جواریوں کو ریس کے گھوڑوں کے نمبر بتاتا رہتا ہے۔

جواری اس کے بتائے ہوئے نمبروں پر داؤ لگاتے ہیں کافی جیت بھی چکے ہیں۔ جس سے اس کی ساکھ یہاں اور بڑھ گئی ہے' لیکن ریس کے گھوڑوں پر جواریوں نے جو رقم جیتی اس میں سے اسے کچھ نہ دیا۔ ٹونی کو اس کی پرواہ نہیں۔ نمبر بتانا اب خود اس کا مشغلہ بن چکا ہے اور یہ یقین اس میں جڑ پکڑ گیا ہے کہ وہ روحانی قوت کا مالک ہے۔ کیفے کا مالک بھی قبرص کا یونانی ہے اس کی اس "روحانی" قوت کی وجہ سے اس کی بڑی عزت کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اسے بھی ٹونی سے کوئی نمبر مل جائے جس پر بڑی رقم لگاکر جیتے اور قبرص چلا جائے' یہاں کی برسات اور بادلوں سے وہ تنگ آچکا ہے۔ لندن میں سورج کی روشنی کی شدت سے ضرورت محسوس کرتا ہے۔

کبھی کبھی اس کیفے میں گاہکوں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ یہاں جگہ حاصل کرنے کے لئے قطار لگانا پڑتی ہے جب کیفے میں کاروبار کا یہ عالم ہوتا ہے تو ٹونی اس وقت مالک کی مدد کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلا جاتا ہے اور اس کے جھوٹے برتن دھوتا رہتا ہے۔ اس کام کی مالک سے سوائے چائے کے کوئی اجرت نہیں ملتی' ٹونی کو اس کی بھی شکایت نہیں لیکن چائے کے ساتھ سگریٹوں کی بھی تو اسے ضرورت رہتی ہے جو وہ اپنے پیسوں سے خریدتا ہے۔ یہ پیسے ہر ہفتے اسے حکومت سے ملتے ہیں۔ ٹونی لندن میں تقریباً" بیس سال سے رہ رہا ہے۔ ایک معصوم شرمیلی انگریز عورت سے اس نے محبت بھی کی۔ تھوڑے عرصہ بعد اس محبت نے بھی جان دے دی۔ لیکن اس محبت کے طفیل اسے دو بچے ضرور ملے ٹونی کو ان بچوں سے بڑی محبت ہے جب یہ دونوں بچے اپنی ماں کے ساتھ ہوتے ہیں تو ٹونی انہیں کچھ نہ کچھ خرید کر ضرور دیتا ہے۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ چلے جاتے ہیں تو ٹونی پھر اس کیفے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر سر جھکائے سگریٹیں پیتا رہتا ہے۔ جب سگریٹ نوشی سے اس کا دل بھر جاتا ہے تو پھر وہ اونگھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اونگھتے ہوئے وہ چونک پڑتا ہے۔ آنکھیں کھول کر اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے اس کے بعد پھر اخبار تلاش کرکے اسے پڑھنے لگتا ہے اور دنیا جہاں کی ساری خبریں پڑھ جاتا ہے کہ جس دنیا میں وہ اس طرح رہ رہا ہے وہاں کیا ہو رہا ہے۔ سگریٹوں کے لمبے کش لگاکر وہ کھانستا بھی خوب ہے۔ کبھی زکام سے اس کی ناک بند ہو جاتی ہے۔ اس دن ٹونی کو اداس

اور اونگھتا ہوا چھوڑ کر میں کیفے سے نکل کر Hampstead Heath کی طرف چلا گیا جہاں آج میلہ لگا ہوا تھا۔ اس میلے میں طرح طرح کے کھیل تھے سب سے زیادہ جوئے کا کھیل۔ اس کے بعد بجلی سے چلنے والی موٹریں' کھانے پینے کے اسٹال لیکن میری نظریں ہر چیز کو چھوتی ہوئی پرانی کتابوں اور پرانی چیزوں کی دوکان پر آکر ٹھہر گئیں یہاں سے میں نے کچھ چیزیں خریدیں دل خوش ہوا۔ نہ جانے پرانی چیزوں سے میرا دل اتنا خوش کیوں ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں خوشی کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کی مغرب کے معاشرے میں سب کو ضرورت ہے۔ خوشی ہے کیا اس کا سراغ میں ابھی تک نہ لگاسکا اس خوشی کو تلاش کرنے کے لئے کبھی کبھی میں اپنی مختلف کیفیتوں کو یاد کرنے لگتا ہوں ان یادوں میں مجھے وہ کیفیت بھی مل جاتی ہے جس سے میرا جسم اور روح ایک قسم کا انبساط محسوس کرتا ہے وہ ہے نماز جس میں ہر روز خدا سے میں عہد کرتا ہوں کہ اس دنیا میں کیوں آیا اور کیا کرنا ہے۔ نماز کے بعد میری تخلیقات جو صفحات پر رنگوں کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ انبساط اس سے بھی ملتا ہے لیکن نماز کے سرور سے مختلف۔ پھر مناظر قدرت' تالاب' دریا' سمندر میں دھوپ اور کبھی چاندنی میں چمکتی ہوئی پانی کی لہریں۔ اس سے بھی دل کو بڑی فرحت ملتی ہے۔ انہیں یادوں میں میری بیوی میرے بچوں کی یاد بھی تصویر کی طرح میرے تصور میں ابھر آتی ہے۔ میرے فنکار بننے کی سب سے بڑی قیمت انہوں نے ادا کی۔ میری فنکاری کے لئے میرے ساتھ بہت سی قربانیاں دیں۔ میری زندگی کے ساتھ قربانیوں کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے جس کے لئے برابر شکایتیں ہیں' لیکن اس کے ساتھ میرے لئے دعائیں بھی۔ اسی خوشی میں تھوڑا سا احساس جرم بھی شامل ہو جاتا ہے۔

یہ ساری قربانیاں میری فنکاری کا کچھ سہارا سا بن گئی ہیں' لیکن اس وقت میری قوم کو اس فنکاری کی ضرورت نہیں اسے کچھ اور چاہئے۔

۲۴ جون ۱۹۷۹ء

جون کے مہینے کا لندن میں ہمیشہ انتظار رہتا ہے اس مہینے میں چاروں طرف ہریالی روشنی کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پارکوں اور باغوں میں رنگ برنگے پھول لوگوں کے شگفتہ

چہرے، پرندوں کے گیت، دھوپ، اس میں یورپی لوگوں کی خوش مذاقی۔ لیکن اس مرتبہ جب جون کا مہینہ آیا تو ہمپسٹیڈ میں یہ سارے دل فریب مناظر خواب و خیال بن کر رہ گئے۔ بادل ہر روز آسمان پر منڈلاتے رہتے۔ بوندہ باندی۔ وہ بھی روز کا معمول بن گئی۔ ان بادلوں اور مینہ کی پھوار کا کتنا انتظار رہتا ہے لیکن روز کی بارش نے اس انتظار کو وحشت بنا کر رکھ دیا۔ اب تو موسم کی بات کرنے سے ہی کوفت ہوتی ہے۔ موسم کی وجہ سے طبیعت گری گری سی رہتی ہے۔ سوائے سونے کے کسی چیز کے لئے جی نہیں چاہتا۔ چیزوں اور لوگوں کو دیکھنے اور برتنے سے بھی دل و دماغ میں کوئی خیال اور احساس نہیں ابھرتا۔ لوگوں سے بے تعلق ہو کر خاموش رہنے سے طبیعت میں کبھی کبھی گھٹن سی پیدا ہونے لگتی ہے تو سہارے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان یادوں سے طبیعت سنبھلتی ہے تو اپنی ملازمت پر چلا جاتا ہوں۔ کام کی مصروفیت آٹھ گھنٹے تک ذہن و جسم کو مصروف رکھتی ہے۔ اس وقت سوائے کاہلی کے کسی قسم کا درد محسوس نہیں کرتا۔ دفتر سے واپس آکر سیدھے اپنے بوسیدہ فلیٹ میں آتا ہوں۔ اور کھڑکیوں سے آسمان کو دیکھتا رہتا ہوں۔ آخر اس تنہائی میں اس آسمان کو کب تک تکتا رہوں۔ بستر سے اٹھ کر ذرا ٹہلتا ہوں تو بدن میں کاہلی کے ساتھ دائیں پیر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کرنے لگتا ہوں تو پیروں کو فرش پر پیٹ کر سارے بدن میں حرکت کی ضرورت کا احساس جاگتا ہے اس حرکت کو محسوس کرکے گھر سے نکل کر لوگوں کی موجودگی محسوس کرنے کے لئے قریب کے ریستورانوں میں چلا جاتا ہوں لیکن یہاں جو بیٹھتے ہیں میری طرح وہ بھی اداس اور بیزار۔ جب ان سے طبیعت اکتا جاتی ہے تو پھر Heath کا چکر لگا کر پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ نیند کب آئی یہ مجھے یاد نہیں۔ صبح سویرے آنکھ کھلی حسب معمول بستر چھوڑنے سے پہلے بستر پر پڑے پڑے سورہ فاتحہ شعور کو مخاطب کرکے پڑھنا شروع کیا۔ آرام اور نیند سے طبیعت میں تازگی کا سا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ سورہ کو زبان سے ادا کرنے سے اس آیت کا مفہوم ذہن میں شدید روحانی فرحت کا احساس میٹھے رس کی طرح میرے وجود میں تیرنے لگتا ہے کلام اللہ (قرآن مجید) کی یہ سورہ میری مونس و غم گسار ہے اسے دہرانے سے میرے اندر اللہ کی محبت اور رجائیت ابھرنے لگتی ہے۔ اس محبت اور رجائیت کو قوت کی طرح محسوس کرکے جلدی سے بستر چھوڑا۔ تھوڑی دیر

یوگا کیا۔ اس کے بعد فجر کی قضاء نماز ادا کی نماز کے قضا ہونے کا احساس' احساس جرم کی طرح تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر ناشتہ تیار کیا۔

دو انڈے۔ براؤن ڈبل روٹی پر چیز کے ٹکڑے ان پر شہد آدھا سیر گرم گائے کا دودھ جب اس ناشتہ سے پیٹ بھر گیا تو اسے ہضم کرنے پھر گھر سے ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔ جلدی سے واپس آیا کیونکہ ریڈیو سے صبح کی خبریں سننا تھیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے خصوصاً" مسلم ممالک اور ہندوستان اور پاکستان میں' ریڈیو کی خبریں پندرہ منٹ میں ختم ہو گئیں تو ریڈیو پر دوسرا پروگرام شروع ہوا جو مجھے پسند نہ آیا۔ دوسرا اسٹیشن سننا چاہا وہاں پوپ موسیقی ہو رہی تھی' جہاں چیخنے چلانے اور اودھم کے سوا مجھے کچھ نہ ملا۔ ریڈیو بند کیا ٹیلی ویژن کھولا۔ اس کے پروگرام سے بھی طبیعت کو کچھ نہ ملا۔ چھٹی کا دن تھا پھر Heath کی سیر کو نکل گیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچہ پناہ کے لئے ماں کے پاس چلا جاتا ہے۔

ہمپسٹیڈ میں جس گلی میں میرا گھر ہے اس سے ملی ہوئی گلی میں انگریزی کے مشہور شاعر Keat کا گھر ہے جسے اب لائبریری اور میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میں نئی کتابوں کی تلاش میں اس لائبریری میں بھی گیا۔ کوئی نئی کتاب نہ ملی تو لائبریری کے باہر آیا تو برسات کی پھورا شروع ہو گئی' لیکن موسم گرما کی خوشگوار ہوا تھی اس کے جھونکے کھا کر سیدھا Heath کی طرف چل دیا۔ Heath کا تالاب Keat کے گھر سے دور نہیں وہاں پہنچ کر تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جو بوندیں پڑ رہی تھیں' اس سے لہریں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی طرح اچھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور انہی لہروں کے قریب بطخیں تیر رہی تھیں۔ پیڑ بھی سر جھکائے کھڑے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے وہ بھی کبھی کبھی لہرانے لگتے۔ تالاب کے کنارے کچھ کبوتر اور چڑیاں اپنے پروں کو پھیلائے اس بوندا باندی سے لطف لے رہی تھیں' اس منظر سے بڑا لطف اٹھایا اور اس لطف کی خاطر وہیں مینہ میں بھیگتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تالاب کے کنارے کنارے ٹہلنا شروع کیا۔ راستے میں مجھے دو کتے ملے۔ اس وقت وہ بھی موج میں تھے۔ دل بہلانے کی خاطر دونوں میری طرف آئے ان کے بھیگے بالوں سے اپنے کپڑے ضرور بچائے کیونکہ مجھے ظہر کی نماز ادا کرنی تھی۔ لیکن یہ دونوں کتے دوستی کا جذبہ لے کر میرے قریب آئے تھے۔ میں نے

ان دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر انہیں پیار کیا تو وہ دم ہلا کر مجھ سے چمٹنے لگے تو اپنے کپڑے کو میں نے ان کے بھیگے ہوئے بالوں سے پھر بچایا اور ان کی زبان سے اپنے ہاتھ کو بچا کر ان کے سروں کو تھپتھپاتا رہا۔ ذرا فاصلے پر ان دونوں کتوں کی ادھیڑ عمر کی انگریز مالکہ محبت کے اس کھیل کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ جب کتوں کے لپٹنے چمٹنے سے میں نے خود کو بچایا تو مالکہ کو بڑا ناگوار گزرا لیکن ان دونوں کتوں نے میری محبت کو محسوس کرلیا تھا اس لئے آواز کو سننے کے باوجود زبانیں نکالے مجھے دیکھتے رہے مالکہ کی زور کی آواز پھر آئی تو دونوں نے اپنی مالکہ کو دیکھا میں نے پھر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور وہ انسانی محبت کے آخری لمس کو محسوس کرکے چھلانگیں لگاتے ہوئے اپنی مالکہ کے پاس پہنچ گئے۔

۱۶ جولائی ۱۹۷۹ء

ہمپسٹیڈ فنکاروں کی بستی ہے۔ نہ صرف انگریزی زبان کے مشہور شاعروں ادیبوں اور مصوروں نے یہاں اپنی دنیا بسائی ہے بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کے مشہور دانشور بھی اپنا وقت یہاں گزار چکے ہیں۔ کارل مارکس کی قبر اسی بستی کے پچھواڑے ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، ڈی۔ ایچ لارنس بھی اسی محلّہ کی گلیوں میں رہے ہیں۔ اسی بستی کے چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب خانے ان دانشوروں اور فنکاروں کی آماجگاہ بنتے رہتے ہیں۔ ہمپسٹیڈ کے انہی مشہور ریستورانوں میں Kukuruz ریستوران بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس ریستوران کی اہم خصوصیت اس کا نام Kurt Pomatze ہے۔ آسٹریا کے کیک اور کافی اس کا مالک آسٹریا کا ایک خوبصورت شہری بڑے دلچسپ ہیں۔ یہاں آنے والوں میں ادیب، شاعر، صحافی، مصور، دانشور، پروفیسر، موسیقار، اداکار سب ہی شامل ہیں۔ سہ پہر یہاں بڑی دلفریب ہوتی ہے۔ ان ہی شخصیتوں میں ایک بزرگ مصور Mr. Dachinger بھی ہیں۔ ذرا دبتا ہوا رنگ۔ نہایت ملنسار، مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہلکی دھوپ کی طرح پھیلی رہتی ہے۔ ہمپسٹیڈ کی بہت سی خوبصورت لڑکیوں کے یہ محبوب ہیں۔ وہ ساری خوبصورت لڑکیاں جن کے بوسوں کے لئے یہاں نوجوان ترستے رہتے ہیں۔ وہ اس ریستوران میں داخل ہوتے ہی Mr. Dachinger کو چومتی ہیں۔ اس وقت اگر ان کا موڈ اچھا ہوا تو ان میں سے کسی لڑکی کو منتخب کرکے اس کی تصویر بناتے

رہتے ہیں۔ لیکن اس تصویر کو وہ فروخت نہیں کرتے۔ ان کی تصویروں کی نمائش آسٹریا کے شہر Gmunden (جہاں وہ پیدا ہوئے) میں ہوتی ہے اس کے علاوہ لندن میں مسٹر ڈا خنگر کی بیوی بھی مصور ہیں لیکن انہیں پھولوں اور ترکاریوں سے دلچسپی ہے (بلکہ عشق کہئے) پھولوں کو وہ ایک عورت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کی تصویر بنا کر اس پھول کو زندوں میں شامل کردیتی ہیں۔ لیکن مسٹر ڈا خنگر کو انسانی چہروں سے دلچسپی ہے۔ چہروں پر کیفیات کا مطالعہ تصویروں میں ان کا موضوع ہوتا ہے ویسے تو ان کی کئی کامیاب تصویریں ہیں لیکن ان ساری تصویروں میں ایک کلاسیکی حسن رکھنے والی آسٹریا کی لڑکی Miss Caludia کی تصویر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا جسم' اس پر ڈھیلا ڈھالا سادہ لباس' صورت و سیرت میں فرشتوں کی سی معصومیت اس حسین عورت کا جمال و جلال سایوں کی طرح اس کے چہرے پر نمایاں ہے۔ بڑی نیک طبیعت مضبوط قوت ارادی کی مالک خاتون مگر ذرا الجھی ہوئی جس کی وجہ سے گہری اداس آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی۔ جب کبھی وہ خوش ہوتی تو اس کے قہقہوں میں جل ترنگ کا سر بجنے لگتا ہے اور گہری آنکھوں میں گرمیوں کے خوبصورت آسمان کی سی وسعت پیدا ہو جاتی ہے لیکن خوشی اس کے حصہ میں بہت ہی کم آتی ہے کیونکہ اسے ابھی تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندگی سے کیا چاہتی ہے۔ ان دنوں ہمپسٹیڈ کے بیکار دانشور اور فنکار بیکاری کی وجہ سے اپنا زیادہ وقت خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ گزارتے ہیں Mr. Peter Sinclaew جنہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے علاوہ دس زبانوں کے ماہر ایک مشہور صحافی کے لخت جگر۔ اچھے شاعر' عمدہ موسیقار' عورتوں کے شوقین نہایت فیاض ملنسار اور زود حس' اپنی محبوباؤں کے خطوط اور اپنی بیاض اکثر کھوتے رہتے ہیں' لیکن ان کی وہ ڈائری جن میں ان کی محبوباؤں کے فون نمبر ہیں وہ ضرور ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر کبھی ان کا کوئی دوست ان کے گھر چلا جائے تو ان کی نیک طینت والدہ مہمان کے لئے چائے اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کیک ضرور پیش کرتی ہیں۔ مسٹر پیٹر بھی ہمپسٹیڈ کے اس سرکل کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ مسٹر ڈا خنگر نے انہیں بھی اپنے آرٹ کا موضوع بنایا ہے۔

ہمارے بزرگ مصور کی عمر اس وقت ۷۱ برس کی ہے لیکن پابندی سے اپنے مقررہ

وقت پر وہ اس ریستوران میں داخل ہوتے ہیں جو جاننے والے ہیں وہ انہیں سلام کرتے ہیں۔ وہ ان سارے سلاموں سے خوش ہوکر اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں لوگوں کا جائزہ لیتے ہیں جو چہرہ انہیں متاثر کرتا ہے اس کے قریب جاکر نہایت شائستگی اور اپنائیت سے اس کی تصویر بنانے کی درخواست کرتے ہیں۔ یورپ میں ایک آرٹسٹ کا ماڈل بننے سے کون انکار کرسکتا ہے۔ خصوصاً" خوبصورت عورتیں کیونکہ یہ تو یہاں ایک طرح کا اعزاز ہے۔ اپنے مخاطب کی تصویر بنانے سے پہلے وہ اسے کچھ پینے کی پیشکش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی تخلیق میں مصروف ہو جاتے ہیں جب وہ اپنا قلم اٹھاتے ہیں تو سوائے اپنے موضوع کے کسی اور طرف دھیان نہیں دیتے۔

لوگوں کے چہروں میں ان کی اصل شخصیت کو تلاش کرنے کا انہیں سلیقہ ہی نہیں بلکہ ملکہ حاصل ہے لیکن مخاطب کی شخصیت کی تخلیق میں جس شفقت اور انسان دوستی کا وہ ثبوت دیتے ہیں وہ ان کی ذات کا حصہ ہے۔ ان کی شرافت نیک طینت مخاطب کی کریہہ صورت میں وہ تاثر جو اس کے افعال اور خیالات سے اس کے چہرے اور حرکات میں پیوست ہوگئی ہے۔ اس کا اظہار بھی بڑی شفقت سے کرتے ہیں۔ مسٹر ڈا خنگر ان دنوں بڑے بیمار ہیں جسم کے مختلف حصوں میں کربناک درد رہتا ہے۔

اس وقت اس درد سے گھبرا کر وہ موت کو ترجیح دیتے ہیں کہ کاش انہیں اس وقت موت آجائے تو انہیں اس درد سے نجات ملے۔ جب یہ درد دور ہو جاتا ہے تو اسے بھول کر پھر کیفے میں آجاتے ہیں۔ اس وقت ان میں تصویر بنانے کی سکت ہوتی ہے تو اپنی تخلیق میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے قابل نہیں ہوتے تو اپنے جاننے والوں سے گفتگو کرکے زندہ رہنے کا لطف لیتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"جب تک زندہ رہو زندگی کا لطف حاصل کرو۔" ڈا خنگر صاحب کو کینسر ہے ڈاکٹر نے انہیں صرف زندگی کے ۳ مہینے اور دیئے ہیں لیکن اس قلیل مدت کی انہیں فکر نہیں انہیں موت سے زیادہ درد سے ڈر لگتا ہے ان کے مثانے میں کینسر تھا اس کا آپریشن ہوا اس آپریشن سے جو درد اور تکلیف انہیں ہوئی اسے برداشت کیا۔ وہ تجربہ ان کے ذہن میں ابھی تک زندہ ہے۔ پھر بیمار پڑے۔ ڈاکٹر نے انہیں پھر آپریشن کا مشورہ دیا جسے انہوں نے قبول نہ کیا۔ درد ہوتا ہے تو بستر پر پڑے رہتے ہیں جب اس سے نجات ملتی ہے تو درد

اور موت دونوں کو بھول کر اپنے مقررہ وقت پر اس ریسٹورنٹ میں آجاتے ہیں۔ اور کچھ تصویریں بناکر شام کو ٹھیک ٦ بجے ریستوران کو چھوڑ کر اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی شام کو کھانا پکاکر گھر پر ان کا انتظار کرتی ہے۔ دونوں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔

اس مصروفیت میں انہیں نیند آجاتی ہے۔ دوسرا دن پھر شروع ہوتا ہے وہ پھر یہاں آجاتے ہیں۔ ان دنوں ہمپسٹیڈ کی حیثیت بالکل جزیرے کی سی ہوکر رہ گئی ہے۔ فنکار اور دانشور یہاں برسوں سے رہے ہیں انگریزی کے مشہور شاعر Keat جارج اور ویل مشہور روسی رقاصہ Pavldva' D-H-Lawrence ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا گھر بھی اسی بستی کے ایک کونے میں ہے۔ ان دنوں خوابوں اور رومان سے دلچسپی رکھنے والے جو یورپ کی مصروف زندگی سے گھبراکر یہاں آتے رہتے ہیں۔ اس بستی کا ماحول' اس کے لوگ' اس کے کیفے' ان کی دیواروں پر بدھ مت' ہندومت' یوگا' صوفی لوگوں کے پیغامات کے اشتہارات اور یورپ میں موسیقی کی تقریبات کی اطلاع وغیرہ یہاں کا خاصا ہے۔ انڈوپاکستانی کھانوں کے بھی یہاں کافی ریستوران ہیں جہاں سالن کی تیز نشہ آور خوشبو اس کے ساتھ مشرق کا ماحول۔ محرابوں میں قندیلیں۔ دیواروں پر تاج محل اور دوسری مشہور عالم تاریخی عمارتوں کی تصویریں' قندیلوں کی دھیمی روشنی۔ ٹیبلوں پر سرخ کپڑے۔ یورپی کے لئے ایسے ماحول میں بیٹھ کر بریانی' تنوری روٹی' بھنا ہوا گوشت کھانا ایک ایسا تجربہ ہے جو عرصہ تک اس کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ عموماً" ہمارے کھانے یہاں انگریز اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگ اور فنکار کھاتے ہیں۔

ہمپسٹیڈ میں کہیں کہیں دیسی ریستورانوں میں مغربی لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے ان دنوں یورپ اور امریکہ میں چینی اور انڈوپاکستانی کھانے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے کھانے بن چکے ہیں لیکن بڑے مہنگے' اس کے علاوہ عرب کی عورتوں کے لباس۔ مشرقی زیورات انگریزی اور یورپی جدید تعلیم یافتہ عورتوں کا محبوب لباس بن چکا ہے۔ ذہنی سکون اور مرنے کی تلاش کے لئے یوگا' صوفی ازم' بدھ مت۔ گرمیوں کے مہینے میں موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے عربی لباس اور کرتے' ہمپسٹیڈ میں یہ ساری چیزیں آپ کو ملیں گی۔ گرمیوں کے زمانے میں ہفتے اور اتوار کے روز ہمپسٹیڈ کے تالاب کے کنارے آرٹ

اور کرافٹ کا میلہ لگتا ہے۔ فنکار اپنی بنائی ہوئی تصویریں' مجسّمے' زیورات اور دوسری چیزیں بناکر فروخت کرنے کے لئے ہمپسٹیڈ کے اس میلے میں آتے ہیں۔ آرٹ اور کرافٹ کے شیدائی فراخدلی سے ان چیزوں کی قیمت ادا کرکے انہیں اپنے گھروں کی سجاوٹ کے لئے لے جاتے ہیں۔

اس مادی تحفظ اور اس کی پیدا کردہ تنہائی کے زمانے میں ہمپسٹیڈ کی بستی جو اب بدل کر صرف ایک جزیرہ ہی نہیں بنی بلکہ ان دنوں اس کی حیثیت ایک گھر کی سی ہو گئی ہے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے کیفے اور شراب خانے ایک پرانی حویلی کی مختلف کھولیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ جدید مغربی زندگی میں کیفے' ہوٹل اور شراب خانے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ہمارے زمانے کے صنعتی نظام سرمایہ داری نے خاندان اور گرہستی کے تصورات کو جس طرح پارہ پارہ کیا ہے اس کی علامات یہاں بڑی نمایاں ہیں۔ ان دنوں یہاں گھروں سے زیادہ یہ طرح طرح کے خانے آباد ہیں۔ انہی ہنگاموں اور روشنیوں میں یہاں کی نسل کے ساتھ ہمارے کھاتے پیتے گھروں کے لوگ بھی پروان چڑھے جو مغرب میں تعلیم کی غرض سے آئے تھے۔ اس تعلیم نے ان کی کونسی تخلیقی اہمیت کو ابھار کر پروان چڑھایا وہ تو مجھے ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ البتہ ان کے غرور اور نوکرشاہی ذہنیت سے جو نقصان ہمیں اپنے وطن میں اٹھانا پڑا اس کی یادیں تاریخ میں محفوظ ہی نہیں بلکہ وہ ہماری اجتماعی زندگی میں ابھی تک ہمارا سائے کی طرح تعاقب کر رہی ہیں لیکن ہم تو بہت سی ناانصافیوں کی طرح اس کو بھی سہنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ البتہ ہمارے قومی شاعر اکبر الہ آبادی کو اس نسل کے یہ لچھن بالکل پسند نہ آئے تو اپنے احتجاج کا شعر میں اس طرح اظہار کیا۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

اس شعر میں اس تہذیب کا آغاز ہی نہیں بلکہ دردناک انجام بھی موجود ہے۔ لیکن جس تہذیب میں یہ سفر شروع ہوا اس کے انجام کا ابھی پتہ نہیں۔ معیار زندگی بڑھ چکا ہے گھروں میں عیش و عشرت کے ساتھ کشادگی بھی آچکی ہے لیکن اس کے باسیوں کے خوبصورت چیزوں اور عشرتوں سے سجے ہوئے گھر یہاں کے لوگوں کے دلوں کی طرح ویران ہیں۔ اس ویرانی کو وہ جتنا دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کوششوں سے اور

بڑھنے لگتی ہے۔ اس لئے گھر اور دل کی ویرانی سے گھبرا کر وہ جنگلوں' کھیتوں اور شراب خانوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ہمپسٹیڈ میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔

آج مغرب کی مادی تہذیب سے اکتائے ہوئے لوگ پھر ایسے گھر بنانے اور بسانے میں مصروف ہیں جہاں دوسری انسانی شکایتیں اور غم تو ہوں لیکن تنہائی اور انسانی بے تعلقی نہ ہو۔

ایک دن مسٹر ڈا خنگر Kururuz ریستوران میں اپنے مقررہ وقت پر نہ آئے بلکہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لندن کے قریب ایک جنگل میں سکون ڈھونڈنے چلے گئے۔ ریستوران میں ان کا بڑا انتظار رہا۔ ان انتظار کرنے والوں میں Miss Aola بھی تھیں۔ انتظار کی کوفت جب انہیں ستانے لگی تو مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "میرا خیال ہے اگر میں بیمار ہو جاؤں تو Mr. Jame-s-Hamilton اور مسٹر ڈا خنگر مجھے دیکھنے ضرور آئیں گے" لیکن اس وقت اپنے دل کی بات کہتے ہوئے جو اعتماد ان کے الفاظ میں تھا وہ محترمہ کی آنکھوں اور لب و لہجہ میں نہ تھا۔

(لندن ۱۹۸۲ء)

پتھر زندہ ہے

گھریلو ذمہ داریوں کے مقدس احساس کو نت نئے خیالات اور یورپ کے عیش و عشرت نے اور کمزور کردیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے اپنا مسلمان معاشرہ اور اس کی تہذیبی قدریں جہالت آمیز معلوم ہونے لگیں اور ان سب روحانی قدروں کو پرانے کپڑے کی طرح پھینک کر ایمان اور یقین سے خالی عشرت کی تمنا لے کر میں یورپ کی معاشی جدوجہد ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔

"میں تم سے پوچھوں ایمانداری سے بتاؤ گے؟"۔

"ان تین برسوں کی دوستی میں تم نے مجھے کیسا پایا؟"۔

"مجھے تمہارے خلوص پر اعتماد ہے اسی لئے تو اس ہفتے میں دو مرتبہ تمہیں فون کرکے بور کرنے تمہارے گھر چلا آیا' مجھے تمہاری مصروفیت کار کا خیال تھا مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ جب میں تمہارے پاس آؤں گا تو تم اپنا سارا لکھنا پڑھنا چھوڑ کر ایک ماں کی طرح ہوگے جو اپنے بچے کو پریشان دیکھ کر اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر اس کی دلجوئی کی کوشش کرتی ہے' تم نے ان تین برسوں کی دوستی میں میرے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اس لئے اس شہر میں جب میں کوئی چوٹ کھاتا ہوں تو سوائے تمہارے مجھے یہاں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ تمہیں معلوم ہے مجھے گھر سے نکلے ہوئے آج ۹ برس ہوگئے۔ میرے والد

صاحب اس سفر کے خلاف تھے اور وہ کہتے تھے کہ صرف دولت کے لئے اپنی ساری زندگی ضائع نہ کرو۔ مجھے ان کا یہ مشورہ کچھ عجیب اور دقیانوسی سا لگا اور اس وقت اپنی جواں سال امنگوں کی موجودگی میں اسے مشرق کی دلفریب جہالت سمجھ کر رد کردیا۔ پھر میں اپنی ماں کے پاس آیا کیونکہ لندن کے سفر کے لئے پیسے تو انہیں سے لینے تھے۔ ان کے سامنے اپنی زندگی جہاں دفتر کے مقررہ دو سو روپے کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آتا تھا اور اپنے گاؤں والوں کی زندگی جو اس وقت لندن میں تھے' تھی۔

میری دو بہنیں بھی اسکول میں تھیں۔ امی میرے باپ کی طرح آئیڈیلسٹ نہ تھیں انہیں معلوم تھا کہ بیٹیوں کے لئے اچھا گھر تلاش کرنے کے لئے ان کی تعلیم اور میرا لندن کا سفر نہایت ضروری ہیں۔ تھوڑی سی کشمکش کچھ سوچ بچار اور اس کے بعد آخر میں دو سال کے بعد لوٹ آنے کا وعدہ۔ ان ساری چیزوں نے جب میری ماں کو مطمئن کردیا تو پھر انہوں نے مجھے اپنا زیور دے دیا جسے میں نے بازار لے جاکر فروخت کردیا جو پیسے میں نے جمع کئے تھے۔ ان سب کو ملا کر جہاز کا ٹکٹ خریدا اور دولت کے اس شہر میں آگیا۔ جس کے متعلق پاکستان کے ہر رہنے والے کا خیال ہے کہ یہاں دولت پھلوں کی طرح پیڑوں میں لدی رہتی ہے کہ ضرورت مند آئے اور سونے سے اپنی جھولی بھرے۔

ابھی مجھے لندن میں ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ والدہ کا خط آیا کہ جلد سے جلد روپیہ روانہ کرو۔ والد کی طبیعت خراب ہے اور لاہور میں جو مکان ہے اس کا ٹیکس بھی ادا کرنا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۶۲ء کا زمانہ لندن میں کیسا تھا بیکاری' برف اور چیچک کی وبا' ایسی حالت میں کام کا کیا سوال۔ میں تو اپنے کالے رنگ کی وجہ سے کسی ایسے گوشہ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں مجھے لوگ گھور گھور کر نہ دیکھیں' جیسے میں ہی اس ملک میں چیچک کی وبا لایا ہوں۔ کام سے پہلے میں رہنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا لوگوں سے پوچھا کہ میرے ہم وطن کہاں رہتے ہیں تو وہ ان گھروں کی طرف اشارہ کردیتے جہاں دو دن کی کچھ خالی گندی بوتلیں اوندھی پڑی ہوئی ہوتیں میں وہاں جاکر دروازہ کھٹکھٹاتا مالک مکان باہر آتا میں اپنا مدعا ظاہر کرتا وہ معذرت پیش کرکے چلا جاتا۔ پھر میں دوسرے گھر کی تلاش کرتا آخر جب برف کے ریگستان میں چلتے چلتے میرے پیر تھک کر کانپنے لگے تو مجھے بھوک

لگی میں وہیں ایک ریستوران کی طرف بڑھا اور سب سے پہلے جھانک کر دیکھا کہ یہ کوئی قیمتی ریستوران تو نہیں کیونکہ اس وقت انگریزوں کے ساتھ اچھے ریستوران میں بیٹھنے کی مجھ میں جرات نہ تھی اور پھر کچھ اخراجات کا بھی خوف تھا اس لئے جب ریستوران میں جھانک کر دیکھا کہ وہ کوئی اونچا ریستوران نہیں' میری طرح میلے کچیلے کپڑوں میں انگریز مزدور بیٹھے کچھ کھا پی رہے ہیں اور دو چار میرے بھائی بند۔ اپنے بھائیوں کو دیکھ کر میری ہمت بڑھی اور میں اس ریستوران میں داخل ہوتے ہی مشرقی پاکستان کے ایک بنگالی مسلمان کے پاس بیٹھ گیا' مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بھی مسکرایا میں نے سلام کیا اس نے تپاک سے جواب دے کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ذرا ہمت بڑھی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مغربی پاکستان جہلم کے قریب میرا گاؤں ہے"۔

"اچھا میں بھی پاکستانی ہوں"۔

"ہاں تم چہرے سے معلوم ہو رہے ہو"۔

"اس پر وہ ہنسا۔ اچھا۔ الحمداللہ"۔

"تم کب آئے"۔

"پرسوں لیکن اب میں رہنے کے لئے مکان تلاش کر رہا ہوں کیونکہ جہاں میں رہتا تھا وہاں جگہ نہیں۔" پہلے تو وہ سوچ میں پڑ گیا اس کے بعد اس نے کہا۔ "اچھا تم کھانا کھانے کے بعد میرے ساتھ چلو"۔

"بہت بہت شکریہ"۔

میں نے یہاں کھانا نہ کھایا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہاں غیرذبیحہ کا گوشت اور سور ہوتا ہے اس لئے دو چائے منگائی اس نے چائے کے لئے منع کیا۔ لیکن میرے خلوص آمیر اصرار پر وہ راضی ہو گیا۔

چائے کے بعد وہ اپنے گھر آیا مجھے سلہٹ کے ایک نوجوان مالک مکان سے ملایا اس نے میری طرف دیکھا محبت سے مسکرایا اور اس کے بعد مجھے اپنے کچن میں جو صوفہ پڑا تھا وہاں ٹھہرنے کو جگہ دے دی۔ صبح جب وہ کام پر جاتا تو ناشتے کے لئے مجھے اوپر سے اپنے کمرے میں لاتا' ناشتہ کراتا۔ ان ایجنسیوں کا پتہ بتاتا جہاں سے مجھے ہوٹلوں میں برتن

دھونے کا کام مل سکتا۔

لیکن اس وقت چیچک کی وبا کی وجہ سے اب کالوں کو ریستورانوں میں بھی مشکل سے جگہ ملتی۔ ہر روز جب میں گھر واپس آتا تو بڑا اداس ہوتا۔ میری اس وقت کی اداسی میں کئی چیزیں شامل تھیں یقیناً مجھے اپنے باپ سے بہت سی باتوں میں اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ان سے محبت تھی ان کے کردار میں جو ایثار اور خلوص تھا ان کے احترام اس بیکاری اور تنہائی کی زندگی میں والد صاحب کی یہ ساری باتیں یاد آتیں تو ان کے لئے دل تڑپتا اور میں سوچتا کہ آخر میں ان کی کیسے خدمت کروں ایک دن میں جب انگریزی اخبار پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو پھر لندن کی تنہائی نے مجھ پر شدید حملہ کیا اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میں نے پھر والدہ کا خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا تاکہ جسمانی طور پر نہیں تو ذہنی اور جذباتی طور پر تو میں اپنے ماں باپ اور عزیزوں سے اپنے معاشرے میں مل سکوں۔ میرا یہ بنگالی دوست اپنا کھانا پکا کر اس کمرے میں آیا اور میرے ہاتھ میں اس خط کو دیکھ کر پوچھا۔

"کیا خط گھر سے آیا ہے۔ پاکستان کی کیا حالت ہے"۔

"اللہ کا شکر ہے"۔

"کوئی خاص بات!" میرے جواب میں جو اداسی تھی اس سے اسے ذرا تشویش ہوئی۔

"نہیں بتاؤ، ہم مسلمان ہیں اور پھر ہمارا وطن بھی ایک ہے"۔

"لیکن یہاں....." میں اپنی بات پوری نہ کرسکا تو اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میرے پاس کچھ پیسے ہیں تم اسے بھیج دو اور جب تم کام پر لگ جاؤ گے تو مجھے واپس کر دینا"۔

اس کے اس جواب پر میری عجیب حالت تھی میں اسے بیان نہیں کرسکتا اب صرف اتنا یاد ہے کہ اس وقت اتنا ضرور چاہتا تھا کہ اسے گلے سے لگالوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی اس کیفیت کو زندگی میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس کیفیت نے ان دنوں مجھے بڑا سہارا دیا۔

پیسے میں نے گھر بھیج دیئے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھوڑے دنوں کے بعد ہمارے مالک مکان نے ایک ہندو بنگالی کو میری طرح اور پناہ دی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ

ایسا ہی سلوک۔ میرے اور مالک مکان کے درمیان دین مشترک تھا اور اس بنگالی کے درمیان بنگلہ زبان جب رات کو باورچی خانے میں کھانے پر محفل جمتی تو ایک زندگی پیدا ہو جاتی۔ اس گھر میں جتنے لوگ تھے سب ریستورانوں اور ہوٹلوں میں کام کرتے۔ صرف ہم دو بیکار تھے اس لئے چائے کے بعد سب کے ساتھ ہم بھی کام کی تلاش میں جاتے۔

ایک دن برف باری شدید ہوئی تو میرے بنگالی دوست نے اپنا چھاتہ بھی مجھے دے دیا اور خود بغیر چھاتے کے کام پر چلا گیا دو ہفتے کے بعد گھر سے والدہ کا خط پھر آیا میرے پیسوں کی وجہ سے گھر میں جو مسرت پھیل گئی تھی اس کا ذکر بھی اس میں تھا اور اس کے بعد مزید روپوں کا مطالبہ' اس مرتبہ اس بیکاری کے زمانے میں یہ مطالبہ مجھے قدرے ناگوار گزرا اور یہ گھریلو ذمہ داری مجھے ذرا بار محسوس ہوئی۔ لیکن جب میں کسی دوسرے کام میں مصروف ہوگیا تو یہ احساس میرے اندر کسی تاریک گوشہ میں گم ہوگیا۔ آخر دو ماہ کے بعد ایک یہودی ریستوران میں برتن دھونے کو مجھے ملازمت ملی۔ لیکن ملازمت سے پہلے اس نے کہا کہ میں پہلے ڈاکٹر سے چیچک سرٹیفکیٹ لے آؤں۔

معاف کرنا خطیب صاحب میں جذبات میں کتنا دور نکل گیا۔ لیکن اپنی زندگی کے اس حصے کے اظہار سے مجھے کچھ ایسا ہی سکون ملتا ہے جیسے تمہاری صحبت میں۔ کیونکہ زندگی کے اس حصے میں ایسے افراد اور تجربات ہیں جو مجھے کبھی کبھی ڈوبنے سے بچا لیتے ہیں۔ حالات جب ذرا معمول پر آئے۔ مجھے ایک فیکٹری میں اچھا کام مل گیا تو میرا یہ ماضی میرے ذہن میں دھندلا پڑنے لگا۔ ان دوستوں کی جگہ چھوڑ کر میں لندن کے ایک اچھے مقام پر آگیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے فون کرکے اپنے پاس بلاتے لیکن اپنی موجودہ دلچسپی اور تمناؤں کی موجودگی میں ان کے پاس جانے کو جی نہ چاہتا۔ اب میرے پاس کچھ پیسے ہوگئے تھے اس لئے ایک صاحب کی شرکت میں ایک مکان بھی خرید لیا جو اس وقت جنت کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس کے آنے سے میری سماجی حیثیت میں کچھ وزن پیدا ہوگیا اور واقعی لوگ میری عزت بھی کرنے لگے لیکن یہ عزت زیادہ دن تک میرا جی نہ بہلا سکی اس کی حیثیت میری زندگی میں ایسی ہوگئی جیسے میرے گھر کی سجاوٹ کے لئے پلاسٹک کے رنگ برنگ پھول۔

میں نے نہیں میرے کسی دوست نے گھر والوں کو بھی اس مکان کے خریدنے کی

اطلاع دے دی! والدہ اور بہنوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ اب لندن میں ہمارا ایک مکان ہے۔ اس خط میں ذرا سی شکایت بھی تھی کہ آخر میں نے انہیں کیوں مطلع نہیں کیا۔ میں اپنی اس مادی کامیابی پر والد صاحب کے رد عمل کو ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس خط میں اور اس کے بعد دوسرے خطوں میں ان کی طرف سے ایک لفظ نہ ملا۔

اس کامیابی کے نشے میں ان کی خاموشی کو میں نے پھر قابل اعتناء نہ سمجھا۔ لیکن اب اس مہم کو سر کرنے کے بعد مجھے گھر کا بار ایک صلیب کی طرح محسوس ہونے لگا۔ کبھی کبھی جب مجھے تھوڑی سی فرصت ملتی تو کچھ خیال آتا کہ آخر میں اس گھر کے بار سے کب سبکدوش ہوں گا۔

ان دنوں سوائے ناگوار احساس کے میرے پاس کوئی واضح خیال نہ تھا۔ لیکن گھریلو ذمہ داری کے اس مقدس احساس کو نت نئے خیالات اور یورپ کے عیش و عشرت نے اور کمزور کردیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مجھے اپنا مسلمان معاشرہ اور اس کی تہذیبی قدریں جہالت آمیز معلوم ہونے لگیں اور میں ان سب روحانی قدروں کو پرانے کپڑوں کی طرح اتار کر ایمان اور یقین سے خالی عشرت کی تمنا لے کر یورپ کی معاشی جدوجہد میں ایک تیز رفتار گھوڑے کی طرح دوڑنے لگا۔ میرے منصوبوں اور جدوجہد نے مجھے مالامال کردیا۔ لیکن اس جدوجہد کے زمانے میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے کوئی ایسی چیز غائب ہوچکی ہے جس کی عدم موجودگی نے لذت احساس ختم کردیا ہے۔ اس وقت میں بہرا نہیں اندھا تھا۔ سب کچھ سنتا' سوچتا' محسوس کرتا لیکن دیکھ نہیں سکتا تھا اسی زمانے میں مجھے پھر وہ لوگ یاد آئے۔ جو ماضی میں میری طرح کامیاب ہوئے تھے' لیکن وہ زندگی کی لذت سے محروم نہ تھے جیسے میں۔ غالباً" ان کے پاس ایمان یا کم از کم اس کا احترام ضرور تھا۔

خطیب صاحب! میرا یہ سفر کچھ دلچسپ ہے کیا اس میں سے اپنی تخلیق کے لئے کچھ لے سکتے ہیں؟

میرے خیال میں اب میری زندگی میں خوشبو سے خالی پھولوں کی طرح کچھ نہیں۔ "میں نے اس طرح کی زندگی گزار کر کوئی نئی بات نہیں پائی۔ آخر میری زندگی میں کیا ہے دھواں --- اور کچھ سوختہ چیزوں کا ڈھانچہ"۔

"اچھا یہ بات ہے میری بربادیوں سے بھی کچھ کام لیا جاسکتا ہے"۔

خطیب صاحب! آج میری تمنا یہی ہے کہ وہی بار مجھے پھر مل جائے جو میں پاکستان سے لے کر یہاں آیا تھا اور تمنا ہے کہ میری زندگی اسی بار کو لئے ختم ہو جائے۔ میں اپنے شریف النفس بوڑھے باپ اور ماں کا سہارا بن سکوں۔ خطیب صاحب! آپ میری ابتدائی زندگی سے واقف نہیں۔ میں ارادوں اور ولولوں سے پر تھا مجھے اپنی ہر چیز پر بڑا اعتماد تھا' میرا جسم' صلاحیت' ایمان سب ہی میرے اندر ایک چٹان کی طرح تھے اور آج کی طرح میں خالی نہ تھا جب میں پاکستان میں تھا تو ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتا اور سب سے آگے رہتا۔

لوگ میری دوستی کی تمنا کرتے۔ آپ سوچئے اس وقت میری کیا عمر ہوگی۔ اس وقت مجھے اپنے دفتر کی یونین کا سیکریٹری بنا دیا گیا'--- ماضی کے یہ سارے نقوش میرے اندر کچھ ایسے بن کر رہ گئے ہیں جیسے تیز آگ میں جھلسے ہوئے انسانی چہرے۔ وہ مکان جس کا میں مالک ہوں۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت چھوٹا سا باغیچہ بھی ہے' انگریزوں کی طرح میں نے اس باغ کی خبرگیری کی تاکہ اس طرح میں اپنے ذوق کی وجہ سے ان کی سوسائٹی میں کچھ قابل توجہ بن سکوں اور اپنے لوگوں سے کچھ علیحدہ ہوسکوں۔ اس خبرگیری' رنگ برنگ پھولوں کی موجودگی میں' یہ گھر میری قبر ہے۔ اس کی تنہائی مجھے کھائے جارہی ہے--- آپ نے میرا استعمال کا کمرہ نہیں دیکھا' جدید عشرت کی کونسی چیز ہے جو اس وقت میرے کمرے میں نہیں۔ بہتری قالین' جدید آرٹسٹوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویریں' بہترین چائنا' ٹیلی ویژن' ٹیپ ریکارڈر' ریفریجریٹر' کتابیں' کچھ لڑکیوں کے خطوط' ان کی تصویریں' دیوان غالب' میرصاحب' کہاں تک گنواؤں میری اس قبر میں نامہ اعمال کی طرح یہ سب موجود ہیں۔ جب تنہائی مجھے ڈبونے کی کوشش کرتی ہے تو میں باری باری سب کا سہارا لیتا ہوں--- لیکن یہ سب بے جان چیزیں ہیں' مجھے تو آدمیوں کی ضرورت ہے جن سے میں باتیں کرسکوں ان کی سن سکوں' ان کی خوشی اور غم میں شریک ہوسکوں۔ اپنا غم ان سے کہہ سکوں لیکن لوگوں کے اس سمندر میں آدمی کہاں' یہاں فرصت کسے' سب ہی دن دفتر اور فیکٹریوں کی نذر کرتے ہیں اور ان کی راتیں انگاروں پر بسر ہوتی ہیں۔

پرسوں میں اپنے غیر دلچسپ کام سے تنگ آکر اپنے نگران سے چھٹی لے کر گھر پر آکے چارپائی پر پڑگیا۔ حالانکہ دن کے وقت میں کبھی چارپائی نہیں پکڑتا۔ وہی یکسانیت جو سالوں سے میرے ساتھ ہے جب اس سے تنگ آگیا تو اس گھر سے بھی نکلا۔ شام کا وقت تھا۔ ہوا بھی ذرا خوشگوار تھی۔ میرے محلے کے پرانے طرز کے مکانات جن کے عقب میں افق کی لالی بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے (اور یہ میرا پسندیدہ منظر ہے کبھی ایسا منظر میرے سامنے آتا ہے تو میں بھوکے اور پیاسے کی طرح اسے اپنی نظروں سے جذب کرنے وہاں کھڑا ہو جاتا ہوں)۔۔۔ لیکن پرسوں مجھے اس منظر نے بھی کچھ نہ دیا' جمعہ کا دن تھا بازار میں خوب گہما گہمی تھی۔ دکانیں روزمرہ ضروریات کے سامان سے لدی اور سجی ہوئی تھیں' مجھے بھی ہفتے بھر کا سامان خریدنا تھا کیونکہ جمعہ اور ہفتے کے دن ضروریات کی چیزیں نہ خریدی جائیں تو پورے ہفتے بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے لیکن اس دن میرا جی کسی قسم کی خریدوفروخت کے لئے تیار نہ تھا۔ بس یہی شدید احساس میرے رگ وپے میں سمایا ہوا تھا کہ اس یکسانیت کے شکنجے سے کسی طرح آزادی حاصل کروں۔

ابھی میں اپنے گھر سے تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ مجھے ایک پاکستانی جاننے والے ملے مجھے دیکھتے ہی وہ پھول کی طرح کھل گئے انہیں مسکراتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی مسکرانا پڑا۔ مسکراہٹ سے ان کی ہمت بڑھی وہ کھڑے ہو کر احوال پوچھنے لگے اس وقت میں نے بھی وہی کہہ دیا جو عموماً" یہاں لوگ ایک دوسرے سے ملتے وقت کہہ دیا کرتے ہیں۔

"تو آؤ گھر چلو؟" میرے جواب سے جب ان کی ہمت بڑھی تو انہوں نے مجھے مدعو کیا ان کی اس دعوت پر میرا موڈ بگڑ گیا اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے برسوں کی قید کے بعد پھر مجھے کوئی قید کرنے چہار دیواری لے جا رہا ہو۔

"بھئی میں گھر سے ہی آرہا ہوں اور تمہارے گھر کی چاردیواری میرے گھر کی چاردیواری سے کب مختلف ہوگی؟ اس پر بھی خوبصورت پھولوں والا کاغذ لگا ہوگا جو میرے گھر کی دیواروں پر لگے ہوئے کاغذ سے صرف رنگ اور ڈیزائن میں مختلف ہوگا۔" میں نے ذرا درشتی سے جواب دیا۔

"ارے بھئی چلو تو سہی' میرے پاس کچھ ہندوستانی اور پاکستانی ریکارڈ ہیں۔" ان صاحب نے مسکراتے ہوئے پھر بے تکلفی سے اصرار کیا۔

"صاحب وہ میرے پاس بھی ہیں"۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے' کہاں وقت صرف کرو گے؟ یہ بازار تو بہت چھوٹا سا ہے"۔

"لیکن سڑک تو چھوٹی نہیں۔ میں اسی پر چلنا شروع کردوں گا۔ اس چلنے سے کچھ حرکت کا تو احساس ہو گا۔ نئی نئی چیزیں تو سامنے آئیں گی"۔

"ارے چھوڑے یار کیسی باتیں کر رہے ہو' آج چھٹی کا دن ہے۔ اسے تو خوشی میں گزار دو۔ چلو ایک ریستوران میں چلیں وہاں بہت سی اوپیرا لڑکیاں آتی ہیں جو ہماری طرح یہاں پردیسی ہیں شاید کوئی امید بر آئے"۔

ان کی اس دعوت پر میں مسکرا دیا' عورت کے ذکر سے ایک طرح کا انبساط سا محسوس کیا تم جانتے ہو کہ عورت خصوصاً" ایک نوجوان عورت سراب ہے لیکن اس کے باوجود اس کی یاد اور اس کی موجودگی میں ذرا محرومی اور یاسیت کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ اس کے ذکر سے مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ ہم دونوں اب ایک ایسے ریستوران میں چلے آئے جہاں ٹیلی ویژن اور ریکارڈر کے بجائے زندہ موسیقار اپنے گانے بجانے میں مصروف تھے' دیواروں کا رنگ سرخ' کالا اور پیلا تھا کرسیاں ذرا آرام دہ' ٹیبلوں کا ڈیزائن جدید آرٹ کا نمونہ۔ ریستوران لوگوں سے بھرا ہوا تھا جن میں اکثریت نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی تھی' جو موسیقی کی دھن پر اس طرح جھوم رہے تھے جیسے ہوا میں پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیاں۔ جس کی جتنی عمر کم تھی اس کے چہرے پر مسرت اتنی ہی روشن اور باقی جو پکی عمر کے لوگ تھے ان کے چہرے بجھے بجھے حیران اور پریشان' لیکن اس وقت ان چہروں پر بھی جنسی اشتہا چمک اٹھتی' جب ریستوران میں کوئی نوجوان خوبصورت لڑکی داخل ہوتی۔ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ کھڑے جگہ کا انتظار کر رہے تھے کہ کوئی جوڑا اٹھے تو وہ جاکر اس جگہ پر قبضہ جمائیں۔ ہم بھی ان منتظر لوگوں میں جا کھڑے ہوئے اور دوسرے لوگوں کی طرح موسیقی کو نظرانداز کر کے خوبصورت لڑکیوں کے نظارے میں ڈوب گئے۔

یہاں جن لوگوں کے پاس خوبصورت صحت مند لڑکیاں تھیں وہ انہیں بہلانے میں مصروف تھے خود کو دلچسپ بنانے کے لئے مداری کی طرح کرتب پیش کر رہے تھے' کوئی ماچس کی تیلیوں کو ٹیبل پر بچھا کر کسی نئے کھیل کی ابتدا کرتا' کوئی رومال کا عجیب و غریب

کھیل دکھاتا اور کبھی کبھی کسی دانشور کے زوردار مباحثے کا کوئی جان دار سا فقرہ فضاء میں گونج اٹھتا۔ کوئی اپنی دوست لڑکی کو مرعوب کرنے کے لئے دوسرے آدمی سے بحث میں مصروف تھا۔

جن لوگوں کے پاس لڑکیاں نہیں تھیں وہ ان صحت مند لڑکیوں کی رانوں اور پنڈلیوں پر شہوت انگیز تبصرے کر رہے تھے--- یہ مغربی موسیقی میرے لئے ذرا اجنبی تھی کبھی کبھی کسی سر سے جذبات میں ایک خوشگوار ارتعاش ضرور پیدا ہو جاتا۔ جسے اس وقت میں خود نہ سمجھ پاتا لیکن ایک طرح کا انبساط آمیز اشتعال میرے اندر ضرور پیدا ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے سامنے والی جگہ خالی ہوئی تو جلدی سے ہم دونوں ان کرسیوں کی طرف بڑھے اور انہیں ذرا ترتیب سے رکھ کر ان پر بیٹھ گئے تھوڑی دیر بعد ہی ڈنمارک کی سنہری بالوں والی ویٹرس مسکراتی ہوئی ہمارے پاس آئی اس مسکراہٹ کے جواب میں مجھے بھی مسکرانا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ کاروباری ہے لیکن ہے تو ایک عورت کی مسکراہٹ۔ اس وقت اس کا اثر دل پر کچھ رومانی سا ہوا۔ جب وہ آرڈر لے کر چلی گئی تو پھر میری نظر اس جوڑے پر پڑی جو اس بھری محفل میں سب سے بے تعلق ہو کر خوش گپیوں میں مصروف تھا' اس منظر نے پھر میری محرومی کو اکسایا اور اس محرومی کے پیدا کردہ درد سے میرا جسم پھٹنے سا لگا۔

م صاحب' جو اس وقت میرے ساتھ تھے گوری لڑکیوں کے بڑے شوقین تھے اپنے چاروں طرف خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں کچھ جان سی آگئی اور ان سب کا اس وقت کچھ اس طرح جائزہ لینے لگے جیسے کوئی دکان میں کھڑا ہو کر بہت سی چیزوں میں اپنے پسند کی چیز تلاش کر رہا ہو۔ آخر ان سب کے کے جائزے میں ان کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو ایک کونے میں ایک تنہا پرندے کی طرح بیٹھی سگریٹ کے گہرے کش لگا رہی تھی۔ غالباً" جائزہ اس کے ذہن میں بھی تھا' جب اس کی نظر ہمارے پیدائشی عاشق پر پڑی تو وہ مسکرائی۔ م صاحب کی آنکھوں میں ایک شکاری کی سی چمک پیدا ہوئی وہ ذرا کچھ اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اس مسکراہٹ نے م صاحب کو مجھ سے ذرا بے تعلق سا کر دیا۔ لیکن وہ اس لڑکی کے پاس جائیں کیسے وہاں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی آخر تھوڑی دیر بعد ہماری پاس جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے اس لڑکی کو اشارہ کیا' اس اشارے کو پا کر لڑکی نے چند

لمحے ان کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔

کچھ فاصلے پر قبرص کے یونانی مردوں کا گروپ بیٹھا ہوا تھا ان میں سے ایک خوبصورت یونانی اپنی چابیوں کے گچھے سے ٹیبل پر بیٹھا کچھ دائرے بنا رہا تھا۔ ٹیبل پر دائرے بنانے کے دوران کبھی کبھی وہ م صاحب کی جدوجہد پر بھی ایک نظر ڈال لیتا لڑکی نے م صاحب کی دعوت کو رد کردیا تو تھوڑی دیر کے بعد وہ یونانی اپنی ٹیبل سے اٹھا اور اس لڑکی کے پاس نہایت اعتماد اور بے تکلفی سے گیا۔ کھڑے کھڑے اس سے باتیں کیں لڑکی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لی تو اس نے اپنے سنہری سگریٹ کیس کو نکال کر سگریٹ پیش کی لڑکی نے اسے بھی قبول کرلیا تو م صاحب پر ناکامی کا ایک شدید دورہ سا پڑا اور وہ اپنی مشرقی تربیت کو گالیاں دینے لگے جس نے بقول ان کے جھجک اور بوداپن ان میں پیدا کردیا تھا۔ اس وقت مجھے ان کی اس تنقید پر کچھ ہنسی سی ئی اور معاً مجھے احساس ہوا کہ ہم اپنے غیرانسانی مطالبات کے لئے بھی اپنی تہذیب سے کچھ امداد چاہتے ہیں۔

"بھئی تم ہنس کیوں رہے ہو۔" مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے م صاحب اب اس مباحثے کے ذریعے اپنے دل کا غبار مجھ پر اتارنا چاہتے ہیں۔

"بھئی میں ہنسا یوں کہ تم نے مشرقی تہذیب پر بڑا بودا اور خودغرضانہ حملہ کیا۔ ہر تہذیب کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہماری تہذیب عورت کی شمع محفل کی حیثیت ہی کب قبول کرتی ہے جس کے لئے وہ آپ کو تیار کرے اس کے یہاں عورت کی حیثیت ماں' بیٹی' بہن اور بیوی کی ہے"۔

"چھوڑ یار۔ یہ خیالات پاکستان میں کام آسکتے ہیں یہاں رہنا ہے تو اس طرح رہو جیسے لوگ یہاں رہتے ہیں"۔

"بھائی صاحب! یہاں آپ پھر غلط ہیں ظاہری طور طریق کے اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے اس تہذیب کو اس کی روح سمیت قبول کرلیا۔ صرف ظاہری طور و طریق سے دوکان' دفتر اور مجلس میں کچھ کام چل سکتا ہے زندگی کے ہر معاملے میں نہیں"۔

"یار اب ہلکی پھلکی باتیں کرو کام نے ویسے ہی چورا کردیا ہے"۔

وہ لڑکی اس یونانی نوجوان کے ساتھ ریستوران کے باہر آگئی۔ اس کی کار قریب ہی

کھڑی ہوئی تھی اس نے دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھی اور چند لمحوں میں وہ ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

"دیکھو اگر میرے پاس کار ہوتی تو ہر روز ایک لڑکی یہاں سے اٹھاؤں۔" اس لڑکی کے اس طرح چلے جانے پر م صاحب پھر تلملائے۔

"نہیں کار کے ساتھ کچھ اور بھی چاہئے۔" میں نے جواب دیا۔

اس جواب سے م صاحب خاموش ہو کر پھر اس موسیقی کے اشتغال میں ڈوب گئے جس طرح یہاں دوسرے لوگ ڈوبے ہوئے تھے کیونکہ یہاں تو زندگی کے پہئے کو حرکت دینے کے لئے کسی نہ کسی اشتغال کی ضرورت ہے۔

م صاحب پھر خاموش ہو گئے لیکن اس خاموشی نے میرے ساتھ بالکل دوسرا سلوک کیا' عورت اور خوشبو میری زندگی میں ہمیشہ کمزوری کی طرح رہی ہیں۔ بچپن اور لڑکپن کے تجربات نے بڑی جلدی مجھے میری اس کمزوری سے آگاہ کردیا' پھر بچپن سے مجھے تاریخ کی کتابیں پڑھنے کا بھی جنون رہا ہے اس میں جب میں نے دیکھا کہ عورت نے اپنے معمولی اشاروں سے کس طرح تاریخ کی بڑی بڑی ہستیوں کو خاک میں ملاکر راکھ کردیا تو تنہائی میں عورت سے ڈرنے لگتا کیونکہ ان دنوں مجھے بھی کوئی تاریخی شخصیت بننے کا جنون تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کوئی خوبصورت لڑکی میرے قریب سے گزری تو میری عجیب حالت ہو جاتی' اس کی موجودگی میں دل' دماغ سے مختلف نظر آتا اور وہ کسی ایسی سمت جانا چاہتا جہاں نرم لطف جذبات کہر کی طرح ہوں۔ جب یہ کیفیت بھی ایک خیال کی طرح گزر جاتی تو مجھے پھر خیال آتا کہ خدا نے مجھے یہ احساس کیوں دیا' کاش میں ایک عام آدمی کی طرح ہوتا۔ میری خواہشیں بھی عام ہوتیں اور میں اپنی جدوجہد کے ذریعے زندگی میں جلد مطمئن ہو کر ہنسی خوشی زندگی گزار دیتا اور کبھی کبھی یہ احساس جمال میرے لئے وبال جان بن جاتا۔ اس احساس کو دبانے اور کبھی اسے کچلنے کے لئے میں دوسری چیزوں میں دلچسپی لینا شروع کردیتا۔ لیکن اب اس مادی کامیابی کے بعد عورت کی ضرورت میرے اندر دوسرے روپ میں آئی بلکہ ننگی--- صرف اپنے جسمانی حسن اور دلکشی کے ساتھ میں نے اسے حاصل کیا--- لیکن اس حصول میں وہ لذت نہ تھی جو اس کی تمنا میں تھی۔ پھر اس زناکار زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں ایسے سارے

لطیف اور لذیذ احساسات سے محروم ہوگیا' عورت میرے نزدیک کچھ ایسی بن کر رہ گئی جیسے میری زندگی میں چیونگم! تمہیں معلوم ہے میں نے اپنی اس زناکار زندگی میں عورت کو چیونگم سے یوں تشبیہہ دی کہ میں چیونگم چوسنے کا بڑا عادی ہوں۔ اس کے چوسنے سے مجھے کوئی لطف نہیں ملتا۔ صرف حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی کوئی چیز میرے پاس ایسی ہے جس سے جی میں حرکت کا احساس ہوتا ہے میری مصروفیتوں کی وجہ سے یہ تجربہ میری زندگی میں ذرا طویل رہا۔ اس مصروفیت میں کام' حسین لڑکیاں' تفریحات' پیسے' اجنبی دوست' سب ہی کچھ تھے اور ہیں لیکن ان سب کے باوجود میں بڑا تنہا تنہا سا رہتا اور یہ تنہائی میرے اندر ایسے وزنی پتھر کی طرح ہوگئی جسے سمندر میں مردے کو ڈبونے کے لئے استعمال کیا جائے۔ کئی مرتبہ مجھے موت کا مزا چکھنے کا بھی جی چاہا--- لیکن میرے ایمان نے مجھے بچالیا اور مجھ سے کہا اگر تو نے اس طرح اپنی جان دے دی تو خدا تجھے کبھی معاف نہ کرے گا اور جس جلن اور بدمزگی سے تو تنگ آکر جان دے رہا ہے وہ موت کے بعد بھی تیرا پیچھا نہ چھوڑے گی ان دنوں میں نے کچھ دھچکا سا محسوس کیا۔

اور اس دھچکے کے تھوڑے دنوں کے بعد عورت پھر میرے اندر جاگی۔ بحیثیت ایک انسان مونس اور غم گسار انسان کے۔ میری وہ عورت کہاں ہے جس سے مجھے یہ لطیف اور پاکیزہ جذبات مل سکیں۔ مجھے اس کا پتہ نہیں صرف تم ایسے ہو جہاں مجھے ان صفات کی خوشبو سی مل جاتی ہے۔ اس وقت میری داستان کچھ ہیجان کی صورت اختیار کرگئی ہے میرے دوست مجھے اب اس کا احساس ہو رہا ہے کیونکہ اس کے اظہار سے مجھے بھی کچھ سکون مل رہا ہے تم کہیں بور تو نہیں ہوگئے۔

"ایسا نہ سوچو تمہارا یہ تجربہ مجھے کسی دوسری سمت اشارہ کر رہا ہے۔" میں نے بڑا مختصر سا جواب دیا کیونکہ میں اس وقت اپنے خیالات ظاہر کرکے اسے دوسری طرف لے جانا نہیں چاہتا تھا۔

"ہاں تو میں ریستوران کی بات کر رہا تھا اس کا دلچسپ اختتام تو تم نے سنا ہی نہیں۔ اس ریستوران میں اس وقت کچھ لڑکیوں نے میری طرف بھی دیکھا ان نظروں میں کچھ اجنبی تجسس تھا اور کچھ میں چاہت بعض میں طلب تحسین۔ لیکن ان نظروں میں کوئی نظر ایسی نہ تھی جس میں میری ضرورت ہو۔ اس وقت میں نے ان نظروں میں سے کسی نظر کا

جواب نہیں دیا تو وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہو گئیں وہاں انہیں وہ سب کچھ ملا جس کے لئے وہ اس ریستوران میں آئی تھیں اس رویئے کا مجھ پر بڑا شدید ردعمل ہوا اور مجھے احساس ہوا کہ اب زندگی میں شاید میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اس لمحے اپنی ذات پر سے میرا اعتماد اٹھنے لگا' میرا دم گھٹنے لگا۔ اس طرح ڈوبنے سے بچنے کے لئے میں چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا شعور مجھ پر حاوی تھا اس لئے میں اس چیخ کو پی گیا۔ اس جذبے کو دبانے کے بعد مجھے پھر اپنے اکیلے پن کا شدید احساس ہوا اب میں وہاں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا وقت کافی ہو چکا تھا موسیقی بھی دم توڑ رہی تھی۔ لوگوں نے اب آہستہ آہستہ جانا شروع کردیا اور اب ان لوگوں نے یہاں آنا شروع کیا جو شراب خانے بند ہو جانے کے بعد یہاں بیٹھنا چاہتے تھے کیونکہ کل ہفتہ تھا اور کام پر ان میں سے بہت سوں کو نہیں جانا تھا۔

"چلو بھئی اب بڑی دیر ہو گئی"۔

"کیا بور ہو گئے۔" میرے دوست نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تم ایسا ہی سمجھو"۔

"اچھا تمہاری مرضی"۔

آخرم صاحب کو لے کر میں ریستوران کے باہر نکل آیا۔ باہر آکر تازہ ہوا ملی' کچھ فرحت کا احساس ہوا۔

"اب کیا ارادہ ہے۔" م صاحب نے پھر پوچھا۔

میری اس مجبوری پر (جس میں ان کی اپنی مجبوری اور محرومی بھی شامل تھی) انہیں ہنسی آگئی ہم دونوں فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ ضرور چلتے رہے۔ آپس میں کوئی بات نہ کی کیونکہ سوائے دکھ کے ہمارے پاس اس وقت تھا کیا۔ جب میری گلی کا موڑ آیا تو میں رکا۔ میرے دوست نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا صرف مسکرایا۔ حسب عادت اس کا جواب میں نے بھی مسکراہٹ سے دیا اور سلام کرکے دونوں پھر اپنے کمروں کی تنہائی کی طرف چل دیئے۔

اس رات میں سو نہ سکا مجھے پھر سارے ارادے اور تمنائیں اس اندھیرے میں یاد آتے رہے۔ صبح کام پر ۷ بجے پہنچنا تھا۔ اب میں اس سوچنے سے بھی تنگ آگیا اور ۶ بجے

ہی کام پر چل دیا۔

وہاں اس وقت کوئی نہ تھا صرف ایک بوڑھا انگریز اپنی آنکھوں پر چشمہ لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا مجھے دیکھتے ہی پہلے اس نے حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ کام شروع ہونے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

جس جگہ میں کام کرتا ہوں وہاں ایک بڑی سی کھڑکی ہے جس کے شیشوں سے باہر کا منظر بڑا دلفریب نظر آتا ہے۔ چاروں طرف ہرا بھرا جنگل ہے جہاں گھنے پیڑوں کی دراز میں بڑا سحرانگیز دودھیا اجالا ہوتا ہے اور شام کے وقت جب سلوناپن اس میں اور گھل جاتا ہے تو مجھے اور دلفریب نظر آتا ہے۔ اسی وقت میں اسی اجالے میں کھو گیا اس وقت گھنے پیڑ ہوا میں جھوم رہے تھے۔ اجالے کی لکیر سائے کی طرح گھٹ بڑھ رہی تھی۔ یہ سہانا منظر مجھے اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ میری ماں کی گود ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں نے آہٹ سی سنی چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہی بوڑھا انگریز اب میرے پیچھے کھڑا ہوکر پھر مسکرا رہا تھا۔

"اس جنگل میں کیا تلاش کر رہے ہو؟" اس نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"وہ چیز جو تم نہیں دیکھ سکتے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے ___ لیکن اس جنگل کے پرے جو کچھ ہے وہ مجھے ضرور معلوم ہے"۔

"وہ کیا؟"۔

"دماغی اسپتال"۔

(لندن۔ ۱۹۷۵ء)

ذرا آواز تو دو

فراز نے سیاست میں بھی ایم۔اے کرلیا لیکن اپنے علم اور عمر کے اعتبار سے وہ صرف تعلیم کی انڈسٹری میں کھپ سکتا تھا اس وقت مجاہد کے کچھ دوست اس کے کام آئے اور اسے سندھ کے ایک شہر شکارپور میں جگہ مل گئی۔ یہاں لڑکوں کو وہ سیاسیات پڑھا کر تھوڑی سی تسکین حاصل کرتا لیکن کراچی میں رہ کر جس زندگی کا وہ عادی ہوگیا تھا' وہ سندھ کے اس چھوٹے سے شہر میں کہاں۔ اس لئے کالج کی مصروفیت کے بعد جتنے دن اور جتنا وقت وہ یہاں گزارتا انہیں وہ قیدوبند کے دن تصور کرتا اور جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو وہ کراچی آجاتا۔

کراچی میں کہاں ڈیرا ڈالے یہ اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ گوشہ عافیت اور مجاہد کا خلوص وہ اپنے مقدر میں لکھا کرلایا تھا۔ اس لئے ٹرین سے اتر کر وہ سیدھا گوشہ عافیت پہنچتا۔ کوٹھری میں اپنا سامان رکھ کر غسل خانے میں جاتا اور اپنے سر پر نل کی ٹونٹی کھول کر دیر تک پانی سے کھیلتا رہتا۔ نل کا ٹھنڈا پانی جب اس کے چہرے پر سے بہتا ہوا گزرتا تو اپنی لمبی زبان سے اسے چوستا رہتا' تھوڑی دیر بعد جب اس کا جنسی اشتعال' اس عمل کی تھپکیوں سے سوجاتا تو وہ غسل خانے سے باہر آکے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالتا۔ اس کے بعد اوپر گوشہ عافیت میں جاتا۔ اگر اس وقت وہاں مجاہد ہوتا تو تھوڑا وقت اس کے

ساتھ گزارتا اور اگر وہ گھر پر نہ ہوتا تو سیدھا بس میں بیٹھ کر کافی ہاؤس آتا۔ کافی ہاؤس کے بیرے اس سے اور اس کی کافی سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے جب وہ ٹیبل پر بیٹھ جاتا تو بیرا اس کے پاس آتا اسے سلام کرتا' اس کے مزاج پوچھتا اور اس کے بعد کریم اور کافی کی ٹرے اس کی ٹیبل پر رکھ کر چلا جاتا۔

سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ سیاسیات پر کوئی موٹی کتاب' بغل میں انگریزی اخبار' کافی کے بعد تھوڑا وقت وہ اخبار کے مطالعہ پر صرف کرتا لیکن یہاں وہ کوئی اخبار ختم کرنے نہ آتا بلکہ اخبار تو اس کا تنہائی کا رفیق تھا۔ البتہ سیاسیات پر موٹی سی کتاب اس کی موجودہ حیثیت کی ایک تختی تھی جسے وہ دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے اس اہتمام سے ٹیبل پر رکھتا کہ لوگ کتاب کا عنوان اور مصنف کو آسانی سے پڑھ سکیں۔ یہ حیثیت ایک تبدیلی اس کی زندگی میں اور لائی تھی۔ ان ساری کامیابیوں کے بعد اب اسے لوگوں کی ضرورت پڑ گئی تھی ان سے وہ داد اور تحسین چاہتا۔ اس لئے اس کی پرانی عادت کہ لوگوں سے کٹا کٹا رہے۔ اب ماضی کی یادگار بن کر رہ گئی تھی اور اس کی جگہ دوسری عادت نے لے لی تھی جس میں بلا کا ذہنی تشدد اور غیر متوازن نمائش نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔

کافی ہاؤس میں اس کے کافی جاننے والے پیدا ہو گئے تھے اس لئے جب کوئی اس کے پاس آکر بیٹھتا تو خود ہنستے ہوئے اٹھتا اور اپنی موٹی سیاسیات کی کتاب اور اخبار ٹیبل پر رکھ کر اسے سلام نہ کرتا بلکہ اس کے مزاج پوچھتا۔ مخاطب کا موڈ اگر اچھا ہوتا اور باتوں کے موڈ میں وہ بھی ہوتا تو جواب خندہ پیشانی سے دیتا اور جو اس کی روز روز کی بحثوں سے تنگ آچکے تھے۔ وہ روکھا سا جواب دے کر کسی اور طرف دیکھنے لگتے لیکن فراز پر اس تنبیہہ کا کوئی اثر نہ ہوتا' خاموشی سے تھوڑا سا وقت وہاں گزار کر وہ کسی اور شکار کی طرف چلا جاتا۔ لیکن کافی ہاؤس میں کافی لوگ ایسے بھی ہوتے جنہیں بحث مباحثہ کی لت پڑ گئی تھی اس لئے فراز جب ان سے الجھتا تو زور زور سے باتیں کرتا۔ اختلاف پر بھڑک اٹھتا اور سارا کافی ہاؤس اس کے قہقہوں اور مباحثوں سے گونجتا رہتا اور کبھی کبھی تو ان سیاسی مباحثوں میں بات تو تو میں میں تک بھی پہنچ جاتی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد جب مباحثوں کی تلخی دور ہو جاتی تو پھر دوستی ہو جاتی اور دوستی کے لئے فراز پہلے ہاتھ بڑھاتا اور اس دوستی کا افتتاح کریم والی کافی کے نئے آرڈر سے ہوتا۔ فراز اب سگریٹ کا کافی عادی ہو چکا تھا

لیکن سگریٹ بھی اپنے مرتبے کے اعتبار سے خریدتا۔ ضرورت پر صرف اپنے لئے ایک سگریٹ نکالتا اور پیکٹ پھر جیب میں رکھ لیتا۔ کافی ہاؤس کے دوستوں نے اس کی اس عادت کو بھی اپنے ذہن میں رکھ لیا تھا۔

کافی ہاؤس میں سیاسیات کے ساتھ ساتھ ادب اور آرٹ پر بھی گفتگو ہوتی۔ اس کے ساتھ کراچی کی حسین لڑکیاں' دین' مسلمان قوم وغیرہ بھی زیر بحث آتے فراز جب اس بحث میں الجھتا تو ادیبوں اور شاعروں کو بڑی صلواتیں سناتا جب کسی کراچی کے ابھرتے ہوئے شاعر کا تذکرہ چل پڑتا تو وہ بگڑ کر جواب دیتا کہ یہ ادیب وشاعر میٹرک پاس بھی نہیں ہوتے ہیں۔ جب ذرا اردو لکھنا پڑھنا آجائے تو وہ انجمن ستائش باہمی کے رسالوں میں اپنی تخلیقات چھپواتے ہیں جنہیں صرف شاعروادیب ہی پڑھتے ہیں۔ بیچاری پبلک محض سمجھنے کی خاطراس تماشہ کو دیکھتی رہتی ہے۔

ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مذہب کا بھی وہ کھلم کھلا مخالف بن گیا۔ ایک دن یارلوگ جب ذرا تفریح کے موڈ میں تھے تو اسے اسٹارٹ کرنے کے لئے کوئی قومی مسئلہ لے بیٹھے۔ اس قومی مسئلہ پر سوال سن کر پہلے تو وہ مسکرایا اس کے بعد سگریٹ کا لمبا کش لے کر کچھ اس انداز میں گفتگو شروع کی جیسے وہ اس موضوع کا استاد ہو۔

"برصغیرہند کی تاریخ یہ ہے کہ یہاں کے رہنے والوں نے آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا۔ کسی بڑے مقصد یا کسی حملہ آور کے خلاف کبھی جم کر انہوں نے لڑائی نہیں لڑی۔ یہ تو یہاں کے ہندو مسلمانوں کی تاریخ ہے اور آج جو بے حسی پاکستان پر طاری ہے وہ تاریخی ہے۔ اسے میں کیا' کوئی بھی دور نہیں کرسکتا۔ مجھ جیسے ہزاروں اس بے حسی کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے قوم کی یہ بے حسی تو دور نہیں ہوئی۔ البتہ بے حسی کے خلاف جدوجہد کرنے والے ضرور دور ہوگئے"۔

جب وہ اپنی لچھے دار تقریر ختم کرچکا تو یارلوگ تالیاں بجاکر داد دیتے رہے۔

لباس کے معاملے میں بھی وہ بڑا اہتمام رکھنے لگا تھا۔ قمیض' موزے اکثر ولایتی ہوتے' کافی ہاؤس تو صرف کریم کی کافی' یا رباشی اور سیاسی مباحثوں کے لئے تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو صدر کے کسی عمدہ ریستوران میں کھانے کے لئے چلاجاتا۔ اس وقت اتفاق سے کوئی جاننے والا آجاتا تو اس سے کھانے کو بالکل نہ پوچھتا۔ البتہ کھانا

کھاتے ہوئے بحث ضرور کرتا جاتا اس قسم کے مباحثوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس کا کوئی تجربہ کار بے تکلف کافی ہاؤس کا دوست اس کے پیکٹ کو دیکھ کر سگریٹ طلب کرتا تو فراز کے چہرے پر شکنیں سی ابھر آتیں۔ جب پہلی ختم کر کے وہ دوسری سگریٹ طلب کرتا تو فراز تھوڑا سا مشتعل ہو کر منع کرتا اور اس سے کہتا

"بھئی اپنی ضرورت سے زیادہ میرے پاس نہیں"۔

یار لوگ اس کے ساتھ کافی وقت گزار چکے تھے اب وہ اسے بولتا اور گاتا ہوا کھلونا سمجھنے لگے تھے اور اس کی لمبی تقریروں سے بڑا لطف لیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس ٹھٹھول سے اب وہ دکھ محسوس کرنے لگا۔ لیکن ان اذیت کے لمحات میں جب اسے اپنی موجودہ حیثیت یاد آتی تو وہ اسے ذرا سنبھالا دیتی جس سے دکھ قدرے کم ہوجاتا۔ لیکن اس قسم کا مذاق یا ٹھٹھول ہم پیشہ پروفیسر یا کوئی دوسرا صاحب حیثیت کرتا تو یہ اذیت اسے دیوانہ سا بنا دیتی لیکن اس سے محض تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر ذرا صبر سے کام لیتا اور ان کے فقرے بازیوں کو سہتے ہوئے اس کا صبر اور جبر اس کے چہرے پر بڑا تناؤ پیدا کر دیتا لیکن فراز ہمت سے کام لے کر اذیت پر قابو پا کر ان کے مقابل جما رہتا اس لمحے مقابلے میں دکھ کے ساتھ تھوڑی سی خوشی بھی محسوس کرتا کہ یہ میرے برابر کے لوگ ہیں اور مجھے اپنے برابر ہی کا سمجھ کر ایسا مذاق کر رہے ہیں۔

کافی ہاؤس میں کبھی اس کا دن ایسا بھی گزرتا جب کوئی اس کی لمبی تقریریں سننے والا نہ ملتا تو وہ کافی سے فارغ ہو کر الفنسٹن اسٹریٹ اور بوہری بازار کے چکر لگاتا' وہاں خوبصورت فیشن ایبل لڑکیوں کا نظارہ کرتا۔ جب قدیم اور جدید وضع کی اونچی اونچی عمارتوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی واپسیں کرنیں بکھری ہوتیں تو ان کی روشنی رنگ برنگی چمک دار کاروں پر بھی پڑتی' ان چمکتی ہوئی کاروں کو دیکھ کر پھر اسے اپنا مستقبل بھی یاد آجاتا۔ اس وقت یہ روشنی اس کے مستقبل کے خواب میں گھل مل جاتی۔ اس کی طرح وہاں دوسرے نوجوان کلرک اور طلبا بھی ہوتے جو آہستہ آہستہ اس سڑک پر چل رہے ہوتے۔ کبھی وہ فیشن ایبل دکان میں گھستے' کبھی باہر آکر شوونڈو میں رکھے ہوئے نت نئی عشرت کی چیزیں دیکھتے اور ان پر تبصرے کرتے۔ فراز اس وقت انہیں بھی دیکھتا اور کبھی کسی دکان میں چلا جاتا۔

لیکن رات کو جب گوشہ عافیت میں ہو آتا تو پریشان اور اداس ہوتا۔ پھر مجاہد سے الجھ جاتا۔ اس کا وقت اور نیند برباد کرنے کے ساتھ اس کے ساتھ کھانا بھی کھاتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب مجاہد کوئی کتاب لے کر بیٹھتا تو اس کے پاس آکر کہتا میں روز اب کب تمہیں پریشان کروں گا۔ آؤ ان کتابوں کو چھوڑو' یہ زندگی میں تمہارے ساتھ سائے کی طرح ہیں آؤ ذرا تھوڑی سی شطرنج کھیل لیں۔

"لیکن شطرنج میں نہیں جانتا"۔

"کوئی بات نہیں تم ایک ذہین آدمی ہو میں تمہیں سکھائے دیتا ہوں جب تم سیکھ جاؤ گے تو اس کھیل سے تمہیں دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ یہ بڑا دانشورانہ کھیل ہے۔ اس میں کتابوں سے زیادہ دماغ لڑانا پڑتا ہے"۔

مجاہد اس کے اصرار پر خاموش ہو جاتا اور اس کی فلسفہ طرازی کو نظرانداز کر کے محض اس کی خاطر اس کھیل میں شریک ہو جاتا۔ کیونکہ فراز کی حیثیت اب اس کے نزدیک ایک مہمان کی تھی اور وہ شکارپور میں تنہا رہتا تھا محض تنہائی سے گھبرا کر وہ کراچی آتا تھا اور پھر یہ گوشہ عافیت سرائے تو نہیں' میرے اس سے کچھ تعلقات بھی ہیں۔

شطرنج کے کھیل کو کھیلتے ہوئے مجاہد کا اپنا دکھ بھی ابھر آتا اور وہ اسے ستاتا اور شطرنج کے مہرے ایک اناڑی کی طرح سرکاتے ہوئے وہ سوچتا رہتا اور مہروں کو سرکاتے ہوئے وہ کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ ایک سوکھا ہوا پتہ ہے جسے کھیل کا زور جدھر چاہے لے جائے۔ اس احساس کا دباؤ اس کے دل پر بھی پڑا تو اس کو اس نے ڈولتے ہوئے محسوس کیا دل کے ساتھ جب اس کے حواس بھی اس کھیل سے متاثر ہوئے تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا تو فراز نے اس کی طرف دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"دیکھو میں نے کہا تھا کہ یہ کھیل تمہاری ذہانت کو تیز کر دے گا تمہارا مہرا پٹتا جا رہا تھا۔ اس کا احساس تمہیں آخری وقت ہوا"۔

"نہیں اس میں میری ذہانت کا کوئی دخل نہیں بلکہ میری بدحواسی نے ایسا کیا۔ اب اس کھیل کو بند کر دو یہ کھیل میرے لئے ناقابل برداشت ہے"۔

"ٹھہرو اس چال کو اور چل دو۔ کھیل ختم ہو چکا ہے"۔ فراز پر جیتنے کا جنون طاری تھا۔ مجاہد کو پھر اس کا خیال آیا اور بادشاہ کو رکھ دیا۔

فراز نے اسے پیٹ دیا اور کھیل ختم کر کے اطمینان سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

"تم جیتنے کے لطف سے واقف نہیں اس میں عورت سے زیادہ مزہ ہے"۔

"اس بات کو سن کر مجاہد نے فراز پر ایک نظر اور ڈالی چند لمحے اس کا جائزہ لے کر اس نے کھڑکی کے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

امتحانوں کی کامیابی' موجودہ ملازمت میں اپنی حیثیت جتانے کا احساس فراز پر جنون کی طرح سوار ہوتا جارہا تھا۔ اس جنون کی ترقی میں اسے پروفیسروں اور آفیسروں سے بحث کرنے میں کچھ ایسا لطف آنے لگا جیسے کسی شکاری کو شکار میں۔ لیکن جب ان میں سے کوئی بھی اس کے پاس نہ ہوتا تو پھر کافی ہاؤس کے دوسرے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے اپنی سیاسیات کی موٹی کتاب کھول کر بیٹھ جاتا۔

جب شام ہوتی تو اس کا دل جاگ اٹھتا۔ کیونکہ دفتروں کے نوجوان کلرک اور کالجوں کے طلبا کافی ہاؤس میں آتے ان کے ساتھ کافی پیتا پھر ان ہی کے ساتھ ریگل کے الفنسٹن اسٹریٹ کا چوراہا) چلا جاتا یہاں آکر نوجوان کلرکوں کی چال ذرا دھیمی پڑ جاتی۔ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ان اوباشوں کے چہرے تمسخر سے چمکنے لگتے۔ کبھی کوئی لڑکی قریب سے گزرتی تو اس پر ہلکے پھلکے ریمارکس کسے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ سڑک کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا جہاں سڑک پار کرنے کے لئے لوہے کے ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر وہاں سے بھی بازار کا نظارہ کیا جاتا پھر بوہری بازار کی طرف چل دیتا۔ نوجوانوں کی صحبت میں اس قسم کی چہل قدمی سے اسے تھوڑا سا سکون مل جاتا۔ جب وہ دوبارہ کافی ہاؤس میں آکر بیٹھتے تو اس مزے کی اکساتی ہوئی عورت کی طلب کا بخار اس پر مسلط ہو جاتا۔

اس طلب کی موجودگی کے باعث اس میں بھی خواہش ابھرتی کہ کوئی جوان عورت اس کے پہلو میں ہو چند لمحوں بعد اس جوان عورت کو اس کے تصور میں دیکھ کر اس کے ماضی کے خیالات بھی اس کے ذہن پر پھر ابھرنے لگتے ان خیالات کی موجودگی میں اسے احساس ہوتا کہ عورت بھوکے ننگے کے پاس نہیں ٹکتی اسے قابو میں رکھنے کے لئے تو بنگلہ بینک بیلنس ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو صرف ریگل کے چوراہے سے عورت کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ دولت کے بغیر زندگی مکمل نہیں کارل مارکس جیسے آدمی کو بھی اس کے رشتہ

دار خاطر میں نہ لاسکے کیونکہ اس کے پاس دولت نہ تھی صرف علم تھا۔ جس سے طبیعت صرف بہلائی جاسکتی ہے۔ اگر دولت نہیں تو اس جاہل سوسائٹی میں مجھے ایک جاہل عورت سے شادی کرنا پڑے گی' جس سے زندگی کا مزا کرکرا ہوکر رہ جائے گا۔ دولت اور کامیابیوں کو یاد کرکے اسے پھر عامر یاد آیا۔ ڈگریوں اور تعلقات نے اسے امریکہ بھیج دیا تھا۔ اگر میں بھی یہی راستہ اختیار کروں جرمنی یا انگلینڈ چلاجاؤں جہاں دولت بھی ہے اور علم بھی' تو ہوسکتا ہے وہاں علم میرے لئے الہ دین کا چراغ بن جائے پھر قائداعظم نے بھی تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ لیکن یورپ کیسے پہنچوں۔ اس راستے کو دکھانے کے لئے کوئی چراغ اس کے ذہن میں روشن نہ ہوسکا لیکن یورپ کی یاد اس کے دل کو ضرور تڑپاگئی اور وہ بھی اس کی توجہ کا مرکز بن گیا اس لئے جب اس کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ انگلینڈ اور جرمنی کے متعلق سوچنا شروع کردیتا' اس وقت وہ مواد اس کے بڑے کام آیا جو کتابوں' رسالوں اور فلموں میں دیکھ چکا تھا اس کا تخیل اس مواد سے اس کے جرمنی اور انگلینڈ کے تصور میں رنگ بھرتا رہتا۔

ایک دن ہفتے کی شام جب وہ کافی ہاؤس میں آیا تو یہاں رن سا پڑا ہوا تھا۔ یار لوگ چھٹی کے موڈ میں تھے اور کافی پیتے ہوئے مسکرا کر فراز کو دیکھتے جارہے تھے۔ فراز اس وقت اپنی موٹی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ جب ہال میں قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں تو کتاب بند کرکے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی کہ ان قہقہے لگانے والوں میں اس کے جاننے والے بھی ہیں یا نہیں؟

اس جائزے میں جب اس کی نظر مسکراتے ہوئے دوستوں پر پڑی تو وہ اپنی کتاب اٹھاکر ان کی ٹیبل پر آگیا اور کرسی کھسکا کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیوں۔ آج کونسی مہم تم نے سر کرلی جس نے تمہیں اتنا خوش کررکھا ہے؟" ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر فراز ان سے مخاطب ہوا۔

"ابھی تک کوئی مہم سر نہیں کی۔ کرنے کا ارادہ ہے۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"ایک خوبصورت عورت کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ بیس روپے اور کمرہ

بھی جہاں اس عورت کی میزبانی ہو سکے"۔

کالج کی ملازمت کے دوران فراز کو ایسی دو چار عورتوں کو تجربہ ہو چکا تھا لیکن اسے بڑی تکلیف ہوئی اسے جنسی سکون بالکل نہ مل سکا کیونکہ اس کی جذباتی تربیت میں جو عورت تھی وہ ابھی تک مشرقی تھی۔ اس سوال کی موجودگی میں ماضی کا یہ تجربہ اس کے ذہن میں ابھر آیا تو اس نے ذرا جھنجھلا کر جواب دیا

"ایسی عورت کسی کام کی نہیں"۔

"تو تجھے بیوی چاہیئے؟"

"ہاں لیکن مستقبل میں"۔

"لیکن مجھے بیوی نہیں عورت چاہیئے۔ اس کے ساتھ بیس روپے قرض اور کمرہ"۔

"دینے کے لئے میرے پاس کوئی چیز نہیں تجھے معلوم ہے رہتا میں شکارپور میں ہوں اور وہاں سے جو کما کر لایا تھا وہ سب یہاں خرچ کردیا اب قرض لے کر اپنے کام پر جاؤں گا"۔

"چھوڑ اس لونڈیا بازی کو جب جیب میں پیسے ہوں تب سوچیو ایک دوست جواب دے کر پھر فراز سے مخاطب ہوا کیونکہ اسے اس کے سوال سے دلچسپی ہوگئی تھی"۔

"تو شادی کیسی لونڈیا سے کرے گا؟ گریجویٹ سے یا جاہل سے؟"

"ابے جاہل عورت تو ایک بیماری ہے۔ ہماری عورت میں تعلیم کے ساتھ شرافت بھی ہونا چاہیئے"۔

"ابے تعلیم کے ساتھ یہ شرافت کی بخ کیسی۔ عورت کے معاملے میں تو بورژوا ہوگیا ہے"۔

"ہاں عورت کے معاملہ میں بورژوا رہنا چاہتا ہوں۔ عورت کو میں قلم یا استعمال کی چیز نہیں سمجھتا کہ ضرورت پر ضرورت مند کو دے دی جائے۔ عصمت عورت کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ اس آوارگی کا اثر خاندان اور بچوں پر پڑے گا۔ میں اپنے خاندان اور بچوں کی بربادی قطعی برداشت نہیں کرسکتا اور بربادی کے مقابلہ کے لئے میں دنیا سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہوں"۔

"بیٹا ہم نے سنا ہے کہ کرائے کی عورتوں کے ساتھ تو بھی؟"

نہیں کسی غریب عورت کے ساتھ نہیں بلکہ سرمایہ دار کی عورت کے ساتھ"۔
اس پر دوستوں نے ایک قہقہہ لگایا اور ان میں سے ایک نے کہا۔
"سرمایہ دار کی بیوی' بیٹی یا بہو تجھے صدر کے چوراہے پر ملے گی بیٹا اس کے ساتھ عیش کرنے کے لئے تیرے پاس دولت اور اسٹیٹس ہونا چاہئے اس کو دینے کے لئے ان دنوں تیرے پاس کیا ہے؟ وہ بکریوں کی طرح دلالوں کے ذریعہ نہیں ملتیں۔
"نہیں میں ان کی آبرو ہر قیمت پر لینا چاہتا ہوں"۔ اس مرتبہ فراز جذباتی ہونے کے ساتھ تھوڑا سا مشتعل بھی ہوگیا۔
"ہاں۔ تیری طرح۔ اپنی شاعری میں۔ اردو کے ایک ترقی پسند شاعر نے اپنی قوم کی غلامی کا انتقام لینے کے لئے اپنے زمانے کے حکمران کی عورت کے ساتھ رقص کیا تھا اس بغاوت سے بھی اس نے اپنی ہی ذات کو فائدہ پہنچایا تھا"۔
"نہیں میرا زمانہ اور ہے۔ آج بھی مجھے عورت کی عصمت کی ضرورت ہے۔ میری اولاد کے لئے ضروری نہیں' کیونکہ وہ دوسرے نظام کے تحت زندگی گزارے گی۔ میں اپنے وقت کے ساتھ چلتا ہوں۔ نہ پچیس برس آگے نہ پچیس برس پیچھے کیونکہ میں اپنے وقت کی پیداوار ہوں اور خلیل جبران کا یہ قول مجھے بڑا پسند ہے۔
"آدمی کو اپنی جائیداد اپنی اولاد کو دینا چاہئے' اپنے خیالات نہیں' کیونکہ وہ دوسرے دور کے ترجمان ہوں گے"۔
اچھا چھوڑو ان باتوں کو اپنے والدین کو کب بلا رہے ہو؟ ایک دوسرے دوست نے ذرا سنجیدگی سے سوال کیا۔
"انہیں یہاں کیوں بلاؤں' ان پیسوں میں میرا ہی پورا نہیں ہوتا"۔
"وہ تیرے ماں باپ ہیں اور تجھے اس قابل بنایا کہ تو کالج میں ملازمت کرسکے"۔
"ہوں۔ میرے یہاں خاندان کے معنی صرف میاں بیوی اور بچے کے ہوتے ہیں اور میں اپنے موجودہ خاندانی ڈھانچے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ جہاں خاندان کے معنی ماں باپ' دادادادی' نانانانی' کنواری بہنیں' بے کار بھائی ایک خاندان بناتے ہیں۔ جس سسٹم کا یہ خاندان پیداوار ہے وہاں ایک آدمی کماتا ہے اور سارے فقیروں کی طرح کھاتے ہیں' میں ایسی دوستی کا بھی قائل نہیں جو بوجھ بن جائے۔ دو مہینے ہوئے شکارپور

میں میرے ایک دوست نے میری اجازت کے بغیر میری شرٹ پہن لی۔ اس حرکت پر میں نے اس بڑا ڈانٹا تھا۔ پھر اس نے یہ حرکت نہ کی"۔

بات عورت، خاندان سے ہوتی ہوئی دین ومذہب پر آئی تو اس کے سنجیدہ دوست نے اس سے پھر سوال کیا۔

"اچھا بتاؤ اپنے خاندان کو خدا رسولؐ سے واقف کراؤ گے تاکہ اس مسلم معاشرے کے لئے وہ اجنبی بن کر نہ رہ جائیں؟"

"نہیں میں بچوں کو مذہبی تعلیم دلانے کا قائل نہیں۔ ہمارے ماحول میں جتنا مذہب ہوگا وہ خود سیکھ لیں گے۔ میں دین ومذہب کو ضابطہ حیات بنانا نہیں چاہتا۔ دین ومذہب اگر چند رسوم اور عقائد تک محدود رہیں تو گوارا ہیں لیکن جب وہ ہماری پوری زندگی پر حاوی ہونے کی کشش کریں تو وہیں سے میں اس کا مخالف ہوں"۔

(۲)

عیش وعشرت اور خوش گپیوں میں اس کی ساری چھٹیاں گزرجاتیں اور اس لطف کا شدید احساس اسے اس وقت ہوتا جب وہ کراچی سے شکارپور کی طرف روانہ ہوتا۔

اس سفر میں اسے یاد آتا دن تو اب وہی ہوں گے جو وہ کراچی میں گزار آیا۔ لیکن شکارپور پہنچ کر یہ دن مہینوں کے برابر ہوجائیں گے۔ سفر میں مستقبل کے ان دنوں کو یاد کرکے اس کا دل بھاری پڑجاتا۔

اس لئے شکارپور میں اب کالج کی ملازمت کے بعد اس کا یہی مشغلہ رہ گیا تھا اور جب اس کا دل تنہائی اور اجنبیت سے گھبراتا تو دل کو بہلانے کے لئے وہ کراچی کی ان عشرتوں کو یاد کرلیا کرتا اور اس سے جو وقت بچتا وہ مطالعے میں صرف کرتا، شکارپور میں لوگوں سے وہ بہت کم ملتا۔ آخر ان لوگوں کے پاس اب کونسی دلچسپی باقی تھی؟ جو کچھ ان کے پاس تھا اس سے تو وہ پہلے ہی واقف ہوچکا تھا۔ البتہ کتابیں اس کے لئے ضروری تھیں کیونکہ وہ اسے اجنبی دنیا اور اجنبی خیالات سے واقف کراتیں۔ ان خیالات سے وہ لطف بھی لیتا اور اگلی چھٹیوں کے لئے اس مواد کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیتا تاکہ کراچی کے دانشوروں کی صحبتوں میں ان خیالات کو فیاضی سے خرچ کرسکے۔

جس گھر میں وہ رہتا تھا وہاں اس کا پڑوسی ایک لیکچرار تھا اور وہ بھی اردو ادب کا۔ اس وجہ سے فراز کو اس سے اور اس کے موضوع سے وحشت ہوتی تھی اردو دانوں کو وہ کب خاطر میں لاتا تھا لیکن بعض مرتبہ جب اس کی تنہائی کسی چیز سے نہ بہل پاتی تو وہ اس کے کمرہ میں چلاجاتا۔ وہ محبت سے اسے اپنے پاس بٹھاتا۔ مزاج پرسی کرکے اس کے دل کو تھامنے کوشش کرتا اس کے لئے چائے تیار کرتا' چائے پر اپنی بیاض کھول کر اپنی منتخب غزلیں سناکر شکارپور کی بنجرزمین کا رونا رونا شروع کردیتا۔ فراز کو اس کی شاعری سے تو کوئی دلچسپی نہ ہوتی لیکن گوارا اسے یوں کرلیتا کہ اس کے رویئے میں ہمدردی اور توجہ تھی جس کی اس وقت اسے ضرورت ہوتی پھراس کی آواز بھی تھی جس سے اس کا جی بہل جاتا تھا۔ لیکن لطف فراز کو اس وقت آتا جب وہ شکارپور کی سادہ زندگی کی شکایت کرتا۔ شکارپور سے ایسی شکایت تو اسے بھی تھی کیونکہ وہ سوچتا آخر جینے کے مزے لینے کے لئے یہاں کیا رکھا ہے۔ وہ تو یہاں صرف روٹی کی خاطر پڑا ہوا ہے۔

شکارپور میں البتہ ایک ریستوران ایسا ضرور تھا جہاں کالج کے طلبا اور اساتذہ اپنا تھوڑا سا وقت گزارلیتے تھے۔ لیکن فراز وہاں اس وقت جاتا جب زیادہ بھیڑ نہ ہوتی ریستوران کافی ٹھنڈا رہتا اور اس ٹھنڈ کے ساتھ وہاں تھوڑی سی تاریکی بھی تھی فراز وہاں جاکر ایک کونے میں بیٹھ جاتا' چائے پیتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا جب اس نظارے سے بھی اس کا جی بھرجاتا تو اپنے کمرے میں آکر اپنی کتابوں کی دنیا میں کھوجاتا۔ پوری کتاب تو طبیعت پر جبر کرکے صرف امتحانات کے زمانے میں پڑھی تھی کیونکہ امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ان کا ختم کرنا ضروری تھا۔

لیکن اب ان کتابوں کو کہیں کہیں سے پڑھتا اور اس وقت دلائل سے زیادہ اپنے خیالات سے دلچسپی ہوتی۔ کیونکہ کتابوں کے یہ خیالات سنہرے خوابوں کی طرح اس کے لئے ایک دنیا بھی تیار کرتے اور اس کے ساتھ اس کی شخصیت میں بے میل رنگوں کی طرح پیوست ہوتے رہتے۔ روسو کے اعترافات کا اثر اس کے جذبات نے قبول کیا لیکن اپنی نفسیاتی ضرورت کے پیش نظر (جس کا اسے قطعی شعور نہ تھا) نطشے کے خیالات کی طرف رجوع کیا اور نطشے کے فوق البشر کی کئی خصوصیات کو اپنے اندر بھی محسوس کرنے لگا۔ ان خیالات سے اسے بڑا سہارا ملا اور اس احساس کی وجہ سے اپنی ذات اور ذہانت پر

غیر معمولی اعتماد پیدا ہوگیا۔ یہی خود اعتمادی مباحثوں، فقرے بازی اور مذاق میں اس کی ڈھال بن جاتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب یہ نئے اجنبی خیالات اس کی پستی کو جلابخش کر اس کے رومانی تصور میں ستاروں کی طرح چمکنے لگے تو اسے بڑا مزا آتا۔ اس مزے کے ساتھ اسے اس کا بھی احساس ہوتا کہ یہ میرا حق ہے کہ جب میں دوسروں سے بہتر اور برتر ہوں تو مجھے انہیں دبانے کا بھی حق ہے۔

اسے اپنی سوسائٹی سے بھی تو کچھ شکایتیں تھیں۔ شکارپور آکر جب اس نے کمیونسٹ مفکرین کے خیالات کا مطالعہ شروع کیا تو بڑی جلدی اس کا انتقام ان خیالات سے مسلح ہوگیا۔

مارکسزم دین ومذہب کو لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے کا آلہ کار تصور کرتا ہے۔ اس لئے طبقاتی جدوجہد میں دین ومذہب کے خلاف وہ منظم سیاسی حملہ آور ہے۔ اس لئے فراز کے پاس دین کا جو روایتی تصور تھا اس پر اس کے باپ کا کردار پیکنگ کی طرح لپٹا ہوا تھا جس سے اسے شدید نفرت تھی مارکسی نظریات نے پہلے تو اس کے اندر شک وشبہات رخنوں کی طرح پیدا کئے اس کے بعد مقادمت۔ اس وقت کوئی بھی تو اس کے اندر مدافعت کے لئے نہ اٹھا نہ اس کا ایمان اور نہ اس کا علم کیونکہ مارکسزم ہزاروں سائنٹیفک نظریات کی طرح ایک نظریہ ہی تو ہے کوئی سائنسی حقیقت تو نہیں۔ اس لئے باپ سے نفرت اور سوسائٹی سے ناراضگی کی موجودگی میں ان نظریات نے اسے بے دین بنانے میں زیادہ وقت نہ لیا۔ لیکن فراز اپنی افتاد طبع کی وجہ سے اپنے بچاؤ کے لئے ماکسزم سے صرف جارحیت ہی لے سکا اور اس کا کمینہ پن جو زہر کی طرح اس کے اندر سرایت کرتا جارہا تھا اور انسانیت کش بن گیا۔

شکارپور کی تنہائی اور مختلف النوع فلسفوں کا مطالعہ اب اس کے لئے بہت بڑا بوجھ بن گئے جس سے اس کی قوت برداشت کمزور پڑنے لگی اور وہ نفسیاتی طور پر تلون کا شکار ہوگیا۔ قوت فیصلہ بھی کمزور ہوگئی اور کسی چیز میں اب اس کا دیر تک جی نہ لگتا تھا۔ آئے دن وہ چیزوں اور لوگوں سے اکتاتا رہتا تھا۔

گرمیوں میں جب کالج بند ہوا تو چھٹیاں گزارنے اس نے کراچی نہیں بلکہ کاغان

جانے کا ارادہ کیا کیونکہ ان دنوں پاکستان کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سیرو تفریح کا رجحان زور پکڑ رہا تھا۔ اس لئے شکارپور سے ٹرین کے ذریعے وہ پنڈی آیا وہاں سے مری گیا' مری کا ماحول اسے پسند ضرور آیا لیکن امیروں اور افسروں کی سردمہری سے وہ جلد تنگ آگیا صرف تین دن وہاں گزار کر بس کے ذریعے ایبٹ آباد آیا اور وہاں ایک پٹھان ریستوران میں کھانا کھا کر ذرا کھلی ہوا میں ادھر ادھر گھوما اس کے بعد بالاکوٹ جانے والی بس میں بیٹھ گیا' بالاکوٹ سے کاغان جانے کے لئے کوئی بس نہ تھی کیونکہ اونچے اونچے پہاڑوں کی گود میں بل کھاتی ہوئی تنگ سڑک کاغان جاتی تھی اور اس تنگ پتھریلی سڑک پر صرف جیپ جا سکتی تھی۔

جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ تین مسافر اور تھے جب جیپ بالاکوٹ سے کاغان کی طرف روانہ ہوئی اور فراز نے سر اٹھا کر ان اونچے اونچے پہاڑوں پر ایک نظر ڈالی تو انہیں دیکھ کر بلندی کا احساس اس میں پیدا ہوا۔ سورج چتکبورے آسمان پر چمک رہا تھا اس کی کرنیں گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں سے چھن کر چاروں طرف پھیل رہی تھیں نیچے گہری وادی میں دریا بہہ رہا تھا۔ سبزہ اور فضا کی خنکی فراز پر بڑی فرحت آمیز کیفیت پیدا کر رہی تھی لیکن اس فرحت میں ڈوب کر جب وہ اس گہری وادی میں بہتے ہوئے دریا کو دیکھتا تو اس کی گہرائی دیکھ کر اس پر موت کا خوف طاری ہو جاتا لیکن اس لمحے وہ موت کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ آنکھیں بند کر کے ان خوشگوار مناظر کو اپنے ذہن میں دہرانے لگتا جو اسے اس سفر میں ملے تھے۔

مشرقی مسافر زیادہ دیر تک سفر میں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے اس لئے جب فراز نے پہاڑوں کی دنیا کے حسن اور اردگرد کے ماحول کی تعریف کی تو اس کے ہم سفر (جو مقامی لوگ تھے) اس کی تعریف سے خوش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سفر میں جو اہم مقام آتا اس کی طرف اشارہ کر کے اسے متوجہ کرتے اور فراز بڑے شوق سے اس طرف دیکھنے لگتا۔

تنگ پتھریلی سڑک جو بیل کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑوں سے لپٹی ہوئی تھی کسی موڑ پر آ کر کسی چٹان سے کتراتی ہوئی دوسرے پہاڑ کی طرف چلی جاتی' کبھی اسی سڑک پر گوجر اپنے مویشیوں کو لئے بالاکوٹ کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے تو ڈرائیور کو بڑا سنبھلنا پڑتا

اور بریکوں پر اس کی گرفت بڑی مضبوط ہوجاتی۔ مویشی جیپ کے ہارن سے چونک کر بھاگتے جس سے ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بجنے لگتیں لیکن فراز اس وقت اپنے ہم سفر مسافروں کی خوشی میں شامل نہ ہوتا اور سوچتا کہ اگر کہیں اس سفر میں اس تنگ سڑک پر جیپ ان مویشیوں سے ٹکرا گئی تو ہم سب اس جیپ کے ساتھ اس دریا میں ہوں گے اس اندیشے کی موجودگی میں موت کا احساس پھر اس کے اندر منڈلانے لگتا لیکن اس وقت وہ موت کو یاد کرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس وقت اسے منظروں کی ضرورت تھی آخر جب مویشی خیریت سے ان کے سامنے سے گزر گئے تو ڈرائیور نے پھر جیپ چلائی۔ تھوڑی دیر بعد مسافروں کا گاؤں آیا جسے وہ جیپ میں بیٹھ کر بھی دیکھ سکتے تھے ایک موڑ آیا جیپ رکی تو تینوں مسافر اترے اور ایک رات کے لئے فراز کو مہمان بنانا چاہا! لیکن فراز کسی پر اعتماد کرنے کا قائل ہی کب تھا۔ خصوصاً" اس حالت میں جب اس کی جیب میں روپے ہوں اور انہیں وہ جانتا تک بھی نہیں اس لئے ان کی محبت اور دعوت کا شکریہ ادا کرکے اس نے ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہا' کیونکہ اب شام ہوتی جارہی تھی۔

جب جیپ کاغان پہنچی تو رات ہوچکی تھی اور پانی زور سے برس رہا تھا' جیپ کے اڈے سے ذرا فاصلے پر ایک ہوٹل تھا ڈرائیور فراز کو وہاں لے آیا۔ یہ ہوٹل ایک طرح کی بڑی سی جھگی تھی۔ دیواریں بانس کی ٹٹیوں سے بنائی گئی تھیں اور ان پر پھونس کا چھپر تھا۔ اس تاریک رات میں ایک مسافر کو دیکھ کر ہوٹل کا مالک باہر آگیا اور اس نے فراز کو سلام کیا۔ فراز نے سلام کا جواب دیا اور اس تاریک رات میں لالٹین کی روشنی میں اس کا ذرا جائزہ لیا۔

ہوٹل کا مالک ایک ادھیڑ عمر کا تجارتی آدمی تھا مسکراہٹ اس کے چہرے پر بھی تھی لیکن ان مسافروں کی مسکراہٹ سے کتنی مختلف تھی۔

فراز کو ٹھہرنے کے لئے ایک روپیہ ادا کرنا پڑا ہوٹل کا مالک اسے مزید سہولتیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے مزید روپیوں کی طلب تھی۔ فراز نے اسے محسوس کیا لیکن خاموش رہا یہ شہریوں کو برتنے کا عادی ہے۔

اس روز فراز بڑا تھکا ہارا تھا اس لئے مزید سہولتوں کو دوسرے دن کے لئے ملتوی کرکے وہ سوگیا اور جب وہ صبح سوکر اٹھا ہوٹل کا مالک اس کے پاس آیا سلام کرکے ناشتے

کے لئے پوچھا تو فراز نے جواب دیا۔

"نہیں میں ناشتہ بازار کے کسی ریستوران میں کروں گا مجھے ذرا بازار بھی دیکھنا ہے"۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" ہوٹل کا مالک جواب دے کر ذرا بے تعلق سا ہو گیا۔ فراز ہاتھ منہ دھو کر بازار میں آیا تو دھوپ میں چمکتا ہوا کاغان اسے بڑا حسین نظر آیا دور تک اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور ان کے عقب میں نیلا آسمان۔ فضا میں جو خنکی تھی اس نے ذرا سردی محسوس کی لیکن اس خنکی میں تازگی اور ٹھنڈک کتنی تھی شکارپور میں تو اس خنکی کے تصور سے وہ بڑا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ ہوٹل سے ذرا فاصلے پر ایک قطار میں دکانیں تھیں دیواریں سب کی پہاڑی پتھروں سے بنی ہوئی تھیں بساطی ہوٹل اور اسی قبیل کی اور دوسری دکانیں' دکانوں اور ہوٹل میں بیٹھے مقامی لوگوں نے اسے دیکھا تو مسکرائے' ان کے مسکراتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر وہ بھی مسکرایا اور انہیں سلام کیا۔ انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیا ان دکانوں کے سامنے ایک اسکول بھی تھا جس کی دیواروں سے لگی ہوئی اسکول کے لڑکوں کی چند تختیاں بھی سوکھ رہی تھیں۔ اسکول کو دیکھنے کے لئے وہ سامنے والے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا۔ ریسٹورینٹ والا بیٹھا ہوا انڈے تل رہا تھا۔ فراز اس کے پاس آیا اور ناشتے کا آرڈر دے کر دوسرے لوگوں کے پاس بیٹھ گیا جو اسی کی طرح ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے اس نے کچھ بات چیت بھی کی' ناشتہ لے کر دکاندار اندر آیا تو ان لوگوں نے جو اس سے پہلے بیٹھے ہوئے تھے انڈوں کی پلیٹ فراز کے سامنے رکھ دی۔

"نہیں تم مجھ سے پہلے آئے ہو"۔

"کوئی بات نہیں صاحب! آپ مہمان ہیں۔" دوسرے انتظار کرنے والے خریداروں نے جواب دیا۔

فراز اس پر ہنس دیا تو اسے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ بھی خوش ہو کر ہنسنے لگے دوسری پلیٹیں دکاندار جلدی لے آیا اور یہ سب مل کر باتیں کرتے رہے جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ کراچی سے آیا ہے تو اسے ذرا حسرت سے دیکھ کر اپنی مشکلات اس کے سامنے رکھ کر اسے بتایا کہ یہاں تو کوئی ان کی سننے والا ہی نہیں"۔

فراز ان کی باتیں سنتا رہا اور حامی بھرتا رہا۔ یہ لوگ اسے پسند آئے غربت کے ساتھ مہربانی اور مہمان نوازی بھی تو ان کے پاس تھی۔ اس لئے کاغان کے دلفریب مناظر کے ساتھ اس نے ان کی مہربانی اور مہمان نوازی سے بھی ایسا ہی لطف اٹھایا جیسے وہ ان مناظر سے اٹھا رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا باتوں ہی باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ قصہ گل بکاؤلی میں سیف الملوک کی جس جھیل کا ذکر ہے وہ کاغان ہی میں ہے لیکن اسے دیکھنے کے لئے ذرا کچھ پہاڑوں کو طے کرنا پڑے گا۔ فراز نے اس جھیل کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو وہاں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے کہا

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔" فراز اس سے بہت خوش ہوا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فراز وہاں سے اٹھا تو نوجوان اس کے ساتھ ہولیا راستے میں کچھ مقامی لوگ اسے اور ملے اس لڑکے کے ساتھ فراز کو دیکھ کر انہوں نے اسے سلام کیا' نوجوان پتلی سڑک پر تھوڑی دور اس کے ساتھ اور چلا اس کے بعد اس نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اسے یاد رکھئے اس کے پاس یہ کوٹھی ہے میں یہاں ملازم ہوں"۔

"یہ کسی کی کوٹھی ہے؟"

"بہت بڑے صاحب کی۔ یہ پاکستان کے بڑے لیڈر ہیں"۔

"تو وہ یہاں رہتے ہیں؟"

"نہیں صاحب وہ اپنے بال بچوں اور دوستوں کے ساتھ صرف گرمیوں میں یہاں آتے ہیں"۔

"لیکن یہ تو گرمیوں کا زمانہ ہے ابھی تک نہیں آئے"۔

"جی وہ اپنا علاج کرانے امریکہ گئے ہوئے ہیں' اگلے مہینے آئیں گے"۔

لیڈر کا تذکرہ فراز کو بڑا ناگوار گزرا اس لئے وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہاں بھی ایک بنگلہ دریا کے کنارے سر اٹھاتا ہوا نظر آیا لیکن اس کوٹھی پر سورج کی کرنیں پھیلتی ہوئی دریا میں تیر رہی تھیں اور دور سے وہ ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں' کنارے پر جو پہاڑی پھول تھے وہ بھی بگلوں کی طرح سر جھکائے ان چمکتی ہوئی لہروں کا

نظارہ کر رہے تھے ہر جگہ خاموشی اور تازگی تھی۔ فراز تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا ہو کر پہاڑوں کی اس خاموشی میں کھوسا گیا۔ جب مویشیوں کو ہانکتے ہوئے گوجروں کی آواز آئی تو اس نے ان کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اب ہوا ذرا زور سے چلنے لگی تو پہاڑوں کی ڈھلانوں پر کھڑے ہوئے گھنے پیڑوں نے جھومنا شروع کیا گوجر اور مویشی اب قریب آگئے تھے ان کے گلوں میں جو گھنٹیاں تھیں وہ مویشیوں کے ادھر ادھر بھاگنے سے بجنے لگتیں۔ اس ماحول میں یہ آوازیں کتنی دل آویز تھیں انہیں محسوس کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں تو اسے یاد آیا کہ اس دل فریب ماحول میں اب صرف ایک عورت کی ضرورت اور ہے لیکن اس نے یہاں عورت کو اس طرح آزاد نہ دیکھا جیسے وہ کراچی میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ اس کا پہلا دن تھا شوق اور خوشی میں اس نے پہاڑوں کے اردگرد کے چکر لگائے۔ اس چلنے پھرنے سے بھوک بڑھ گئی تو کھانے کے لئے پھر اسی ریسٹورینٹ میں پہنچا جہاں اس نے ناشتہ کیا تھا' چائے خانوں میں تو ہر جگہ لوگ بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔ یہی صورت یہاں تھی تھی اس وقت بھی کچھ مقامی لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی یہ مقامی لوگ پاکستان کے شہروں سے آنے والے نوجوان طلبا اور طالبات تھے جو امیروں سے بہت ناخوش تھے انہیں ان کی بے باکی اور بے حیائی سے بڑی شکایت تھی وہ کہتے تھے کہ اس کا برا اثر ہمارے بچوں اور عورتوں پر بہت برا پڑے گا' فراز خاموشی سے ان کی شکایتیں سنتا رہا اور اپنا کھانا کھاتا رہا اس وقت اس کے پاس ان کی شکایتوں کے لئے کوئی احساس نہ تھا۔

کھانے کے بعد دو کپ چائے پی جب ان کی باتوں سے اس میں اکتاہٹ پیدا ہوئی تو پھر دریا کی سیر کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے کافی دور تک وہ گیا۔ کتنے ہی پہاڑی پھول اس کے پیروں سے زخمی ہوئے۔ کئی بار اس نے خود دریا میں جھانک کر اپنے چہرے کو دیکھنا چاہا اس کے بعد ایک چٹان پر بیٹھ کر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے ماحول پر ایک نظر ڈالی' دل کو اس سے جب سکون مل گیا تو وہ اٹھا اور ہوٹل کی طرف چلنے لگا لیکن راستے سے ذرا ہٹ کر ڈھلان پر ایک چٹان اسے اور ملی لیکن اس میں تھوڑی سی چمک تھی تو قریب جاتے ہوئے ایک راہ گیر سے اس نے پوچھا یہ کیا ہے۔

"یہ پہاڑوں کی برف ہے صاحب!" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

صبح وہ ذرا دیر سے اٹھا تو ہوٹل کے مالک نے ناشتہ کے لئے ملازم کو بھیجا لیکن فراز نے اس مرتبہ بھی انکار کردیا اور وہیں بیٹھ کر ان تمام چیزوں کو دیکھتا رہا جنہیں وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ دن کا اجالا تھا آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ کبھی کبھی پرندے چہچہاتے اس کے سر پر سے گزر جاتے تھے اس وقت اس نے لوگوں سے بات چیت کرنے کی ضرورت محسوس کی لیکن وہاں بات کرنے کے لئے کوئی نہ تھا صرف ہوٹل کا مالک ذرا چھپر کو ٹھیک کررہا تھا فراز نے اس وقت اسے بھی دیکھا اور اٹھ کر چل دیا۔ پھر اسی طرح ٹہلتا رہا جس طرح وہ پہلے ٹہل چکا تھا اس عمل سے اب اس میں اکتاہٹ پیدا ہونے لگی۔

لیکن وہ چلتا ضرور رہا اور یہاں کئی چٹانوں پر جاکر بیٹھا اور جب ہوٹل کی طرف چلا تو راستے میں اسے کاغان کی شام کا بھی لطف ملا اور تھوڑی دیر کے لئے اکتاہٹ نے اس کا پیچھا چھوڑدیا۔ راستے میں اسے پرانا ریستوران ملا۔ وہاں بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا لیکن اب بیٹھنے کو اس کا جی نہ چاہا کیونکہ رات کا اندھیر بڑھ رہا تھا اور وہ اپنے ہوٹل میں جانا چاہتا تھا۔

اس رات کاغان کے ہوٹل کی تنہائی شکارپور کی تنہائی بن گئی۔ آخر وہ یہاں کس سے بات کرے جو دوچار مسافر تھے وہ چادریں تان کر پہلے ہی اپنی چارپائیوں پر دراز ہوچکے تھے اس لئے اس خاموشی اور تنہائی سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ اس دن وہ تھکا ہارا کافی تھا اس لئے نیند جلدی آگئی۔

تیسرے دن صبح اٹھتے ہی اکتاہٹ دور کی طرح اس کے اندر جاگ اٹھی۔ چارپائی سے اٹھ کر اس نے اپنا منہ ہاتھ دھویا اس کے بعد ہوٹل کے مالک کے پاس آکر بالاکوٹ جانے کے لئے جیپ کا وقت معلوم کیا اس نے جیپ کے دفتر کی طرف اشارہ کرکے فراز سے پوچھا

"صاحب اتنی جلدی"۔

"ہاں ذرا مجھے کام ہے' فراز نے جھوٹ بول کر ہوٹل کے مالک سے اپنا پیچھا چھڑایا اور ہوٹل سے نکل کر جیپ کے دفتر کی طرف جانے لگا تو راستے میں اسے وہ لڑکا ملا جو اس

کے ساتھ سیف الملوک جھیل پر جانا چاہتا تھا اس سے بھی پیچھا چھڑانے کے لئے اس سے وہی جھوٹ بولا جو وہ ہوٹل کے مالک سے بول چکا تھا۔ راستے میں اسے کاغان میں اپنے تین روز اور ان کی مصروفیات یاد آئیں تو تینوں دن اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ایک سے ہی نظر آئے، اگر فرق تھا تو صرف امید کا کیونکہ جب وہ بستر چھوڑتا تو صرف نئی امید اس کے اندر سر اٹھاتی لیکن اب وہ ان امیدوں کا بھی تجربہ کر چکا تھا آخر کل کی امید آج کی امید سے کیوں کر مختلف ہوگی؟ جیپ کے دفتر میں پہنچا تو دفتر کا بابو چارپائی پر پڑا تھا اور ایک غریب نوجوان اس کے ہاتھ پیر دبا رہا تھا

"کیا جیپ کا دفتر یہی ہے۔" فراز چارپائی پر لیٹے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں" اس نے افسرانہ انداز میں جواب دیا

"میں بالاکوٹ جانا چاہتا ہوں"۔

"دو گھنٹے کے بعد جیپ جائے گی۔ اس وقت آجایئے"۔

"شکریہ"۔

"کوئی بات نہیں، کلرک فراز کے شکریئے کا جواب دے کر پٹ لیٹ گیا لڑکا اب اس کی کمر اور کندھا دبانے لگا۔

دفتر سے نکل کر فراز پھر ریستوران میں آیا اور ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران اسے یہ بھی بتایا کہ وہ آج جا رہا ہے جس کا ریسٹوران والے کو افسوس ہوا جب پیسے دے کر فراز ریستوران سے جانے لگا تو دکاندار نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا فراز نے اس کا تپاک سے جواب دیا۔ اس کے بعد ہوٹل آیا اس کے پیسے ادا کئے ہوٹل کے ملازم نے اس کا بستر باندھا اور اس کے ساتھ جیپ کے دفتر آیا تو ایک روپیہ بخشش اسے بھی دے دی۔ جس سے ملازم بہت خوش ہوا۔ ہوٹل جاتے وقت وہ بار بار فراز کو دیکھتا رہا۔

موسم اچھا تھا راستے میں بھی کوئی گڑبڑ نہ تھی اس کا راستہ آسانی سے طے ہوگیا۔ بالاکوٹ آکر اس نے ایبٹ آباد کی بس پکڑی، ایبٹ آباد سے پھر پنڈی۔ وہاں ذرا آرام کرنے کے لئے ایک سستے ہوٹل میں ٹھہرا۔ ایک دن پنڈی میں گزار کر ٹرین کے ذریعے شکارپور آگیا۔ جس تیزی سے اس نے یہ سفر کیا اسی تیزی سے اسے ختم کیا اور گھر آکر یہ سفر اسے ایک خواب کی طرح لگنے لگا اپنے کمرے کا جب اس نے دروازہ کھولا تو مجاہد کا

وہاں ایک خط ملا۔ اس نے اسی وقت کھول کر پڑھا۔ اس میں مجاہد نے شکایت کی تھی کہ حسب توقع اس مرتبہ بھی وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد چھٹیوں میں کراچی نہ آنے کی اس سے وجہ پوچھی اس کے بعد خود ہی لکھا اسے لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ خود آکر مجھے بتاؤ اور اس خط کو دیکھتے ہی کراچی چلے آؤ۔ اس خط کے ساتھ دعوت نامہ بھی ہے یہ ایک اہم تقریب ہے۔

(کراچی۔ ۱۹۵۹ء)

اندھیرے سے خاموشی تک

نوٹ : یہ افسانوی ہیئت کا ایک تجربہ ہے اس تجربے میں کردار' ماحول اور کہانی زنجیر کی لڑیوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ہر حصہ یا قسط اپنی جگہ مکمل ہے اور ایک خاموش ندی کی طرح آگے بڑھتی رہتی ہے۔

لندن ایک خوبصورت اور شاداب شہر ہے۔ لیکن جینے کا مزہ یہاں صرف گرمیوں میں آتا ہے۔ ان خوشگوار دنوں کے شروع ہوتے ہی ہرے بھرے پیڑ ہواؤں کے ساتھ ساتھ مست ہاتھیوں کی طرح جھومنے لگتے ہیں۔ ان درختوں کی نازک ٹہنیوں پر دیس بدیس سے ہزاروں میل کا سفر طے کرکے آئے ہوئے پرندے پھدک پھدک کر اپنے گیت گاتے ہیں۔ یہاں کے باسی ان بدیسی پرندوں کے نغموں سے بڑے محظوظ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر وہ خود بھی گانے لگتے ہیں لیکن جب ان کی سرزمین پر آئے ہوئے اجنبی لوگوں کی بولیاں' ان کے گیت اتفاقاً" ان کے کانوں میں پڑ جاتے تو ان کو بڑا ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن یہاں کے باسی چونکہ ضبط کے عادی ہیں اس لئے ان بدیسی لوگوں کی آوازیں اور گیت کڑوے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں۔ اپنے وطن میں انہیں صرف اپنی آواز اور اپنے گیت ہی پسند ہیں۔ وقت کے تقاضے اور اب حالات و معاملات کی مجبوری کی وجہ سے وہ ان بدیسی لوگوں کو برداشت کرلیتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے

ملک میں صرف اسی طرح رہیں جس طرح وہ خود رہتے ہیں۔ زبان وہ بولیں جو ان کی زبان ہے' لباس وہ پہنیں جس کے وہ عادی ہیں۔ بدیسی لوگوں کے تو وہ اب عادی سے ہو گئے ہیں لیکن ان کی آوازوں اور بولیوں کے وہ اب تک عادی نہیں ہو سکے ہیں اور شاید ہونا بھی نہیں چاہتے مقامی لوگوں کی اس ضرورت کا خیال سب سے زیادہ وہ بدیسی لوگ رکھتے ہیں جو کبھی ان کے محکوم رہ چکے تھے۔ خصوصا" ان محکوم رنگدار لوگوں کے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ۔

اس حسین و شاداب شہر میں لطف و انبساط حاصل کرنے کے لئے دولتمند ملکوں کے لوگ بھی سیروسیاحت کی غرض سے آتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت لندن شہر میں گزرتا ہے کیونکہ لندن کی پر شکوہ عمارتیں' انواع و اقسام کی اشیاء سے بھری ہوئی دکانیں' تیز رفتار گاڑیوں اور بسوں کی سڑکوں پر آمدورفت' کونے کونے میں قائم مختلف میوزیم' آرٹ گیلریاں' کتب خانے' وسط شہر میں آبشاروں کی طرح اچھلتے ہوئے فوارے اور اہم شاہراہوں پر ان سورماؤں کے مجسمے جنہوں نے اپنی مہم جوئی اور تدبر سے برطانوی شہنشاہیت کی سرحدیں اتنی وسیع کردیں تھیں کہ ان کی سلطنت کی حدود میں سورج غروب نہ ہوتا تھا' ان سب نے مل کر سیاحت کے شوقین لوگوں کو لندن کا دیوانہ بنا دیا ہے۔

اس دھوم دھام کے زمانے میں جب ان سورماؤں کی جنگجویانہ حکمت عملی کی بدولت برطانوی دبدبہ اور سورج کی روشنی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے' اسی قوم سے تعلق رکھنے والی ایسے انصاف پسند اور انسان دوست بھی موجود تھے جو اس استعماریت کو بالکل پسند نہ کرتے۔ ان کے نزدیک یورپین شہنشاہیت کی یہ توسیع پسندی مجبور اور کمزور اقوام کو تعلیم یافتہ اور مہذب بنانے کے لئے نہیں بلکہ انہیں لوٹنے کھسوٹنے کے لئے تھی اور اس لوٹ کھسوٹ کو حکمران طبقہ نے شاعرانہ انداز میں سجابنا کر پیش کرکے اپنے لوگوں کو مغالطے میں رکھا۔ لیکن ان انسان دوست اور انصاف کے علمبرداروں کے مجسمے شہر کی کسی شاہراہ پر نظر نہیں آتے۔ صرف ان کے خیالات کتابوں میں مقید آزادی رائے کے احترام کی خاطر لائبریریوں میں مل سکتے ہیں۔

ان دنوں یہاں انسانی حقوق ہی نہیں بلکہ جانوروں کے حقوق کے لئے بھی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اس انصاف پسند شعور کی موجودگی میں آج کسی قوم کی شہنشاہیت کو

قابل تحسین قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ رویہ لوگوں کو قابو میں رکھنے اور انہیں استعمال کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ مہذب بنانے کا مطلب تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ کمزور اور پسماندہ لوگوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے ان کی مدد کرکے انسانی فریضہ ادا کیا جائے۔

اس ملک کے موسم نے اسے جنت نشاں بناکر رکھ دیا ہے۔ جب بدیسی پرندے اور دولتمند ملکوں کے لوگ اس خوبصورت ملک کو دیکھنے آتے ہیں تو اس ملک کے باسی سورج کی روشنی سے محظوظ ہوتے اور نیلے سمندر میں غوطے لگانے کے لئے دوسرے ملکوں کی طرف نکل جاتے ہیں لیکن وہ اپنے اس حسین اور شاداب ملک کو کبھی نہیں بھولتے بلکہ اس سے جدا ہوکر اس کی ساری دلفریبیاں ان کے دلوں کو بے قرار کردیتی ہیں۔

ملک کے دوسرے حصوں کی طرح کبھی کبھی لندن میں تیز ہواؤں کی طرح گھرے بادل بھی آسمان پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ برستے ہیں لیکن گرجتے نہیں۔ ان بادلوں کی وجہ سے لندن کا اجالا ذرا دودھیا سا ہو جاتا ہے اور پورا شہر اس ملگجے اندھیرے میں ایسا لگتا ہے جیسے اسے ایک کھلونے کی طرح سبز رنگ کے محدب عدسے میں اتار دیا گیا ہے۔ اس حالت میں یہ حسین و شاداب شہر بڑا رومان پرور بن جاتا ہے۔ لندن میں دریائے ٹیمز بھی خراماں خراماں اپنے سفر پر رواں ہے۔ کبھی کبھی دور سے اس کی شوخ لہریں بہتے ہوئے دریا میں سورج کی روشنی سے چمک لے کر مچھلیوں کی طرح اچھلتی کودتی نظر آتی ہیں۔ جب شہر کا خاموش اندھیرا ذرا گہرا ہونے لگتا ہے تو پھر آتش بازی کے کھیل شروع ہو جاتے ہیں یہ کھیل بڑے دلفریب ہوتے ہیں۔ پٹاخوں کے چھوٹنے کی آواز ذرا ناگوار تو ضرور ہوتی ہے لیکن یہ پٹاخے جب آسمان کی طرف جاتے ہوئے مختلف رنگوں میں پھول بناتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں، کبھی حاشئے اور کبھی آسمان پر ایک لمبی رنگین تحریر بناکر چراغ کی طرح گل ہو جاتے ہیں تو یہ مناظر بڑے سہانے لگتے ہیں۔ لیکن شہر کا اندھیرا بہت جلد ان تمام روشنیوں کو نگل لیتا ہے اور تاریکی کا چھار سو راج ہو جاتا ہے۔

دریائے ٹیمز کے پہلو میں اس کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹا سا شہر اور آباد ہے۔ یہاں آرٹ گیلریاں، انٹرنیشنل سینما ہال جن میں دنیا بھر کی فلمیں نمائش پذیر ہوتی ہیں، ان سے متصل تھیٹر، شراب خانے (Pubs)، ریستوران لوگوں کو تفریح کا سامان فراہم کرتے

ہیں۔ ان سب کے سامنے پھیلا ہوا بڑا میدان جہاں جگہ جگہ بنچیں پڑی ہوتی تھیں۔ اس میدان کی صفائی کا کام دریائے ٹیمز کی ہوائیں کرتی ہیں۔ اس آرٹ نگر کی سیر کے لئے لوگ عموماً" ویک اینڈ میں آتے۔ اگر موسم اچھا ہوتا تو لوگوں کا ہجوم یہاں بڑھنے لگتا۔ اس وسیع کشادہ میدان میں دوسری دلچسپیاں بھی تھیں۔ پرانی کتابوں کے اسٹال' ان سے ذرا فاصلے پر کوئی الجھے بالوں والا ہپی موسیقار' اس کے بالوں کی طرح اس کے کپڑے بھی گندے اور کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے' لیکن ان دنوں یہ پھٹے پرانے کپڑے مفلسی کی نہیں بلکہ باغی فنکارانہ روش کی پہچان ہے۔ ادیب و فنکار مزاج اور فیشن کے اعتبار سے لاابالی اور سماجی آداب کے مخالف۔ یہ موسیقار گٹار پر کوئی گیت گا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ سر سے فرنچ ٹوپی اتار کر اس نے فرش پر رکھ دی تھی' اپنے فن کی داد کے ساتھ شراب' منشیات اور کھانے کے لئے اسے پیسوں ضرورت بھی تھی۔ اس ہپی موسیقار نے گٹار بجانے سے پہلے راہ گیروں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے گٹار بجانا شروع کیا پھر اس نے گانا شروع کردیا۔ ہاتھ اور زبان کے ساتھ اس کی نگاہیں لوگوں کا جائزہ بھی لیتی جارہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خاموش ہو جاتا لیکن گٹار پر اس کا ہاتھ نہ رکتا۔ اور اس کی آنکھیں بھی لوگوں کا برابر تعاقب کرتی رہتیں۔ اس دوران اگر کوئی اس کی ٹوپی میں چند سکے ڈال دیتا تو موسیقار بڑی گرم جوشی سے اس کا شکریہ ادا کرتا۔ زبان سے شکریئے کے الفاظ نکلنے کے ساتھ اس کے گٹار کی آواز بھی ذرا بلند ہو جاتی۔ پیسے اپنے پیٹ اور منشیات کے لئے اور داد اپنے فن کے لئے۔ اس لئے اس کی آنکھیں اس توقع کا بھی اظہار کرتیں کہ کچھ لوگ اس کے قریب آکر اس کے فن اور نغمے سے بھی واقفیت پیدا کریں۔ جب لوگ اس کے فن سے متاثر ہوکر اس کے قریب آجاتے تو وہ میٹھی میٹھی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر اپنے گیت کے سروں میں اپنا خون جگر اور شامل کرلیتا اس طرح دادو تحسین اس کے دل و دماغ کا سہارا بن جاتی۔ اس میدان میں جن لوگوں کو ادب و آرٹ کے بجائے دریائے ٹیمز اور قدرت کے نظاروں کی ضرورت ہوتی تو وہ اس شہر اور اس موسیقار کی طرف بیٹھ کر ٹیمز کی لہروں اور نظاروں میں کھو جاتے۔

اس دن پھر سورج سے روشن دن لندن کے آسمان پر نظر آیا۔ یہ ہفتے کا دن تھا اس

لئے لندن میں رہنے والی انگریز مائیں اپنے بچوں اور کتوں کے ساتھ اس میدان میں آئیں۔ انہوں نے میدان کے درمیان میں پہنچ کر کتوں کی گلے کی زنجیریں کھول دیں۔ بچے کتوں کو میدان میں آزاد دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ انہوں نے کتوں کو پکڑنے کی کوششیں کیں۔ یہ معصوم بچے ہنسی خوشی قہقہے لگاتے کتوں کے قریب آتے تو کتے پھر دوسری طرف بھاگ کران بچوں کا انتظار کرتے۔ ان کی مائیں اس کھیل سے خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔ جب کوئی پلا (کتے کا بچہ) کسی طاقتور کتے سے زیر ہو جاتا تو ایک دلدوز آواز اس کے منہ سے نکلتی تو اس کی مالکہ دوڑ کر اس کے پاس آتی اور پٹے ہوئے پلے کو فرش سے اٹھا کر بچے کی طرح اپنی گود میں لے کر اس سے پیار کرتی تو فرط محبت سے پلا اپنی مالکن کا منہ چومنے کی کوشش کرتا مگر مالکن اپنا منہ اس کے منہ سے بچا لیتی لیکن اسے تھپتھپانا بند نہ کرتی۔

جہاں یہ کھلونوں کا شہر آباد تھا وہاں عموماً" ادب و آرٹ کے شیدائی زیادہ نظر آتے۔ آرٹ گیلریوں، تھیٹر اور سینما سے فارغ ہو کر وہ کیفے اور شراب خانوں میں اپنا وقت گزارتے۔ فاصلے سے آپس کی سرگوشیوں کے ساتھ وہ ٹیمز کے نظارے سے بھی خود کو محظوظ کرتے جاتے۔ انہی کیفوں میں سے ایک کیفے بڑا مقبول تھا۔ اس کیفے کی کوئی چھت نہیں تھی، اوپر صرف آسمان سائبان کی طرح تنا ہوا نظر آتا۔ اس کیفے میں شراب، چائے، کافی اور خورد و نوش کی دیگر اشیاء نسبتاً سستی ملتی تھیں یہی وجہ تھی کہ اس کیفے میں لوگوں کی قطاریں لگی رہتیں۔ اگر کسی کو کسی چیز کی حاجت ہوتی تو وہ اس قطار میں کھڑا ہو جاتا۔ یہ قطار تہذیب اور تنظیم کا مظاہرہ تھی۔ برطانوی لوگ اور ان کا معاشرہ تنظیم اور قانون کا احترام کرنے کے عادی ہیں۔ اس قطار بندی کو کوئی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یہ نظم اور تنظیم برطانوی معاشرے میں مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ اس کیفے میں فرنیچر بڑا سادہ تھا۔ تکلف اور معاشرتی آداب سے زیادہ یہاں نوجوانوں کی آزادی اور من کی ترنگ کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا کیونکہ ان دنوں برطانوی معاشرے میں نئی نسل، آزادی اور سادگی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ ایسے مقامات پر تکلف اور آداب سے زیادہ آزادی اور آرام کو پسند کرتی۔ جہاں یہ نوجوان نسل بیٹھ کر دریائے ٹیمز اور لوگوں کا نظارہ کر سکیں۔ اس کیفے کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں وہسکی بیئر اور دوسری اقسام کی شرابیں اور دوسرے حصے

میں چائے، کافی، سینڈوچ سموسے اور کھانے کی دیگر اشیاء دھول سے محفوظ شیشے کے ڈبے میں رکھی رہتیں۔ ویسے ان دنوں یورپین مینو پر مشرقی چٹ پٹے کھانے یہاں کے کیفوں اور ریستورانوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن مشرقی موسیقی نہیں۔ وہ ابھی مشرقی زبانوں اور آوازوں کی طرح اس کی اجنبی موسیقی سے بھی مانوس نہیں ہو سکے ہیں۔

جو لوگ یہاں آتے قطار میں کھڑے ہونے سے پہلے ایک خانے سے ٹرے اٹھاتے اس کے بعد جیسے جیسے قطار سرکتی وہ کاؤنٹر پر اپنی مطلوبہ چیزوں کی طرف آتے لیکن انہیں ان چیزوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔ وہاں پلاسٹک کی ایک چمٹی رکھی ہوتی اس سے خریدار اپنی مطلوبہ چیز اٹھا کر چھوٹی پلیٹ میں رکھ کر چائے اور کافی کے لئے آگے بڑھتا۔ یہاں دو خوبصورت یورپین لڑکیاں اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے خریدار کا استقبال کرتیں۔ "میں آپ کیا خدمت کرسکتی ہوں، کیا چاہئے۔" خریدار اپنی ضرورت کا اظہار کرتا وہ فورا" چائے اور کافی تیار کرکے خریدار کے سامنے رکھتی وہ اسے اپنی ٹرے میں رکھتا آخری لڑکی چیزوں کی قیمت وصول کرنے والی ہوتی۔ وہ ٹرے پر نظر ڈال کر مشین کا بٹن دباتی جاتی، جب تمام چیزوں کی قیمت درج کرلیتی تو پھر بل بتاتی، خریدار ٹرے میں رکھی ہوئی چیزوں کی قیمت ادا کرکے اس ٹیبل کی طرف جاتا جہاں اس کا ساتھی بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔ اگر وہ خریدار تنہا ہوتا تو کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہو کر کیفے کا جائزہ لیتا کہ کہاں ٹیبل خالی ہے اگر اسے کوئی ٹیبل خالی نظر نہ آتی تو پھر وہ ان ٹیبلوں کی طرف نظر دوڑاتا جن کے گرد ایک دو کرسیاں خالی ہوتیں پھر وہ ان ٹیبلوں کی طرف بڑھتا لیکن بیٹھنے سے پہلے اس شخص سے اجازت لیتا جو پہلے سے اس ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہوتا۔ بعض لوگ یہاں اجنبی لوگوں کے ساتھ بات چیت تو درکنار بیٹھنا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ بالفرض اگر کسی نے اپنے قریب بیٹھنے کی اجازت دے بھی دی تو وہ اس اجنبی سے بات نہیں کرے گا۔ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرنے کے لئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

برطانیہ کیا پورے یورپ میں ہوٹل اور ریستورانوں میں کام کرنا بہت گھٹیا تصور کیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں اسے قابل عزت پیشہ نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد غریب ممالک کے لوگ یہاں تلاش معاش میں آئے تو ابتداء میں یہ اور اسی قسم کے گھٹیا کام انہیں ملتے جہاں تنخواہ بہت کم اور وقت کا کوئی تعین نہ ہوتا۔ اگر متوسط طبقے

کا کوئی مقامی نوجوان بے کاری سے تنگ آکار اس پیشے میں آتا تو صرف کیپنگ منیجر کی پوسٹ کے لئے۔ نچلے اور گھٹیا کاموں کے لئے رنگدار لوگ موجود رہتے۔ رنگدار تارکین وطن کو بینکوں' دفاتر اور دیگر بہتر اداروں میں جگہ نہ دی جاتی۔ ان کی ڈگریوں اور علمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے ان رنگدار پڑھے لکھے لوگوں سے کہہ دیا جاتا کہ آپ کی تعلیمی قابلیت اور ڈگریوں کو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن اس ملک میں کام کرنے کا آپ کے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے اس لئے سوائے ان نچلی ملازمتوں کے ہم کچھ اور پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور محکوم اقوام میں بڑھتے ہوئے سیاسی اور تہذیبی شعور کی وجہ سے یہاں کا حکمران طبقہ ذرا لبرل ہوگیا ہے اور رنگدار لوگوں کو دوسرے شعبوں میں بھی ملازمتیں ملنے لگی ہیں۔ ان کیفوں اور ریستورانوں میں ایشیا اور افریقہ کے رنگدار لوگوں کی جگہ اب غریب یورپین اقوام کے لڑکے لڑکیاں بھی عارضی طور پر یہ گھٹیا کام کرنے لگے ہیں اور جب یہاں کی سیاحت سے ان کا جی بھر جاتا ہے تو وہ کام چھوڑ کر اپنے ملک سدھار جاتے ہیں۔

اس شاداب' سرسبز اور خوبصورت ملک میں موسم کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ یہاں کے آسمان پر جب سورج چمکتا ہے تو لوگوں کے موڈ بدل جاتے ہیں۔ ایسا ہی خوشگوار دن لندن میں پھر آیا جب اس داستان نے جنم لیا۔

اسی معروف کیفے کے ایک کونے میں ایک ادھیڑ عمر کا انڈوپاکستانی کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے بے تعلق ہوکر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ جرمن زبان کے جدید ادیبوں کے منتخب افسانے تھے۔ اس کا رنگ ذرا گندمی تھا' درمیانہ قد' چہرے پر ہلکی سی خوشنما داڑھی کا حاشیہ۔ اس خوبصورت داڑھی نے اس کی شخصیت میں ایک طرح کی دلکشی اور انفرادیت پیدا کردی تھی۔ اس داڑھی نے اسے کچھ شفیق' کچھ پراسرار بناکر رکھ دیا تھا۔ ان دنوں ایسی داڑھیاں مغرب میں دانشوروں' ادیبوں اور فنکاروں کے چہرے پر زیادہ نظر آتیں۔ دور سے یہ داڑھی اس کی ذات کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ جس ٹیبل پر وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں اب صرف ایک کرسی رہ گئی تھی دوسری کرسیاں دوسرے گاہکوں نے اٹھاکر اپنی اپنی ٹیبلوں کے قریب رکھ لی تھیں۔ اس کا لباس مغربی تھا لیکن سادہ' قدامت پسند

اور جاذب نظر۔ لندن میں گہرے رنگ کے سوٹ پہننے کا رواج ہے کیونکہ بادلوں نے جو اندھیرا یہاں پیدا کردیا ہے اس میں یہی گہرے رنگ کے سوٹ زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ اس کے قریب جو پردے تھے وہ ہوا کے زور سے تھرتھرا رہے تھے۔ لیکن اس وقت اس ادھیڑ عمر شخص کو نہ اس ہوا سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ کبھی کتاب سے نظر اٹھا کر ٹیمز کی طرف دیکھتا۔ بس جرمن زبان کے افسانوں کے مطالعے میں کھو گیا تھا۔ یورپ میں ان دنوں جرمن اور فرانسیسی دانشور فکشن میں انوکھے تجربے کر رہے تھے۔

ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی اس کی ٹیبل کے قریب آئی اور انگریزی میں اسے مخاطب کیا۔

"کیا آپ یہاں کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟" اس آواز کو سنتے ہی ادھیڑ عمر مسلمان نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سوال کرنے کے بعد جواب کے انتظار میں دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مغربی آداب سے وہ واقف ہو چکا تھا اس لئے اس نے بھی مسکرا کر لڑکی کو جواب دیا۔

"جی نہیں! میں کسی کا انتظار نہیں کر رہا ہوں' اگر آپ چاہیں تو...."۔

"شکریہ!" لڑکی کی دلنواز مسکراہٹ مزید دلنواز ہو گئی۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ' بغل میں اسکیچ بک اور دوسرے ہاتھ میں ایک انڈین کپڑے کا تھیلا جس پر ایرانی قالین کے ڈیزائن چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکی کے بال سنہرے' جھیل کی طرح گہری نیلی آنکھیں' مختصر سا دہانہ جس پر ہلکی سی سرخ تجرید۔ جسم پر انڈوپاکستانی کرتا اس پر گہرے سبز رنگ کا کوٹ' زین کی پرانی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی پتلون' اس پرانی پتلون میں دوسرے رنگ کے پیوند' پیروں میں نہایت قیمتی اونچی ایڑھی کا سینڈل' چہرے پر ہلکا سا میک اپ جو خود اس کے چہرے کا ایک جاذب نظر حصہ بن گیا تھا۔ خوبصورت آنکھوں میں ہلکی سی اداسی اور طبیعت کا جذباتی پن' کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اس کے بعد اسے ایش ٹرے میں بجھا کر نظریں اٹھا کر ادھیڑ عمر آدمی کو پھر مخاطب کیا۔

"میں نے اس کیفے میں اکثر آپ کو دیکھا ہے۔ اسی کونے میں' کبھی کتابیں پڑھتے' کبھی اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتے ہوئے' عرصے سے میری خواہش تھی کہ آپ سے باتیں

کروں' آپ بڑے دلچسپ اور پر اسرار نظر آتے ہیں' کیا ان باتوں کے لئے آپ کے پاس وقت ہے؟"۔

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں' یہ تو میری عزت افزائی ہے"۔

"اچھا! اس وقت مجھے بھی ڈرنک کی ضرورت ہے' گلا خشک ہو رہا ہے کیا آپ کے لئے بھی کوئی ڈرنک لاؤں جو آپ پسند کریں"۔

"نہیں! میں شراب نہیں پیتا"۔

"کچھ اور سہی' یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کے سامنے تنہا بیٹھی ڈرنک کرتی رہوں"۔

"جی نہیں' کچھ اور نہیں چاہئے' میری کیتلی میں ابھی چائے باقی ہے"۔

"لیکن وہ تو کب کی ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔" اس کا جواب سن کر لڑکی نے پھر اس کے خالی کپ پر ایک نظر ڈالی اور دلربا اپنائیت کے انداز میں پھر اصرار کیا۔

"اس وقت مجھے اصرار ہے' اگر پسند کریں تو کافی...! مجھے آپ کا کچھ وقت لینا ہے"۔

اس اصرار پر انڈو پاکستانی خاموش ہو گیا۔

لڑکی اپنا تھیلا اور اسکیچ بک کرسی پر رکھ کر کاؤنٹر کی طرف گئی اور قطار میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی عدم موجودگی میں ادھیڑ عمر مسلمان کے دل میں شک بادل کی طرح اٹھا اور اس کے ذہن پر چھا گیا۔ مغرب میں رہتے ہوئے حالات اور معاملات کی وجہ سے وہ شکوک و شبہات کا عادی ہو چکا تھا۔ لڑکی کی غیر موجودگی میں یہ شک لندن کے بادلوں کی طرح اور بڑا ہونے لگا اور اس کی سوچ کو متاثر کرتا رہا۔ اس وقت اس شک نے کئی سوال اس کے ذہن میں اٹھائے۔ پہلا سوال اس کے ذہن میں یہ اٹھا کہ آخر یہ لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں تو ادھیڑ عمر کا ایک اجنبی آدمی ہوں اور وہ بھی رنگدار' اس معاشرے میں تو جوان اور خوبصورت لڑکیاں دوسروں خصوصاً نوجوانوں سے ضیافت کی توقع رکھتی ہیں کہ وہ انہیں ضرورت سے زیادہ توجہ دیتے ہیں اور یوں بھی خوبصورت جوان لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لئے لوگ ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں.... اس کے لئے میرے پاس کیا رکھا ہے؟ اتنے میں وہ لڑکی ٹرے میں کافی اور وہسکی کا پیک لے کر آ گئی۔ پہلے اس نے ادھیڑ عمر آدمی کے سامنے اس کی کافی رکھی اور اپنے سامنے وہسکی کا پیک اور ٹرے چھوٹے

برتنوں اور خالی کپوں کے لئے رکھی ہوئی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ پھر اس نے کرسی سے اپنی اسکیچ بک اور تھیلا اٹھایا اور خود اس کرسی پر بیٹھ کر اس نے وہسکی کی ایک چسکی لی۔ اور خاموشی سے پھر انڈو پاکستانی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ کافی پینے میں مصروف تھا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جب اس حالت میں وہ لڑکی اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی اس وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ بالکل نہ تھی' صرف آنکھوں میں اتر جانے والی نگاہیں۔ جیسے وہ اس کے اندر کچھ ٹٹول رہی ہو۔ کافی کا گھونٹ بھر کر ادھیڑ عمر انڈو پاکستانی نے کپ ساسر میں رکھ کر لڑکی کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں کو بیدار دیکھتے ہوئے لڑکی پھر مسکرائی اور اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام شارلیٹ این ہے' میں لندن میں پیدا ہوئی اور یہیں رہتی ہوں"۔

میرا نام ظفرالایمان ہے' میں آپ کے شہر میں کئی سال سے رہ رہا ہوں"۔

"آپ کی دلچسپیاں کیا ہیں کیا آپ نفسیاتی معالج' مشرقی روحانی گرو' صحافی یا سراغرساں؟" اس لمبے سوال پر ظفرالایمان مسکرایا اور جواب دیا۔

"جن دلچسپیوں کا آپ نے ذکر کیا ان میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں"۔

"لیکن یہاں جب کبھی میں نے آپ کو دیکھا' لوگوں سے بے تعلق صرف کسی کتاب اور اپنی نوٹ بک میں مصروف۔ کسی سے بات کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ یہاں دل خوش کرنے کے لئے کسی خوبصورت لڑکی سے بھی بات چیت کرنے کی آپ کوشش نہیں کرتے"۔

"مجھے اس کیفے کی فضاء بہت پسند ہے۔ یہاں بہتا ہوا دریائے ٹیمز اور کیفے میں بیٹھے لوگ۔ کبھی کبھی خوشگوار ہوائیں۔ دھوپ دیکر کر بہت زیادہ خوش نہیں ہوتا کیونکہ اسے ضرورت سے زیادہ اپنے اندر جذب کر چکا ہوں"۔

لندن میں بیٹھ کر سورج کے ساتھ ایسی سردمہری' شارلیٹ کو اس پر قدرے تعجب ہوا۔ لیکن وہ سوال کرنے سے باز نہیں آئی مسکرا کر اس نے پھر کہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟"۔

"مجھے ادب و آرٹ سے دلچسپی ہے' کبھی کبھی کچھ لکھ بھی لیتا ہوں لیکن لکھنے سے زیادہ مجھے کتابیں' لوگ اور ماحول کو پڑھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔" اس جواب پر شارلیٹ

مسکرائی نہیں بلکہ ہنسی جیسے اس کے قیاس کی تصدیق ہو گئی ہو کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں اس خوشی سے ہمکنار ہو کر پھر اس نے کہا۔

"آپ کو لکھنے سے دلچسپی ہے اور مجھے تصویر بنانے سے"۔

"آپ کا موضوع کیا ہے؟"۔

"Fug ادب سے بھی ہلکا سا لگاؤ ہے صرف پڑھنے کی حد تک!" اس جواب سے ظفرالایمان نے اپنے اندر ایک دھچکا سا محسوس کیا۔ جیسے اسے دیکھنے اور سننے کے بعد اس کے ذہن میں اس کی بالکل دوسری تصویر بنی ہو' اسے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ ایک آرٹسٹ عورت جسم کی دلفریبی اور کشش میں اتنی کھو جائے' عورت تو محبت کا پیکر ہوتی ہے۔ شارلیٹ کے جواب کے بعد ظفرالایمان کو اپنے اندرونی عمل سے بھی واسطہ پڑا لیکن اس نے ہوشیاری سے اس ردعمل کو اپنے چہرے کے تاثرات میں نہ ابھرنے دیا۔ کیونکہ ان دنوں مغرب میں جسم کی کشش' دولت کی فراوانی' طاقت اور Pleasure ہی حاصل زندگی بن کر رہ گئے تھے اور مارکیٹ کی مانگ سے مغربی سوسائٹی خود کو آزاد نہ کر سکی تھی۔

"آپ لوگوں سے کیوں نہیں ملتے؟" شارلیٹ نے وہسکی کی چسکی لے کر ظفرالایمان سے پھر سوال کیا۔

"میں لوگوں سے کیسے دور رہ سکتا ہوں' مجھے' میرے فن' میری تہذیب سب کو لوگوں کی دوستی اور بہبود درکار ہے اور اسی کے لئے میں جینا چاہتا ہوں' لوگوں سے علیحدگی کی وجہ یہ ہے کہ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ یہاں لوگ بغیر تعارف' غرض اور شناسائی کے نہیں ملتے۔ اور اگر کوئی ناواقف اجنبی ہو تو لوگ اسے شک اور ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔

"آپ اس ملک میں رہیں گے یا واپس اپنے وطن جائیں گے؟"۔

"میں اپنے لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ان کی محرومیوں' ان کی محبت اور عقیدے کی پختگی نے مجھے جینے کا مقصد عطا کیا۔ اگر یہاں کے لوگوں نے بھی شفقت اور محبت سے معاملہ کیا تو ان سے بھی ترک تعلق کیسے کر سکتا ہوں۔ مصوری کے علاوہ کچھ اور دلچسپیاں بھی آپ کے ساتھ شامل ہیں؟" ظفرالایمان نے شارلیٹ کا جواب دیتے ہوئے اس سے

پوچھا۔

"جب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی تو نفسیات میرا خاص مضمون رہا۔ اس نے ذہن کو اور پراگندہ کردیا' کچھ میکانکی سا بنا دیا۔ یونیورسٹی چھوڑ کر سوچا اپنی جستجو' تلاش اور کتابوں کے مطالعے' دلچسپ لوگوں سے مل کر' تجربے کر کے اپنی تعلیم مکمل کروں گی' لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کیا لکھتے ہیں' آپ کا موضوع کیا ہے؟" شارلیٹ نے جواب دے کر ظفرالایمان سے پھر پوچھا۔

"میں افسانے اور ناول لکھتا ہوں"۔

"کیا کچھ شائع ہوا؟"۔

"جی ہاں! کیا ریڈیو' ٹی وی اور اخباروں سے بھی کبھی واسطہ پڑتا ہے؟" اس مرتبہ ظفرالایمان نے شارلیٹ سے سوال کیا۔

"سیاحت سے مجھے اتنی دلچسپی نہیں' لیکن گھر میں ریڈیو اور ٹی وی موجود ہیں جب کرنے کے لئے ذہن میں کچھ نہ ہو تو ریڈیو اور ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتی ہوں' لوگوں کی صورتوں اور آوازوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ کبھی کبھی آدمی کی شکل نہیں بلکہ اس کی آواز میرے تخیل کو بہت دور لے جاتی ہے"۔

"جی ہاں' میرے نزدیک بھی یہ دونوں چیزیں ضروریات زندگی میں شامل ہیں لیکن میں ریڈیو اور ٹی وی کے سامنے ادب سے دوزانوں ہو کر نہیں بیٹھتا۔ صورتوں اور آوازوں سے مجھے بھی دلچسپی ہے' یہ چاہے آدمی کی ہو یا کسی دوسرے جاندار کی۔ میرا تخیل بھی ان کے سہارے ایسے جہانوں میں پہنچ جاتا ہے جن کی کبھی مجھے خبر نہ ملی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے وقت کی سیاست اور سیاست دانوں کے خیالات اور منصوبوں سے بھی دلچسپی ہے آج کل ہماری زندگی ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری زندگی سائنس اور ٹیکنالوجی سے زیادہ سیاستدانوں' ان کے منصوبوں اور تجربوں سے زیادہ متاثر ہو رہی ہے۔ لوگوں کو ان سے باخبر رہنا چاہئے۔ خصوصیت کے ساتھ تخلیقی ذہن رکھنے والے فنکاروں اور دانشوروں کو۔ میں ادب اور زندگی میں اقدار کا پابند ہوں' سیاسی منصوبوں کا نہیں"۔

"لیکن ٹی وی کے جلووں نے لوگوں کو بے حس اور پتھر بنا کر رکھ دیا ہے۔" شارلیٹ کا یہ جملہ سن کر ظفرالایمان نے جو خیال غیر اختیاری طور پر اس کے ذہن پر بار بنا ہوا تھا'

اس کا اظہار کیا۔

"ہاں، مجھے آپ کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے جو لوگ ٹی وی کے عادی ہو جاتے ہیں ان کا واسطہ جب زندگی کے دوسرے مناظر اور مسائل سے پڑتا ہے تو وہ انہیں بھی بے تعلق ہو کر دیکھتے رہتے ہیں۔ جس طرح ٹی وی پر چلتے پھرتے مناظر دیکھتے ہیں۔ لوگوں اور ان کے مسائل کے بارے میں سوائے دیکھنے کے وہ کسی قسم کے عمل کے قابل نہیں رہتے وہ عام زندگی میں لوگوں سے بچتے رہتے ہیں"۔

ظفرالایمان کے اتفاق رائے سے اس وقت جہاں شارلیٹ نے اپنی ذات اور رائے پر اعتماد محسوس کیا وہیں اس ملاقات کی مسرت میں بھی تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ ظفرالایمان ذہنی طور پر اس کے اور قریب آ گیا۔ شارلیٹ نے پھر اس پر مسکراتے ہوئے ایک نظر ڈالی۔ اب وہسکی کے چند قطرے باقی بچے تھے۔ پیگ خالی دیکھ کر شارلیٹ نے کچھ اضطراب سا محسوس کیا۔ اس اضطراب کے اثرات اس کے چہرے اور آنکھوں میں بھی نمایاں ہو گئے۔ اس نے پیگ اٹھا کر بچے ہوئے قطرے اپنے حلق میں انڈیلے اور خالی پیگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"مجھے وہسکی کی اور ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر شارلیٹ نے جھک کر ظفرالایمان کے کافی کے کپ پر نظر ڈالی، وہ بھی خالی ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے ظفرالایمان کو مخاطب کیا۔

"میں اپنے لئے ڈرنک لینے جا رہی ہوں، آپ کی کافی بھی ختم ہو چکی ہے، وہ بھی ساتھ لاؤں گی!" ظفرالایمان نے اس دعوت سے ذرا اپنائیت سی محسوس کی جیسے وہ عرصے سے اسے جانتا ہو، لیکن اسے کاؤنٹر پر جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

"اس مرتبہ ضیافت کی میری باری ہے..."۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟" شارلیٹ نے مسکراتے ہوئے ظفرالایمان کو مخاطب کیا۔

"نہیں، میڈم! اس مرتبہ میں اصرار کروں گا۔" ظفرالایمان نے پھر کہا۔

"اچھا....!" شارلیٹ اس کے اصرار پر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"لیکن شراب نہ میں پیتا ہوں اور نہ پلاتا ہوں، اس کے علاوہ جس شے کی بھی آپ

خواہش کریں' اس سے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" ظفرالایمان کی اس پیشکش سے شارلیٹ کو ایک جھٹکا لگا کیونکہ وہسکی کا نشہ اب اس کے ذہن اور جذبات کو زہر کی طرح متاثر کر رہا تھا۔ نشے کا غیراختیاری غبار اس کے ذہن پر چھا رہا تھا' اپنے سر کو جھٹک کر اس نے اس سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شعوری طور پر سوچنے کی کوشش کی' وہ سنبھلی اور نشے سے خود کو آزاد کراتے ہوئے ظفرالایمان سے پوچھا۔

"کیا آپ مسلمان ہیں؟"۔

"جی ہاں...!" ظفرالایمان نے شارلیٹ کو اس مرتبہ ایسے جواب دیا کہ اس کے لہجے میں سوائے جرات اور اعتماد کے کسی قسم کی معذرت اور جھجک بالکل نہ تھی۔

"کیا آپ اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں؟" شارلیٹ نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل' اس عمل ہی نے تو مجھے یہاں ڈوبنے اور کھو جانے سے بچایا ہوا ہے"۔

"کیا آپ رمضان کے مہینے میں پورے تیس روزے رکھتے ہیں؟"۔

"نماز اور روزے کا اہتمام اپنی روزمرہ زندگی میں اسی طرح کرتا ہوں جس طرح جسم کو قائم اور زندہ رکھنے کے لئے کھانے اور دوسری ضروریات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اس کا پراعتماد جواب سن کر شارلیٹ کو ایک ہچکی آئی۔ اس وقت شارلیٹ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ظفرالایمان سے کہا۔

"جو آپ اپنے لئے لا رہے ہیں وہی میرے لئے بھی لے آئیں"۔

"جو کافی آپ میرے لئے لائی تھیں وہ بہت عمدہ تھی' وہی کافی اب پھر لینے جا رہا ہوں۔" ظفرالایمان نے کہا۔

"ہاں! میرے لئے بھی وہی کافی لے آئیں۔" شارلیٹ جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔

ظفرالایمان اٹھ کر کاؤنٹر پر گیا۔ شارلیٹ کا تصور بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے خیالات' اس کے طور طریق سے اس مختصر مدت میں ظفرالایمان کے ذہن نے شارلیٹ کی شخصیت کی جو صورت گری کی تھی اس میں اس کی وجہ سے ترک شراب کے خیال سے ذرا خوشی بھی شامل ہوگئی۔ اس نے سوچا اس لڑکی نے اپنی دیرینہ شراب نوشی کی عادت سے تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی اس کی خاطر اجتناب کیا۔ یہ لڑکی قابل قدر ہے۔

کاؤنٹر پر اب لوگوں کی بھیڑ نہ تھی' کافیاں اسے جلدی مل گئیں۔ ٹرے میں رکھ کر وہ ٹیبل کے قریب آیا اور پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ لیکن شارلیٹ کے متعلق سوچتے رہنے کی وجہ سے وہ شکر' دودھ اور چمچے کاؤنٹر سے لانا بھول گیا۔ وہ معذرت کر کے دوبارہ کاؤنٹر پر گیا اور ان چیزوں کو لا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کافی پیتے ہوئے خاموشی دونوں پر لندن کے بادلوں کی طرح پھر چھا گئی۔ یہ خاموشی شارلیٹ پر بار گزر رہی تھی۔ اس نے خاموشی کے پردے کو چاک کرتے ہوئے ظفرالایمان کو مخاطب کیا۔

"کار' واشنگ مشین اور دوسری عشرتوں کے ساتھ اب مغرب میں ٹی وی بھی ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے' کیا یہ چیزیں آپ کے پاس ہیں"۔

"کار کے بجائے ٹیوبس (زمین دوز ٹرینیں) اور بسوں میں سفر کرتا ہوں۔ واشنگ مشین رکھنے کے لئے فلیٹ میں جگہ نہیں' البتہ ٹی وی اور ریڈیو میرے پاس ضرور ہیں۔ خبروں کے علاوہ کسی اہم پروگرام کے لئے ان سے کام لیتا ہوں۔ ادیب ہونے کے ساتھ میں انسان بھی ہوں۔ اندر اور باہر کے عمل اور رد عمل سے خود کو کیسے محفوظ رکھ سکتا ہوں لیکن ایسے اثرات جو میرے عقیدے اور مذاق کے خلاف ہوں انہیں دھول کی طرح جھاڑ دیتا ہوں البتہ یہ اثرات دوسرے لوگوں کو کیا بنا رہے ہیں وہ مشاہدہ میری دلچسپی کے لئے بڑا ضروری ہے"۔

اس جواب کو سننے کے بعد شارلیٹ ہنسی اور ظفرالایمان پر پھر ایک نظر ڈال کر کافی کی چسکی لی۔ وہ بھی کافی پینے میں مصروف تھا۔ اس کی نظریں پھر جھک گئی تھیں۔ شارلیٹ نے پھر اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس مرتبہ کچھ تلاش کرنے کی جستجو نے اس کی نگاہوں میں پھر بلا کی تیز روشنی پیدا کر دی۔ بے اختیار ظفرالایمان کی نگاہیں اٹھیں اور ان تاثرات کو گیند کی طرح لپک لیا جو شارلیٹ کی نگاہوں میں تھے۔ اس وقت شارلیٹ کی نگاہیں جستجو کے علاوہ کچھ سوالات اور احساسات سے بھی مسلح تھیں۔ کچھ اس طرح سے جیسے بادل چاند کو چھپا لیں۔ شارلیٹ نے اس وقت ذرا خجالت سی محسوس کی اور مسکرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اس وقت مسکراہٹ کے تبادلے کے علاوہ دونوں کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اس خاموشی میں ظفرالایمان نے پھر شارلیٹ کے

خیالات چہرے کے تاثرات پر ایک نگاہ ڈالی۔ لیکن مغرب میں رہتے ہوئے تجربوں کے بعد شک کی عادت جو اس کے اندر پختہ ہوچکی تھی اب برف کی طرح پگھلنے لگی غیراختیاری طور پر ظفرالایمان پر پھر غالب آگئی۔ لیکن اس نے فوراً" ہی اپنے اندرونی ردعمل کو چھپانے کے لئے اپنے تاثرات پر قابو پالیا۔ شارلیٹ کو اس وقت ظفرالایمان کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات میں سوائے رسمی مسکراہٹ کے کچھ اور نہ ملا۔ شارلیٹ نے کافی کا ایک کپ اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ لیا۔ کافی اب اس کے وہسکی کے نشے پر غالب آتی جارہی تھی۔ اور کچھ نارمل سی ہوتی جارہی تھی۔ اس حالت میں خاموشی اسے پھر اکھرنے لگی تو اس نے ظفرالایمان کو مخاطب کیا۔

"ان سوال و جواب سے آپ کہیں بور تو نہیں ہوگئے؟ پہلی ہی ملاقات میں اتنے سوالات کرڈالے"۔

"لیکن میں نے آپ سے کون سے کم سوالات کئے ہیں۔ مجھے تو آپ کے سوالات سے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میں اس کیفے میں لوگوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے ہی تو آتا ہوں۔ لیکن آج کی نسل کے ذہن میں سوالات اور جستجو کے بجائے ان دنوں ان کی جیبوں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے صرف پیسے ہوتے ہیں' اس نسل کے پاس کہنے اور سننے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ اور آپ کے پاس تو اتنے سوالات اور جستجوئیں ہیں' انہوں نے تو آپ کی شخصیت میں انفرادیت پیدا کردی ہے۔" شارلیٹ نے ظفرالایمان کے جواب سے خوشی کے ساتھ اپنے اندر اپنائیت کے جذبے کو بھی توانا ہوتے محسوس کیا۔ اس نے پھر سوال کیا۔

"کیا آپ واقعی خوش ہیں؟"۔

"ان دنوں مجھے خوشی کی نہیں سماجی انصاف کی ضرورت ہے' اپنے لئے' اپنے لوگوں کے لئے اور دنیا کے دوسرے مظلوموں کے لئے۔ ان دکھوں کے ساتھ انسانوں سے بھرے ہوئے لندن کی تنہائی اور انسانی بے تعلقی۔ کبھی کبھی اس تنہائی اور بے تعلقی کے دباؤ سے پیدا ہونے والے درد کو سنبھالنے کے لئے اپنے دل کو سمجھانے لگتا ہوں کہ لوگوں سے بھرے اس لندن میں' میں ہی تنہا نہیں ہوں' تمام مادی تحفظات کے باوجود دوسرے لوگ بھی تنہائی اور انسانی بے تعلقی کا شکار ہیں۔ اور سبب اس کا ان کا نظام زندگی ہے

جس کے تحت وہ کام کرتے اور لطف اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تنہائی اور انسانی بے تعلقی اس کے ضمنی اثرات ہیں"۔

اس مرتبہ ظفرالایمان کے جواب کا شارلیٹ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اس کے چہرے کو دیکھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود اس تنہائی اور بے تعلقی کو بھگت کر اس کی عادی ہو کر سن پڑ چکی ہو۔ اس شہر میں سردی سے بچنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان موجود ہے۔ لیکن تنہائی اور بے تعلقی کا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اسے کون اٹھائے؟ اس بوجھ کو بانٹنے کے لئے یہاں کوئی تیار نہیں۔ کچھ اسی قسم کا تاثر اس وقت شارلیٹ کے چہرے پر بھی پپڑی کی طرح ابھر کر تڑخ گیا۔ لیکن شارلیٹ سوال کرنے سے باز نہ آئی کیونکہ اس سے محفل گرم ہو رہی تھی اور تنہائی کا زور کم ہوتا جارہا تھا۔ اس کے خیال میں ان سوالات سے دوسرے انسان سے کچھ تعلق تو پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت اس اہم تجربے کے بعد اس کے لبوں پر ایک اہم انسانی ضرورت غیراختیاری طور پر آگئی۔

"کبھی آپ نے محبت کی ضرورت بھی محسوس کی ہے؟ یہ محبت تنہائی اور انسانی تعلقی کو Sponge کی طرح چوس لیتی ہے۔" شارلیٹ نے مسکراتے ہوئے ظفرالایمان سے سوال کیا۔

ظفرالایمان نے اس کا سوال سن کر ہلکا سا قہقہہ لگایا تو شارلیٹ کے چہرے پر تھوڑا سا خون، کچھ شرم اور ہلکا سا گلابی رنگ غیراختیار طور پر ابھر آیا۔ لیکن اس نے یہ سب کچھ محسوس کرکے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور ظفرالایمان کو پھر نظر بھر کر دیکھا۔ ظفرالایمان نے ادھیڑ عمر کے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا، میں ایک ادھیڑ عمر کا اجنبی آدمی ہوں۔ ان دنوں میری زندگی میں.... ایسی محبت کا گزر کیسے ہوسکتا ہے؟"۔

"نہیں! ایسی بات نہیں، آپ یورپ میں رہ رہے ہیں۔ مغرب میں یہ بڑھاپے کی عمر نہیں۔ آپ کی شخصیت میں ایک پیاسی عورت کے لئے بہت کچھ ہے۔ یہ یورپ ہے یہاں بڑھاپا ستر سال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ کی عمر اس سے بہت کم ہے۔ آپ کے چہرے پر وہی کشش اور تازگی ہے جو آپ کے خیالات میں ہے۔ ان دنوں یورپ میں لوگ جلدی بوڑھے نہیں ہوتے، یہاں کھانے پینے کی کسی چیز میں ملاوٹ نہیں،

خالص چیزیں، خالص دوائیں، قانون کی حکمرانی، لوگوں کی خبر گیری، تازہ اور صاف آب و ہوا۔ یہ سب کچھ مغرب میں اجتماعی جدوجہد سے لوگوں نے حاصل کیا ہے۔ لیکن اب ماحول میں آلودگی اور لوگوں میں بے تعلقی اور تنہائی پھیل رہی ہے۔ لوگوں کی اکثر و بیشتر مادی ضروریات یہاں پوری ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے پاس سب کچھ ہے سوائے محبت اور خوشی کے"۔

ظفرالایمان بڑی توجہ سے مسکراتے ہوئے شارلیٹ کی باتیں سنتا رہا شارلیٹ باتیں کرتے ہوئے گہری نظروں سے ظفرالایمان کو دیکھتی بھی جارہی تھی اس نے ظفرالایمان کے چہرے سے کچھ اخذ کرتے ہوئے تھوڑے سے توقف سے اچانک سوال کیا۔

"میری عمر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"۔

"یہی اٹھارہ اور بیس کے درمیان...!" ظفرالایمان نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ لیکن مسکراہٹ اس کی آنکھوں اور چہرے پر برابر کھیلتی رہی۔

"جی نہیں۔ میرے ساتھ یہ بھی ایک ستم ہے۔ میرے چھوٹے قد اور چہرے کی معصومیت نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ گزشتہ دسمبر میں' میں پچیس برس کی ہوچکی ہوں"۔

"آپ کی ذہنی عمر آپ کی جسمانی عمر سے کہیں زیادہ ہے"۔

ظفرالایمان نے اس کا جواب سن کر شارلیٹ کا قدرے تعجب سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت اور تعلیم یافتہ لوگوں کی اس ملک میں کیا کمی ہے۔ آپ کے پاس ذہانت کے ساتھ علم اور حسن بھی ہے آپ کو اپنی عمر کے نوجوان کو حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئے"۔

"یہاں کے نوجوانوں سے میں تنگ آچکی ہوں۔ ان دنوں مغرب کے نوجوانوں کو طرح طرح کی لذتوں کی تلاش ہے اور ان ساری لذتوں میں جنسی لذت کی خواہش سب سے قوی۔ اپنی مطلوبہ عورت کو اپنے بستر پر دیکھنے سے انہیں ایسا ہی سرور ملتا ہے جیسے شکاری کو اپنے شکار سے۔ وہ انسانی رشتوں کے بندھن سے ڈرتے ہیں۔ سوائے لطف کے وہ کسی قسم کی ذمہ داری کے لئے تیار نہیں۔ محبت اور انسانی رشتوں کا دلنواز تذکرہ اب صرف ادب اور آرٹ میں ہی ملتا ہے' زندگی میں نہیں"۔

ظفرالایمان نے جواب دیا۔ "ہاں' میں ان سے واقف ہوں۔ اس کی اطلاع تو مجھے اپنے غریب ملک میں پہلے مل چکی تھی۔ یہاں آکر لوگوں پر اس کے اثرات کا مشاہدہ میں اپنی آنکھ سے کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں مغرب میں ضرورت سے زیادہ معلومات' اس سے مادی چیزیں' اقتصادی طاقت' اپنی زمین اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے مہلک ہتھیار سب کچھ ہے لیکن اندر ہی اندر یہاں لوگوں کی زندگی کو گھن لگ رہا ہے۔ نت نئی نفسیاتی بیماریاں' جرائم.... کسی چیز کو قرار نہیں۔ معلوم نہیں مغرب کا انسان ان سے کب تنگ آئے گا۔ کیونکہ مختلف طریقوں سے انسان پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی فطرت کو بدلنے کے لئے ابھی تک یہاں کے حکمرانوں اور سائنس دانوں نے کوئی دوا ایجاد نہیں کی ہے۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے' دور کیوں جاؤں میری اپنی مسلم تہذیب بغداد' استنبول (عثمانی ترک)' دہلی' اب اسلام آباد' لاہور' جکارتا' انڈونیشیا' ملائشیا' ان سب کی کارفرمائیاں ہمارے سامنے ہیں۔ پہلے مسلمان بادشاہوں کو حکمرانی کے لئے زیادہ سے زیادہ زمین' قوموں سے خراج لینے کی تمنا' لذیز کھانے دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کی خواہش۔ جب انہیں جنگ سے فرصت ملتی تو شاندار باغات لگاتے' محلات بنواتے' اپنے درباروں میں حسین عورتوں کے رقص و سرور کی محفلیں سجاتے' جیسے ان کی یہ دنیا کبھی ختم نہ ہوگی لیکن ہوا کیا؟ وہ ہمارے سامنے ہے"۔

"جی ہاں! یونان اور روم کے انجام سے میں بھی واقف ہوں۔" شارلیٹ نے ظفرالایمان کی لمبی تقریر سے متاثر ہوکر اپنے دل کا غبار نکالا۔ "لیکن میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ میں ابھی زندہ ہوں اور جوان۔ مجھے' میرے فن کو انسانی محبت کی ضرورت ہے۔ نہ میں اور نہ میرا فن' بغیر انسانی محبت کے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ عورت خصوصاً ایک فنکار عورت کی سب سے بڑی ضرورت انسانی محبت ہے"۔

"آپ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہیں یا ان سے الگ؟" ظفرالایمان نے پوچھا۔

"والدین نہیں صرف والد۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں۔ میری ماں ہم سے الگ رہتی ہے۔ اب وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ اپنی جوانی کو واپس لانے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتی رہتی ہے"۔

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے' وہ کیا کرتی ہیں؟" ظفرالایمان نے پھر پوچھا۔

"وہ ایک کامیاب فلم ایکٹریس تھی لیکن بڑھاپے کی وجہ سے اب اسے نہ فلموں میں کام ملتا ہے اور نہ نوجوان چاہنے والے۔ البتہ دولت کو اس نے خوب سنبھال کر رکھا ہے۔ کسی کو اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔ صرف اسی جنون میں سرگرداں ہے کہ جوانی دوبارہ واپس آجائے۔ روز یوگا کی ورزشیں' گرو لوگوں سے منتر اور جڑی بوٹیوں کے چکر میں پڑی رہتی ہے۔ جوانی کو جاتے ہوئے تو وہ روک نہ سکی البتہ دولت کو روک لیا۔ جوانی چلی گئی لیکن جوان عمر کی عادتیں اور خواہشیں اس کے ساتھ ہیں۔ میری عمر اور حسن سے وہ چڑتی ہے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے سوائے نوک جھونک کے مجھے اس سے کچھ نہیں ملتا۔ کبھی کبھی شکست کھا کر وہ رونے لگتی ہے۔ اس پر مجھے رحم آجاتا ہے۔ آخر وہ میری ماں ہے۔ اپنے وقت میں وہ بڑی کامیاب ایکٹریس رہی ہے۔ شہرت' دولت اور لوگوں کی چاہت اسے ضرورت سے زیادہ ملی۔ لیکن اپنی مصروفیت کے سبب مجھ پر توجہ نہیں دے سکی۔ میرے باپ کو اس کا احساس تھا۔ میرے باپ کو نہ اس کی دولت اور نہ اس کی شہرت سے کبھی کوئی واسطہ رہا۔ دولت اور طاقت میں میرے باپ نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اسے صرف یہ خواہش تھی کہ لوگ اسے یاد رکھیں کہ لوگوں سے کچھ کہنے کے لئے اس کے پاس اعلیٰ خیالات ہیں میرے باپ کو اپنی انسانی صلاحیتوں اور اپنے خیالات پر جن کا اظہار وہ اپنے شعروں اور تصویروں میں کرتا رہا' بڑا اعتماد تھا۔ لیکن ہمارے مغربی معاشرے نے نہ اس کی شاعری کی قدر کی اور نہ اس کی مصوری کی ایسی داد دی جس سے اسے دولت اور شہرت ملتی۔ آج کل ہماری سوسائٹی میں وہی کامیاب انسان تصور کیا جاتا ہے جو اپنے ہنر اور فن سے دولت حاصل کر سکے۔ لیکن میرا باپ شاعری اور مصوری مارکیٹ کی مانگ کے مطابق تیار نہیں کرتا۔ اپنے دل کے غبار کے ساتھ لوگوں سے کچھ کہنے کی خواہش ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ میرا باپ دراصل مغربی معاشرے کا ایک سماجی نقاد ہے وہ اپنے شعروں اور تصویروں کو آئینہ کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دیتا ہے جو یہاں کے لوگوں اور حکمرانوں کو پسند نہیں۔ سوائے چند صاحب ذوق پڑھے لکھے نقاد حضرات اور خوابوں کی دنیا بسانے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے' جن میں میں خود بھی شامل ہوں۔ میرا باپ ایک ہمدرد اور غم گسار انسان بھی ہے جو عموماً" آج کے ادیب' شاعر' موسیقار اور فنکار کم ہی ہوتے ہیں۔ ان کا غرور اور نمائش کی تمنا انہیں

خودغرض اور سفاک بنا دیتی ہے۔ وہ انسان دوست صرف اپنی تخلیقات میں نظر آتے ہیں زندگی میں نہیں۔ عام زندگی میں لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک سفاکانہ ہوتا ہے۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ لیکن میرا باپ اپنی شاعری اور مصوری میں بھی ایک اچھا، شفیق، غم گسار اور انسان دوست ہے اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی۔ وہ اپنی دنیا خود بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ میری ماں سے اس نے کبھی کچھ نہ لیا۔ میرے باپ کے ساتھ میری ماں کو بھی اس کی ناکامی کا احساس تھا اور ہے۔ اس احساس کی وجہ سے وہ میرے باپ پر کبھی کبھی مہربان ہونے کی کوشش کرتی۔ میرا باپ اس کی ان مہربانیوں کو محسوس کرکے بے قابو ہو جاتا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا، اپنے دوستوں کے ہاں رہتا۔ صرف میری یاد اسے گھر لے آتی۔ لیکن اب میرا باپ کینسر میں مبتلا ہے۔ مگر شعر کہنے اور تصویریں بنانے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ معلوم نہیں وہ کب تک میرے ساتھ رہے"۔

ظفرالایمان خاموشی سے شارلیٹ کو سنتا رہا۔ سننے کے ساتھ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لیتا رہا جو دھوپ چھاؤں کی طرح اس کے چہرے پر آتے جاتے رہتے۔ جب شارلیٹ خاموش ہوگئی تو اس نے پھر کچھ پینے کی ضرورت محسوس کی۔ سامنے صرف کافی تھی۔ اس نے اسے اٹھاکر ایک ہی گھونٹ میں ساری کافی پی کر خالی کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ظفرالایمان پر ایک نظر ڈالی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی نگاہوں سے متاثر ہوکر ظفرالایمان خود پر جبر کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"عمر کے جس حصے میں اس وقت میں کھڑا ہوں اس وقت خوشی اور محبت میری ضرورتیں نہیں ہیں۔ میرے پاس ان کا کوئی ذاتی تجربہ بھی نہیں۔ میرا تو زندگی بھر اپنے اور دوسروں کے دکھوں سے واسطہ رہا ہے۔ اپنے دکھوں کے ذریعے میں دوسروں کے دکھوں تک پہنچا۔" اس مرتبہ ظفرالایمان نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ پھر شارلیٹ کے چہرے کا جائزہ لیا تو اسے ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں یہ دوسری طرف نہ نکل جائے۔ اس کے ذہن میں پھر ایک سوال آیا۔

"کیا تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"۔

اس وقت شارلیٹ کو کسی ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ اس لئے اس بے موقع سوال سے اسے ذرا حیرت بھی ہوئی اور یوں بھی اس سوال کے بارے میں اس کے

خیالات واضح نہیں تھے۔ اس نے ظفرالایمان کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔

''اس سوال کا ہماری گفتگو سے کیا تعلق ہے؟''۔

''میرے خیال میں اس سوال کا تمام حیات انسانی سے بنیادی تعلق ہے۔'' ظفرالایمان نے اسے جواب دیا۔ لیکن شارلیٹ اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ خاموشی میں ڈوب کر سوچتی رہی۔ ظفرالایمان بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو ظفرالایمان نے کہا۔

''یہاں کے عیش و عشرت کے اندھیروں میں عورتوں اور مردوں کو دوسرے لووں کی تلاش میں سرگرداں دیکھا۔ لیکن گھپ اندھیرے کی وجہ سے نہ وہ انہیں پہچان سکے اور نہ ان کی ضرورتوں سے واقف ہوسکے۔ تلخ تجربوں اور تشکیک کے مریض بن کر رہ گئے۔ ہر آدمی جب دوسرے سے ملتا تو شک سب سے پہلے اس کے شعور کو متاثر کرتا۔ اکثروبیشتر کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ تھا' ہمیشہ چوکنے سے رہتے اور شک کا یہ مرض بھی ظالم تنہائی سے کم نہ تھا''۔

شارلیٹ بڑے انہماک سے اسے سن رہی تھی۔ اس قسم کی توجہ نے ایک عجیب کیفیت اس میں پیدا کردی تھی جس کی غمازی اس کی آنکھیں اور چہرہ کر رہا تھا۔ ظفرالایمان نے اس پر نظر ڈالتے ہوئے پھر کہا۔

''اگر بار خاطر نہ ہو تو ایک بات اور کہوں؟''۔

''وہ کیا؟'' اس مرتبہ شارلٹ کی آواز دھیمی اور غمگین ہوگئی۔

ظفرالایمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ کی تلاش ان دنوں کچھ ایسی ہوگئی ہے جیسے قدیم زمانے میں یونان کا ایک فلسفی دن کے اجالے میں چراغ لے کر آدمی کو تلاش کر رہا تھا۔ خدا نہ صرف انسان کی بلکہ کائنات کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ میرے خیال سے اس سوال کا تعلق نہ صرف انسانی زندگی بلکہ پوری کائنات کی زندگی سے ہے۔ کیونکہ کائنات کے تمام عناصر اپنے اپنے مقرر کردہ احکامات پر عمل پیرا ہیں لیکن اس کائنات بنانے والے ''اللہ'' نے صرف انسان کو اس جبریت سے آزاد رکھا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کیا کیا گل کھلاتا

ہے"۔

"میں خود خدا پر یقین رکھتی ہوں کہ یہ کائنات خودبخود نہیں بن گئی کیونکہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں آئے دن دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی چیز خود وجود میں نہیں آجاتی۔ اس کا کوئی بنانے والا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مجھے مسلم چرچ کے تصور کو تسلیم کرنے میں عار ہے کہ خدا اوپر آسمان پر بیٹھا ہوا ہے۔ مغرب میں جس طرح ہماری تعلیم و تربیت ہوتی ہے وہ ہمیں خود کچھ کرنے یا حاصل کرنے کے لئے اکساتی ہے۔ جس چیز کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے وہ پوجاپاٹ سے نہیں بلکہ انسانی جدوجہد سے حاصل کی جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں مجھے صرف ایک مرتبہ خدا کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس وقت میں بارہ یا تیرہ برس کی تھی۔ سخت برفباری ہو رہی تھی اس وقت نہ تدبیر اور نہ میری جدوجہد اس طوفان سے بچاسکی تو مجھے بے اختیار خدا یاد آیا اور میں نے آسمان کی طرف منہ کرکے خدا کو یاد کیا۔ اے میرے خدا! میں صرف بارہ برس کی لڑکی ہوں۔ میں نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا' میرے دل میں ان گنت ارمان اور خواہشیں ہیں ان خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے تو مجھے بچالے۔ اس دعا سے میری ڈھارس بندھی۔ آگے بڑھی تو طوفان تھم چکا تھا۔ برف کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بہت دیر تک ہٹاتی رہی اور طوفان سے لڑتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ آسمان پر سورج کو چمکتے اور ذرا فاصلے پر ایک بوڑھے آدمی کو اپنے کتے کے ساتھ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو خوف میرے اندر غائب ہوچکا تھا۔ اس غیبی مدد کو میں زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ لیکن یہ مشرق کے لوگ بھی خوب ہیں وہ خود کچھ نہیں کرتے صرف دعاؤں اور پوجاپاٹ کرکے اپنی ضروریات خدا سے طلب کرتے ہیں مگر ان ضروریات زندگی کے حصول کے لئے ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔ کچھ اسی طرح آج کل مغرب میں بھی خدا کی ان لوگوں کو ضرورت ہے جو لاعلاج' سدا کے بیمار اور بوڑھے ہوچکے ہیں جن کی یہاں لوگوں کو ضرورت نہیں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔

"ان بوڑھوں کو بھی جینے کا حق ہے۔" ظفرالایمان نے شارلیٹ کی باتوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان بوڑھے لوگوں نے قوم اور ملک کی خدمت کی ہے۔ تمہارے پاس جوانی ہے' جوش اور جذبہ ہے' ان کے پاس برسوں کے تجربے کی پیدا کردہ ذہانت اور

عقل۔ زندگی کے لئے یہ دونوں عناصر لازم و ملزوم ہیں۔ خدا سب کے لئے رحیم و کریم ہے۔ کیا ان بوڑھوں کو مجبوریوں اور حادثات کے سپرد محض اس لئے کردیا جائے کہ لوگوں کو اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ خدا سے اس رویئے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ خدا سے بڑا رحیم و کریم کون ہوسکتا ہے جس نے انسان کو پیدا کرکے یہ کائنات اس کے سپرد کردی تاکہ وہ اسے مزید اپنے حسن تدبر سے نکھارے۔ ہاں مشرق میں مذہب کا عام لوگوں میں جو تصور ہے اس پر تمہارا اعتراض بجا۔ مشرق ابھی تک زوال اور پستی سے پوری طرح نہیں نکل سکا ہے۔ صدیوں سے وہ لوگ معذوری اور مفلسی کی زندگی گزار رہے ہیں یورپین سامراج نے ان کے استحصال کے لئے اس حالت پر عمداً" انہیں رکھا ہوا ہے تاکہ وہ انہیں اور ان کی زمینوں میں چھپی ہوئی معدنیات کو اپنے اقتدار و طاقت کے دوام کے لئے استعمال کرتے رہیں۔ اپنی حکمرانی کے لئے انہیں محکوم اور مجبور رکھنا مغرب کی ضرورت بن گیا ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی و محرومی نے انہیں اپنی بقاء اور تحفظ کے لئے حساس بنا دیا ہے۔ صدیوں سے وہ راجے' نوابوں اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے خراج دینے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طاقتور جس سے ان کی بقاء کو کوئی خطرہ ہوتا ہے اسے خوشامد اور پوجاپاٹ سے خوش کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور اپنی اسی جبلت کی وجہ سے یہ مشرق والے خدا کو بھی اپنے دان اور پوجاپاٹ سے رام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خدا نے زندگی گزارنے کے لئے جو ہدایات اور رہنما اصول اس کو عطاء کئے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ جیسے تمہیں معلوم ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے عقیدے کے مطابق خدا اس فرد اور قوم کی بالکل مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد خود نہ کرے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق تو دنیا کی جدوجہد سے ہی یہ زندگی جو اس وقت ہم گزار رہے ہیں' بنتی اور بگڑتی ہے۔ حیات بعدالممات جسے ہم اپنی مذہبی زبان میں آخرت کہتے ہیں اس دنیا میں کئے گئے اعمال سے بنتی اور بگڑتی ہے۔ تمام مشرق میری طرح جدوجہد کا عادی نہیں رہا۔ صرف امداد اور خوشامد ان کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ لیکن اب مشرق میں پھر بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں حرکت نظر آرہی ہے اور اسی بیداری اور حرکت پر ان کی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا انحصار ہے اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان کی اس جدوجہد اور حرکت کا رخ کس طرف ہے۔ میرے

عقیدے کے مطابق حیات انسانی کا سفر اس کے جسم کے بے حرکت ہو جانے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مرنے کے بعد اس کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اس مادی دنیا کی زندگی کو میرا مذہب ایک کھیتی سے تشبیہہ دیتا ہے"۔

"آپ کی باتوں کے یہ آخری جملے میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مغرب میں تعلیم اور تجربے سے صرف یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جینا صرف ایک مرتبہ کے لئے ہے' زندگی دوبارہ نہیں مل سکتی' جو مرگیا اس کا سب کچھ ختم ہو گیا"۔

شارلیٹ کے اس سوال پر ظفرالایمان خوب ہنسا۔

"ہاں! مجھے اس کا احساس ہے اگر دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس اہم مسئلہ پر پھر گفتگو ہوگی"۔

دونوں کے کافی کے کپ خالی ہو چکے تھے۔ ظفرالایمان نے ان خالی کپوں کی طرف نظر ڈالتے ہوئے شارلیٹ کو پھر کافی کی دعوت دی لیکن شارلیٹ نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں نہیں بلکہ یونیورسٹی کے میس روم میں۔ آج یونیورسٹی میں ایک ادبی تقریب ہے۔ اس نشست میں بڑے اہم شاعر اور ادیب آئیں گے۔ میرا باپ بھی وہاں ہوگا۔ ان سے تمہاری ملاقات کراؤں گی۔ وہ اس تقریب میں اپنی ایک مشہور طویل نظم' جسے وہ برسوں سے لکھ رہے تھے' کے کچھ حصے سنائیں گے۔ میں نے اپنے باپ سے اس تقریب میں شرکت کا وعدہ کیا ہے۔ اب میں وہاں جا رہی ہوں کیا آپ میرے ساتھ میرے والد کی خوشی کے لئے اس تقریب میں شریک ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سے مل کر اور باتیں کر کے وہ بہت خوش ہوں گے"۔

"ضرور! انہیں خوشی دینا اور انہیں سننا بھی' اس دنیا کی کھیتی کا ایک حصہ ہے کیونکہ اس کھیتی کے عمل سے ہی اس دنیا اور انسانی زندگی کا سفر دائم و قائم ہے...."۔

(جاری ہے)

(لندن۔ اپریل ۱۹۹۶ء)

مصنف کی دیگر تصانیف

- سحر کا انتظار تھا، سحر کا انتظار ہے (ناول) ۱۹۵۹ء
- صورت خورشید جیتے ہیں (ناولٹ) ۱۹۶۰ء
- لندن کے افسانے ۱۹۷۸ء
- ستاروں کا شہر (ناول) ۱۹۷۸ء
- فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا (سفرنامہ) ۱۹۷۸ء
- ٹوٹی ہوئی بوتل کے چند چمکدار ٹکڑے (ناول) ۱۹۸۶ء
- میرا یورپ کا سفر (زیر طبع)
- برصغیر پاک و ہند کے اسلامی ادیبوں کے منفرد اور منتخب افسانے (زیر طبع)